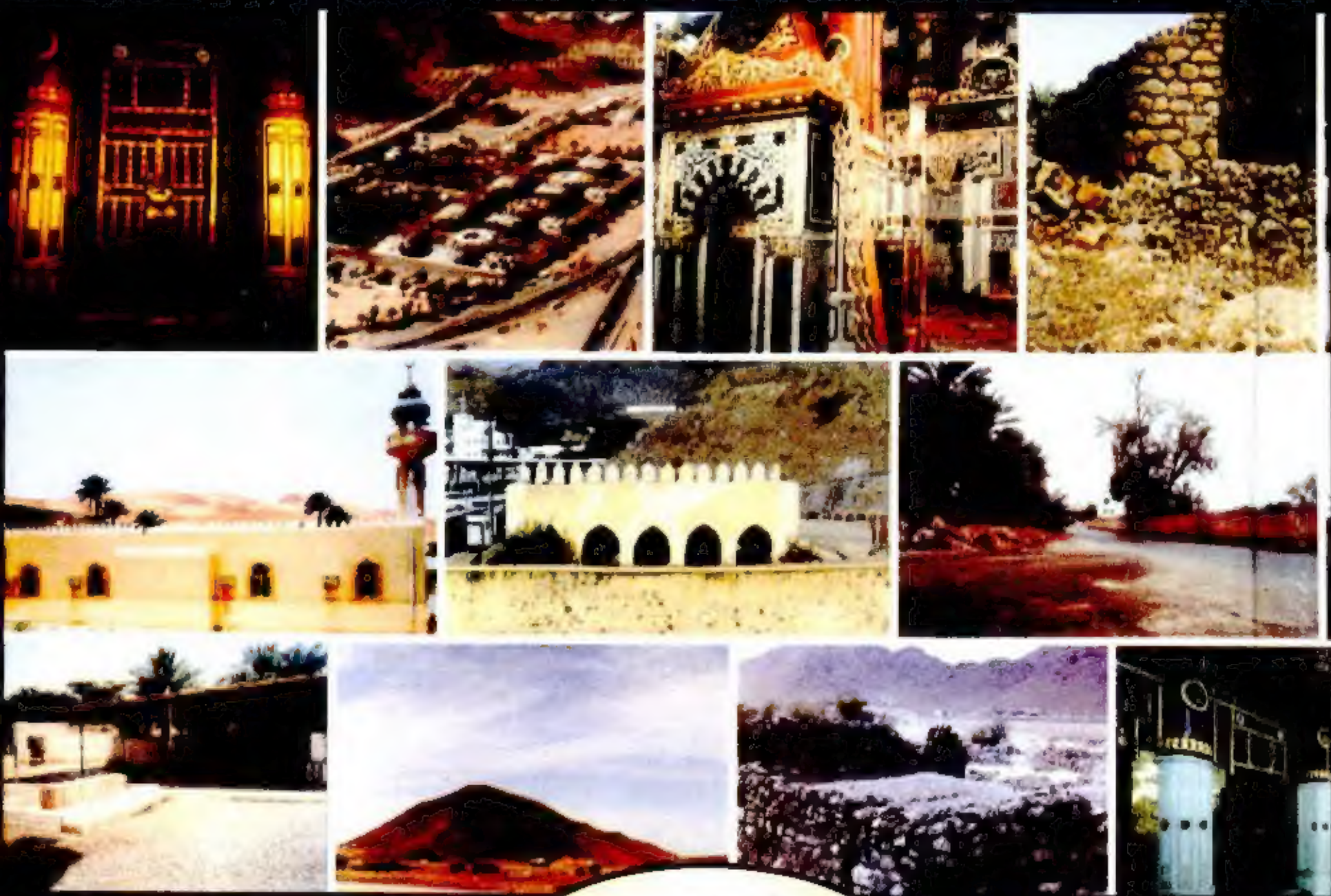


مکتبہ اہل سنت
پبلیکیشنز
ڈیپارٹمنٹ
کراچی

اُردو زبان میں سرورِ عالم ﷺ کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی ﷺ

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ



(حصہ پنجم - ششم - ہفتم)

(تصحیح شدہ، تجدید ایڈیشن)

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی

جلد چہارم

نویسندہ کی صورت پر کوننگ۔ علی کاغذ و طباعت
اور نادر و نایاب قدیم و جدید رنگین تصویروں اور نقوش
کے ساتھ پہلی بار منسلح شدہ، جدید ایڈیشن

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

جلد چہارم

ادارۃ اشاعت، بک سیلز، کمپیوٹرز، لاہور

• ویب سائٹ: www.ashar.com • لاہور۔ ۹۲-۳۲-۷۶۶۶۷۷۷
• فون: ۳۶۶۳۴۱۲ • فیکس: ۷۶۶۶۷۷۷
• لاہور۔ ۹۲-۳۲-۷۶۶۶۷۷۷
• فون: ۳۶۶۳۴۱۲ • فیکس: ۷۶۶۶۷۷۷
• لاہور۔ ۹۲-۳۲-۷۶۶۶۷۷۷
• فون: ۳۶۶۳۴۱۲ • فیکس: ۷۶۶۶۷۷۷

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ



کمپوزنگ - ڈیزائننگ - تصاویر
اور نقوش کے جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔
کوئی حصہ یا تقصیر بلا اجازت استعمال نہیں کی جاسکتی۔

سیرۃ النبی ﷺ

(صحیح شدہ جدید ایڈیشن)

اشاعت اول: ہجری الثانی ۱۴۲۳ھ ستمبر ۲۰۰۲ء

بانتھام اشرف برادران مسلمین الرمن

ادارۃ اشرف پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا نا تھیر میٹشن مال روڈ، لاہور فون ۳۳۲۲۲۳۲ فیکس ۹۵-۷۳۳۲۷۲۲-۹۲

۱۹۰- انارکلی، لاہور - پاکستان..... فون ۷۳۳۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵

موجود روڈ، چوک اردو بازار، کراچی - پاکستان..... فون ۲۷۲۲۲۰۱

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دارالعلوم، گورگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دارالعلوم، جامعہ دارالعلوم، گورگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن و العلوم الاسلامیہ، چوک سبیلہ، کراچی

دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، ناٹھ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ پنجم)

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۴۴	عبادات چار گانہ اعمال چار گانہ کا عنوان ہیں	۱۵	دیباچہ
۴۶	نماز	۱۸	عمل صالح
۵۱	توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم	۱۸	ایمان کے بعد عمل صالح کی اہمیت
۵۲	اسلام میں نماز کا مرتبہ	۲۲	اعمال صالحہ کی قسمیں
۵۳	نماز کی حقیقت	۲۳	عبادات
۵۵	نماز کی روحانی غرض و غایت	۲۳	اخلاق
۵۷	نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت	۲۳	معاملات
۵۹	ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے	۲۳	عبادات
۵۹	نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے	۲۳	اسلام اور عبادت
۶۰	نماز میں نظام وحدت کا اصول	۲۳	اسلامی عبادات کی خصوصیات
۶۰	نماز میں جسمانی حرکات	۲۷	صرف ایک خدا کی عبادت
۶۱	ارکان نماز	۲۸	خارجی رسوم کا وجود نہیں
۶۲	رکوع	۲۸	درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں
۶۲	سجدہ	۲۸	خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں
۶۶	نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے	۲۹	مکان کی قید نہیں
۶۷	نماز کی دعا	۳۰	انسانی قربانی کی ممانعت
۷۰	اس دعائے محمدی ﷺ کا موازنہ دوسرے انبیاء کی	۳۰	حیوانی قربانی کی اصلاح
	منصوص دعاؤں سے	۳۱	مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت
۷۰	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نماز کی دعا	۳۲	تجربہ ترک لذائذ، ریاضات اور تکلیفات شاقہ عبادت نہیں
۷۱	زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز کی دعا	۳۷	عزت نشینی اور قطع علاقہ عبادت نہیں
۷۱	انجیل میں نماز کی دعا	۳۸	اسلام میں عبادت کا وسیع مفہوم

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۱۰۱	خشوع	۷۲	نماز کے لئے تعیین اوقات کی ضرورت
۱۰۲	تہجل	۷۳	نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں
۱۰۲	تضرع	۷۵	نماز کے لئے مناسب فطری اوقات
۱۰۳	اخلاص	۷۵	اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ
۱۰۳	ذکر	۷۶	اسلام میں طریق و اوقات نماز
۱۰۳	فہم و تدبر	۷۷	نمازوں کی پابندی و نگرانی
۱۰۷	نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے	۷۸	نماز کے اوقات مقرر ہیں
۱۰۸	ستر پوشی	۷۸	وہ اوقات کیا ہیں؟
۱۰۸	طہارت	۸۱	اوقات کی تکمیل
۱۰۹	صفائی	۸۱	نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل
۱۱۰	پابندی وقت	۸۳	ایک نکتہ
۱۱۰	صبح خیزی	۸۳	جمع بین الصلوٰتین
۱۱۱	خدا کا خوف	۸۵	اوقات پنج گانہ اور آیت اسراء
۱۱۱	ہشیاری	۸۶	دلوک کی تحقیق
۱۱۱	مسلمان کا امتیازی نشان	۸۸	اوقات نماز کا ایک اور راز
۱۱۲	جنگ کی تصویر	۸۸	اوقات پنج گانہ کی ایک اور آیت
۱۱۳	دائمی تنبیہ اور بیداری	۸۹	اطراف النہار کی تحقیق
۱۱۳	الفت و محبت	۸۹	ایک اور طریقہ ثبوت
۱۱۴	غم خواری	۹۰	نماز پنج گانہ احادیث و سنت میں
۱۱۴	اجتماعیت	۹۰	تہجد اب نفل ہو گئی لیکن کیوں؟
۱۱۵	کاموں کا تنوع	۹۳	قبلہ
۱۱۵	تربیت	۹۹	رکعتوں کی تعداد
۱۱۶	لکھ جماعت	۱۰۱	نماز کے آداب باطنی
۱۱۶	مساوات	۱۰۱	اقامت صلوٰۃ
۱۱۶	مرکزی اطاعت	۱۰۱	قوت

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۱۴۷	باہمی اعانت کی عملی تدبیر	۱۱۷	معیار فضیلت
۱۴۸	دولت مندی کی بیماریوں کا علاج	۱۱۷	روزانہ کی مجلس عمومی
۱۵۴	اشتراکیت کا علاج	۱۱۸	عرب کی روحانی کاپالٹ
۱۵۶	اقتصادی اور تجارتی فائدے	۱۲۴	زکوٰۃ
۱۵۷	فقراء کی اصلاح	۱۲۴	زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم
۱۵۹	صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ ادا کیا جائے	۱۲۴	زکوٰۃ گزشتہ مذاہب میں
۱۶۰	صدقہ چھپا کر دیا جائے	۱۲۶	اسلام کی اس راہ میں تکمیل
۱۶۱	بلند ہمتی اور عالی خیالی	۱۲۶	اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت
۱۶۲	فقراء اور مساکین کی اخلاقی اصلاح	۱۲۸	زکوٰۃ کا آغاز اور تدبیر تکمیل
۱۶۶	روزہ	۱۳۱	زکوٰۃ کی مدت کی تعیین
۱۶۶	روزہ کا مفہوم	۱۳۲	زکوٰۃ کی مقدار
۱۶۶	روزہ کی ابتدائی تاریخ	۱۳۲	انفاق
۱۶۷	روزہ کی مذہبی تاریخ	۱۳۳	زکوٰۃ
۱۶۹	روزہ کی حقیقت	۱۳۳	نکتہ
۱۷۰	رمضان کی حقیقت	۱۳۶	جانوروں پر زکوٰۃ
۱۷۰	فریضہ میام کا مناسب موقع ۲ ہجری	۱۳۷	نصاب مال کی تعیین
۱۷۳	ایام روزہ کی تحدید	۱۳۸	زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات
۱۷۵	ایک نکتہ	۱۴۰	دو ضرورت مندوں میں ترجیح
۱۷۶	معدورین	۱۴۲	اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشت گانہ
۱۷۸	روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۴۳	مسکینوں، فقیروں اور معدوروں کی امداد
۱۷۹	روزہ میں اصلاحات	۱۴۳	غلامی کا انسداد
۱۸۲	روزہ کے مقاصد	۱۴۳	مسافر
۱۸۳	حامل قرآن کی پیروی	۱۴۴	جماعتی کاموں کے اخراجات کی صورت
۱۸۳	شکریہ	۱۴۵	زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات
۱۸۴	تقویٰ	۱۴۵	تزکیہ نفس

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۲۱۹	رزق ثمرات	۱۹۰	حج
۲۲۰	قربانی کی اقتصادی حیثیت	۱۹۰	مکہ
۲۲۰	ابراہیمی دعا کی مقبولیت	۱۹۱	بیت اللہ
۲۲۰	تجارت	۱۹۲	حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اور اس کی شرائط
۲۲۱	روحانیت	۱۹۲	ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے
۲۲۲	تاریخیت	۱۹۳	اسلام قربانی ہے
۲۲۳	خالص روحانیت	۱۹۴	یہ قربانی کہاں ہوئی؟
۲۲۳	حج مبرور	۱۹۶	مکہ اور کعبہ
۲۲۸	جہاد	۱۹۸	حج ابراہیمی یادگار ہے
۲۲۸	لفظ جہاد کی تشریح	۲۰۱	حج کی حقیقت
۲۳۰	جہاد کی قسمیں	۲۰۷	حج کے ارکان
۲۳۱	جہاد اکبر	۲۰۸	احرام
۲۳۱	جہاد بالعلم	۲۰۸	طواف
۲۳۲	جہاد بالمال	۲۰۹	حجر اسود کا استلام
۲۳۳	ہر نیک کام جہاد ہے	۲۹۰	صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا
۲۳۳	جہاد بالنفس	۲۱۰	وقوف عرفہ
۲۳۵	داغی جہاد	۲۱۰	قیام مزدلفہ
۲۳۶	عبادات قلبی	۲۱۰	منی کا قیام
۲۳۶	تقویٰ	۲۱۱	قربانی
۲۳۶	اخلاص	۲۱۱	حلق راس
۲۳۶	توکل	۲۱۲	رمی جمار
۲۳۶	صبر	۲۱۲	ان رسوم کی غایت
۲۳۶	شکر	۲۱۳	حج کے آداب
۲۳۷	تقویٰ	۲۱۳	حج کی مصلحتیں اور حکمتیں
۲۳۷	تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے	۲۱۶	مرکزیت

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۲۵۸	مشکلات کو خاطر میں نہ لانا	۲۳۸	اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں
۲۵۹	درگزر کرنا	۲۳۹	کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے
۲۶۱	ثابت قدمی	۲۳۹	اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں
۲۶۳	ضبط نفس	۲۴۰	معیت الہی سے سرفراز ہیں
۲۶۳	ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا	۲۴۰	قبولیت اہل تقویٰ کو حاصل ہے
۲۶۶	صبر کے فضائل اور انعامات	۲۴۰	تقویٰ والے کون ہیں؟
۲۶۷	فتح مشکلات کی کنجی، صبر اور دعا	۲۴۱	تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟
۲۶۹	شکر	۲۴۳	اسلام میں برتری کا معیار
۲۶۹	شکر کی تعریف	۲۴۴	اخلاص
۲۶۹	لفظ کفر کی تشریح	۲۴۴	اخلاص کا مفہوم اور تشریح
۲۷۰	شکر، اصل ایمان ہے	۲۴۸	توکل
۲۷۰	حمد	۲۴۸	توکل کے غلط معنی
۲۷۱	جسمانی نعمتوں کا شکریہ	۲۴۹	توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریح
۲۷۳	مالی نعمتوں کا شکریہ، احسان	۲۵۶	صبر
۲۷۵	احسان کا شکریہ احسان ہے	۲۵۶	صبر کے لغوی معنی
۲۷۷	خاتمہ	۲۵۷	وقت مناسب کا انتظار کرنا
		۲۵۸	بے قرار نہ ہونا



فہرست مضامین

سیرت النبیؐ (حصہ ششم)

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۳۰۶	جدید فلسفہ اخلاق کی تائید		اخلاق
۳۰۶	اخلاق کے لئے ایمان کی شرط	۲۸۴	اسلام اور اخلاقِ حسنہ
۳۰۷	غرض و غایت	۲۸۵	تزکیہ
۳۰۸	ضمیر کی آواز	۲۸۵	حکمت
۳۱۰	مسرت و انبساط	۲۸۶	حقوق عباد کی اہمیت
۳۱۲	رضائے الہی	۲۸۷	اسلام کے ارکان پنج گانہ اور اخلاق
۳۱۴	مذہب میں اخلاق کا بنیادی اصول	۲۸۸	اخلاقِ حسنہ اور ایمان
۳۱۸	خوف ورجا	۲۸۹	اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ
۳۲۰	اخلاق اور رہبانیت	۲۸۹	اخلاقِ حسنہ اور خدا کا نیک بندہ ہونے کا شرف
۳۲۲	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	۲۹۰	اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف
۳۲۳	اس کے چند شرائط	۲۹۱	اخلاقی حسنہ کا درجہ اسلام میں
۳۲۵	تجسس اور غیبت کی ممانعت	۲۹۳	ایمان کے اوصاف و لوازم
۳۲۶	توسط اور اعتدال	۲۹۵	اخلاقِ حسنہ، صفاتِ الہی کا پرتو ہیں
۳۲۷	عدل اور احسان	۲۹۶	اخلاقی معلموں میں آنحضرتؐ کا امتیاز
۳۲۸	قانون اور اخلاق	۲۹۷	بے پردہ زندگی
۳۲۹	غفور اور انتقام	۲۹۸	قول کے ساتھ عمل
۳۳۵	برائی کی جگہ نیکی	۲۹۹	کامل و مکمل
۳۳۸	اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ	۳۰۰	اخلاقی تعلیم کا تنوع
۳۳۸	تفصیل اور ہمہ گیری	۳۰۲	اسلام کا فلسفہ اخلاق
۳۳۹	اخلاقی تعلیمات کا احاطہ	۳۰۳	بے غرضی
۳۴۰	انجیل کے اخلاقی احکام	۳۰۳	نیت

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۳۷۳	تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب	۳۳۱	اسلام کے اخلاقی احکام کا استقصاء
۳۸۲	اخلاقی تعلیمات کی قسمیں	۳۳۱	قرآنی اخلاق کی فہرست
۳۸۲	حقوق اور فرائض	۳۳۲	احادیث کے اخلاقیات کی فہرست
۳۸۲	فضائل اخلاق اور رذائل	۳۳۳	اخلاقی جزیات کا استقصاء
۳۸۲	اخلاق	۳۳۶	مسکرات کی حرمت میں جزیات کا احاطہ
۳۸۲	آداب	۳۳۹	سود کی حرمت میں جزیات کا احاطہ
۳۸۲	حقوق و فرائض	۳۳۹	رشوت کی حرمت میں استقصاء
۳۸۲	حقوق کے معنی	۳۳۹	سیکی اخلاق کی کمزوری
۳۸۳	حقوق کی وسعت	۳۳۹	بغض کا اعتراض سیکی اخلاق پر
۳۸۵	حقوق کی ترتیب	۳۵۰	اسلامی اخلاق کا اعتدال
۳۸۶	والدین کا حق	۳۵۰	نفوس کا اختلاف استعداد
۳۹۳	اولاد کا حق	۳۵۰	ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح
۳۹۳	اصولی تعلیم	۳۵۱	قوت غضب اور قوت شہوت میں فرق
۳۹۳	اولاد کشی کا انسداد	۳۵۱	سیکی اخلاق کی کمزوریاں
۴۰۰	رضاعت و حضانت	۳۵۲	لیکی کا اعتراض سیکی اخلاق پر
۴۰۱	تعلیم و تربیت	۳۵۲	اسلام اور بلند اخلاق
۴۰۳	حقوق زوجین	۳۵۳	تقدیر، توکل، صبر، شکر
۴۱۱	مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے؟	۳۵۵	اپنے دشمنوں سے پیار کرو
۴۱۵	اہل قرابت کے حقوق	۳۵۷	کفار اور مشرکین سے عدم موالات
۴۱۹	ہمسایہ کے حقوق	۳۶۲	خنی کا جائز موقع
۴۲۳	قیہوں کے حقوق	۳۶۲	خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی
۴۲۹	بیوہ کے ساتھ حسن سلوک	۳۶۷	اسلام میں کسی سے دائمی یا موروئی نفرت
۴۳۲	حاجت مندوں کے حقوق		کی تعلیم نہیں
۴۳۵	بیماروں کے حقوق	۳۶۹	ترک ہوئی
۴۳۸	غلاموں کے حقوق	۳۷۰	اخلاق اور محبت الہی

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۵۵۰	خودداری یا عزت نفس	۴۴۰	مہمان کے حقوق
۵۵۷	شجاعت اور بہادری	۴۴۳	مسلمانوں کے باہمی حقوق
۵۶۰	تعداد کی قلت و کثرت	۴۵۰	نسائی برادری کے حقوق
۵۶۱	موت کا وقت مقرر ہے	۴۵۳	جانوروں سے حقوق
۵۶۳	شہادت اور غزا کا رتبہ	۴۵۷	فضائل اخلاق
۵۶۷	استقامت	۴۵۸	فضائل کی مختصر فہرست
۵۷۲	حق گوئی	۴۶۲	صدق
۵۷۳	استغناء	۴۶۵	زبان کی سچائی
۵۷۷	روزاٹل	۴۶۶	دل کی سچائی
۵۷۷	روزاٹل کے معنی	۴۶۷	عمل کی سچائی
۵۷۷	روزاٹل کے قرآنی نام	۴۷۱	سخاوت
۵۷۸	فحشاء، منکر اور فہی	۴۸۲	حفت و پاسبازی
۵۷۹	فحشاء کے معنی	۴۹۳	ویانت داری اور امانت
۵۷۹	منکر کے معنی	۴۹۹	شرم و حیا
۵۸۰	فہی کے معنی	۵۰۳	زہم
۵۸۰	اخلاق ذمہ داریوں ہوتے ہیں	۵۰۸	عدل و انصاف
۵۸۱	روزاٹل کی ترتیب	۵۱۵	عہد کی پابندی
۵۸۲	جھوٹ	۵۲۰	احسان
۵۸۹	جھوٹی قسمیں کھانا	۵۲۶	غفور و رحیم
۵۹۳	وعدہ خلافی	۵۳۲	صبر اور بردباری
۵۹۵	خیانت اور بددیانتی	۵۳۶	رفیق و لطف
۵۹۸	غداری اور دغا بازی	۵۴۱	تواضع و خاکساری
۶۰۰	بہتان	۵۴۳	خوش کلامی
۶۰۳	چغل خوری	۵۴۶	ایثار
۶۰۷	غیبت اور بدگوئی	۵۴۸	اعتدال اور میانداری

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۶۶۹	حسد	۶۱۲	دورِ خاپن
۶۷۴	فحش گوئی	۶۱۳	بدگمانی
۶۷۹	رذائل پر مختصر تبصرہ	۶۱۴	مداحی اور خوشامد
۶۸۰	آداب	۶۱۶	بخل
۶۸۰	فطری آداب	۶۲۳	حرص و طمع
۶۸۲	طہارت اور اس کے آداب	۶۲۶	سبے ایمانی
۶۸۷	کھانے پینے کے آداب	۶۲۸	چوری
۶۹۱	آدابِ مجلس	۶۳۱	ناپ تول میں کمی بیشی
۶۹۴	آدابِ ملاقات	۶۳۳	چھپا کر لین
۷۰۰	آدابِ گفتگو	۶۳۵	رشوت
۷۰۰	باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب	۶۳۸	سود خوری
۷۰۶	آدابِ سفر	۶۴۱	شراب خوری
۷۰۸	آدابِ خواب	۶۴۵	غیظ و غضب
۷۱۰	آدابِ لباس	۶۴۷	بغض و کینہ
۷۱۴	آدابِ مسرت	۶۴۹	ظلم
۷۱۸	آدابِ ماتم	۶۵۳	فخر و غرور
۷۲۱	متفرق آداب	۶۶۱	ریا
۷۲۲	آدابِ کافلفہ	۶۶۵	خود بینی و خود نمائی
۷۲۴	حکمتِ ربانی کا چشمہ نور	۶۶۷	فضول خرچی



فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ ہفتم)

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۷۳۸	فطری حقوق و معاملات کی یکسانی	۷۳۲	معاملات
۷۳۸	قانون کا بنیادی تخیل	۷۳۲	ساتویں جلد کا موضوع معاملات
۷۳۹	قانون الہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت	۷۳۲	معاملات کے حدود
۷۳۹	ایک اصولی فرق	۷۳۲	معاملات سے ہماری مراد
۷۴۰	اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت	۷۳۳	اس کام کا اشکال
۷۶۰	عہد نبویؐ میں نظام حکومت	۷۳۳	دیگر مذاہب اور معاملات
۷۹۰	سلطنت اور دین کا تعلق	۷۳۳	معاملات کے ماخذ
۷۹۹	سلطنت اور ملکیت کی حقیقت	۷۳۵	قانون سازوں کی بیچارگی
۷۹۹	اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے	۷۳۵	جمہوریت کی ناکامی
۸۰۰	لفظ ملک الملوک کی ممانعت	۷۳۵	صحیح و عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری
۸۰۹	امت مسلمہ کی بعثت	۷۳۵	قانون الہی کی ضرورت
۸۱۹	قوت عاملہ یا قوت آمرہ	۷۳۶	کتاب اور میزان
۸۲۳	حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے	۷۳۷	قانون الہی کی دائمی یکسانی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعَزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ... وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

دیناچہ

سیرۃ النبی ﷺ کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گنہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسن قبول کے لئے کھول دیا ہے۔
موضوع:

اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام و انواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت و حکمت اور اس باب میں گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذات پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی ایک خطا کا رقلم نے نکھی اور بیان کی ہے۔ اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے جو صراطِ مستقیم ہے اور وہ سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقی ہے۔ تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہؓ اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ ”جو بات کہی گئی ہے اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو نفس خطا کا رکاز تصور ہے۔“

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق:

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیرت کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔ اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرة الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا۔ ان زبانی بیانات اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں۔

”چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر یو یو، قرآن مجید پر پوری نظر غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسانی کلیو پیڈیا اور نام بھی دائرہ المعارف النبو یہ موزوں ہوگا۔ گولب ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا“ (بنام مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی صفحہ نمبر ۱۰۴)

سیرۃ جداول کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصوں کا عنوان ”منصب نبوت“ رکھا تھا اور لکھا تھا۔

دوسرا حصہ منصب نبوت کے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیم، عقائد اور اوامر و نواہی، اصلاح اعمال اور اخلاق

ہے۔ سب پر ”منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتداء اور تاریخی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے۔ اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔ نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔“ (جلد اول طبع، اول صفحہ ۷۷ و طبع دوم صفحہ ۷۹)

گذشتہ چوتھی جلد یا پانچویں جلد اور آئندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہیں۔ منصب نبوت عرب کی گذشتہ حالت اور تعلیم عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائض خمسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں۔ اخلاق و معاشرت کے نقطوں کے لئے چھٹی جلد اور بقیہ اوامر و نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہیں ساتویں جلد ہوگی۔ ان میں سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح میں مصنف اول کی ایماء کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تاریخی پیش نظر رہتی ہے، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذاہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیوں کر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچه است در مرا گفت ہماں می گویم

حسن قبول:

اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسن قبول کی سند عطا فرمائی۔

قبول خاطر دلہا خدا داد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا مجھ سے فرمایا ”یہ کتاب وہاں قبول ہوگئی۔“ ان کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی۔ علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شغف اور عقیدت پیدا ہوگئی۔ ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا۔ فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظر طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے۔

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ کر لوٹ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں مجھ بندہ پیدا ہو گیا ہے اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد:

اس کتاب کے حسن قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جو نئی شائع کیا اس

کی خدمت کے لئے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر نفس محبت رسول ﷺ کے دامن سے وابستہ تھا یعنی امت محمدی کی خدام اور امت محمدی کی خدمت تاج الہند نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرمانروائے شور و صفا پاں (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۳ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ بھائیوں باقی نہ رہے مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مرچکا بد اس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہیں۔ اس لئے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی۔ مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھ تھا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت کہ بر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی تو اس کے واسطے حاضر میرا دل ہے میری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے
جب اس "فقیر بے نوا" کی وفات ہوئی تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ "فقیر بے نوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے۔" آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف و تنقید روایت کے ساتھ ساتھ زرافشاںی کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا۔ وہ تاج و تخت ایک ایسے جوان بخت کے سپرد کر گئیں جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ ان کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھایا اور سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی۔ سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں۔ ﴿حمد لله ملکہ﴾

۱۹۱۵ء ۱۳۳۶ھ میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع مظفر الملک و الممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطان اکبر خد اللہ ملکہ پیش گاہ کی خسروی میں پیش کیا۔ حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرور کائنات فخر موجودات سید المرسلین محبوب الغلیمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ الوفاء التحیات والصلوات کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے۔ سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محفوظ ہوئے اور دوسری جلدوں کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دوبرس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کے لئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا بے حد مدد ملی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ عمر کار ہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا، جو چھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گزر جائے اور آخر میں خوش قسمت سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے۔

ماہم چٹاں در اول وصف تو ماندہ ایم

منزل تمام گشت و پیاں رسید عمر

مؤلف

سید سلیمان ندوی
شبلی منزل اعظم گڑھ

۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عمل صالح

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾

محمد رسول اللہؐ جس تعلیم کو لے کر آئے اس کا بنیادی مسد یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک ایمان اور دوسری عمل صالح۔ کتاب سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ چوتھی جد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی۔ اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح و بیان میں ہے۔ ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے در عمل صالح ان اصولوں سے مطابقت عمل۔ کاسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی سے نہ کافی نہیں جب تک اس علم و یقین سے مطابقت عمل بھی نہ ہو۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزوں یعنی ایمان و عمل صالح پر مبنی قرار دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عمل صالح کو نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملائے ایمان اہمیت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا اصول محال ہے۔ لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کارآمد نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے۔ مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے فرمایا

﴿وَالْعَصْرُ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ ۚ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ (۱۰۰-۱۰۲)

زمانہ (مع غنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھائے میں ہے لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۚ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۖ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ (تیس ۵۴)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا۔ لیکن جو ایمان

لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خواہ انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچی جائے تو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس بدترین منزل کی جستی سے کون لوگ بچ سکتے ہیں؟ وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بندگی ہے۔ یہود سے جن کو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں نے تمہید میں ہے یہ فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ ۖ﴾ (۱۲۰-۱۱۹)

اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہی جنت والے ہیں۔

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح پر ہے۔ جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے۔ فرمایا

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ ۚ﴾ (۱۲۱-۱۲۰)

ضالِحاً فلا خوف علیہم ولا هم یحزنون ﴿ (۱۲۱-۱۲۰)

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے نہ تو ن پر ڈر ہے نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب و ملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے بلکہ احکام الہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نیکو کاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا۔

﴿قَالَ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُفْعَلُ بِي كَمَا يُفْعَلُ بِالْإِنسَانِ ۚ﴾ (۱۲۲-۱۲۱)

صَالِحاً قَدْ جَاءَ الْخُسْنَىٰ ﴿ (۱۲۲-۱۲۱)

اس نے کہا جو کوئی گنہہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹ کر جائے گا تو اس کو بری طرح سزا دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اس کے لئے بھلائی کا بدلہ ہے۔

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْلَ خُسْرٍ ۖ﴾ (۱۲۳-۱۲۲)

تو جو کوئی نیک عمل کرے، اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل کو) لکھتے جاتے ہیں۔

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْلَ خُسْرٍ ۖ﴾ (۱۲۳-۱۲۲)

تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا، و نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کئے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔

اس سے، اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں۔ اے کہ اللہ تعالیٰ بخش فرمائے۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْحَتِ الْجَنَّةِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ . ذَلِكَ هُوَ الْمَوْضِعُ الْكَافِرُ . . . ذَلِكَ الَّذِي يُشْرِكُهُ عِبَادَةُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ (شوری - ۷۳-۷۴)

اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے ان کے لئے ان کے پروردگار سے پاس ہو۔ یہ جو وہ چاہیں۔ یہی بڑی مہربانی ہے، یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔

دوسری جگہ فرمایا

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ حَتَّىٰ الْعَرْدُوسِ أُولَٰئِكَ﴾ (ہب - ۲)

بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کی مہمانی کے لئے باغ فردوس ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾ (ہب - ۱۲)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے۔ کسی چیز پر پورا پورا یقین آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن نا، ان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا، وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے عمل کا تصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز قاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے۔

﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي حُسْبٍ نَّعِمْ﴾ (ج - ۵۶)

تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۴۵ موقعوں پر یہ آیت ہے۔

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾

جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و مزوم ہیں جو ایک

دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فتح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے۔ البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں

پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (نور۔۔)

تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہیں سے تھا۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (نور۔۴)

اللہ نے ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے بخشش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عمل صالح کی جہد احسان یعنی نیکو کاری کو جہد

دی گئی ہے مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا۔

﴿يَسْلَىٰ مِنْ اسْلَمٍ وَجَهَّةٍ لَهُ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَهُوَ أَخْرَجَهُ عَبْدُ رَبِّهِ مِنْ أَدْنَىٰ الْأَرْضِ وَلَا حَافَظٌ عَلَيْهِمْ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ

بَحْرُنُورٌ﴾ (بقہ۔۱۳)

کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکو کار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس

ہے۔ نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح

پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں

میں جیسا کہ پال کے خطوط^۱ میں ہے، صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکو کاری سے نروان کا

درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گمان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلامؐ کے پیغام نے انسان کی نجات کا

ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو مقرر کر دیا ہے۔ یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم تو اصول کے صحیح

ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل، درست اور صحیح ہو۔ یہ عمل صالح ہے اور

ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف کسی اصول طبّی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا

سکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح

کے لئے کافی نہیں جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔

﴿فَإِذْ أَفْضَحَ الْمُؤْمِنُونَ،، الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ حَاشِعُونَ،، وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ،،

وَالَّذِينَ هُمْ لِلرُّكُوءِ هَاعُونَ،، وَالَّذِينَ هُمْ لِمِرْوَجِهِمْ خَمَضُونَ،، وَالَّذِينَ هُمْ لَامَنَتِهِمْ

وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ،، وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ،، أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ﴾ (مائدہ۔۱)

وہ ایمان والے مراد کو پہنچے، جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو ٹکئی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے

ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، جو اپنی نمازوں کے

پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل و اسباب کے تابع فرمایا ہے۔ یہاں کی کامیابی اور

فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی مدد ہے ہماری بھوک دفع نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہار نہ لگائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی مانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے۔ البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیوں کہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آ جانے اور نیک عمل بن جانے کی امید ہو سکتی ہے اور دوسرے کے لئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے۔ اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے۔ یہ سب از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور کرتا تھا۔

اعمال صالحہ کی قسمیں

”عمل صالح“ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کے اندر انسانی اعمال خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں۔ عبادات، اخلاق، معاملات۔

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔ اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کئے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں۔ مگر فقہاء نے اصطلاحاً یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہیں جن کی تفصیل یوں کی جا سکتی ہے کہ اولاً اعمال صالحہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں، دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے۔ پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمال صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبی ﷺ کی موجودہ اور آئندہ جلدوں کا موضوع

ہے۔



عبادات

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ (بقرہ-۲)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے۔ لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گزشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے۔ ساتھ ہی عبادات کے گزشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔

اہل عرب جہاں آسمانی مذاہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے۔ عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقتے عرب میں تھے عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متعشفاً نہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک ”راہب متجمل“ کی صورت میں تھا۔ عرب کا سب سے بڑا شاعر امرء القیس کہتا ہے۔

﴿منارة ممسئ راہب متجمل﴾

دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کے نام کا چراغ۔

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بد عملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے۔ ان میں روحانی خصوص و ایثار اور خدا پرستی نام کوئی نہ تھی۔ وہ صرف سبت (سنچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہودیوں پر اس نے بے صمی نافرمانی، اکل حرام اور طغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے۔ ۱

یہودی جادو، ٹوٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے۔ عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے۔ انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے اور ان کا نام انہوں نے دینداری رکھا تھا۔ سورہ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا

ہے۔ لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور شوکرنا تھا، اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں اسی لئے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا۔

﴿وَنَقُذُرُ سَمَانًا نُوحًا وَأَرْحَمِيمَ وَجَعَلْنَاهُمُ امْتِثَافًا فِي دُرَيْتِهِمَا امْتِثَافًا وَالْكَتَبَ فَمِنْهُمْ مُتَقِدًا وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسَقُونَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُحْمَا وَقَفَّيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَاهُ فِي قُلُوبِ الْبَنِيِّ امْتِثَافًا رَافَةً وَرَحْمَةً وَرَهَابِيَّةً ۝ اتَدْعُوهُمْ مَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمُ إِلَّا اتِّسَاءً رَّصَوَاتٍ اللَّهُ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا ابْنَهُ امْنَةً مِّنْهُمُ الْآخِرِينَ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسَقُونَ﴾ (سہیدہ ۴)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور ان کو انجیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰ کی پیروی کی ان کے دل میں نرمی اور رحمہ لی بنائی اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نبھانا چاہئے تھا نہیں نبھایا۔ تو ان میں جو ایماندار تھے ان کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہونے اسی لئے قرآن نے ان کو بار بار

کہا۔

﴿لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾ (نساء ۲۳ و مائدہ ۱۰)

اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کو قتل کرتے تھے ﴿وَيَقْتُلُونَ السَّيِّسَ﴾ بقرہ و آل عمران ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے۔ چنانچہ تورات میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے۔

﴿وَعِبَدُ الطَّاغُوتِ﴾ (سہیدہ ۶)

اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں کو تبلیغ کی۔

﴿مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ وَأُمُّهُ صَدِّيقَةٌ ۚ كَمَا يَأْكُلُ الطَّعَامَ أَنظُرْ كَيْفَ تُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ۚ قُلْ اتَّبِعُونِ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْنَعُ لَكُمْ صَرًا وَلَا صَفَا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۚ قُلْ يَاهَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَصْلُوا كَثِيرًا مِّنْ ضَلُّوا عَنْ سَوَاءٍ

السَّبِيلُ ﴿۱﴾ (مائدہ-۷۷-۷۵)

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس۔ اس سے پہلے اور پیغمبر گزر چکے اور اس کی ماں دی تھی، دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کے لئے اس طرح کھول کر دیسی بیان کرتے ہیں پھر بھی دیکھ وہ کدھرا لئے جاتے ہیں۔ (ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع۔ اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے کہ اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو بہک گئے اور بہکایا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔
ان کی حالت یہ تھی۔

﴿۲﴾ اتَّخَذُوا اَحْزَابَهُمْ وَرُءُوبَانَهُمْ اَوْلِيَا مِمَّنْ دُوْنَ اللّٰهِ ﴿۲﴾ (توبہ-۱۵)
خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا لیا تھا۔

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جوڑے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً مکہ حبش میں تھیں ان میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔ عبادت گزاران کے آگے دھیان اور رقبہ میں سر سنجو درہتے تھے۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبش کی ہجرت کے اثناء میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ان میں سے شاید بعض بیبیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسبت صورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا، تم ایسا نہ کرنا، ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کر دیتے تھے۔“

ایڈورڈ گھن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں۔ خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک روم کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے درود یوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آ رہی ہیں اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات موسیقیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ روم (اطلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے۔ لات، عزی، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے ان پر جانور قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھیجتے چڑھاتے تھے۔ سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے۔ خانہ کعبہ

یعنی خلیں۔ بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مزار تھا اور ان کی نمازیہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موصد زید بن عمرو جو آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ "اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں، اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا۔" ۱۔

ایک صحابی شاعر عامر بن کوخ خیبر کے سفر میں ترانہ گارہے تھے اور آنحضرت ﷺ سن رہے تھے۔ ۲۔

﴿وَاللّٰهُ لَوْ لَا اَنْتَ مَا اَعْتَدِنَا﴾ ﴿وَلَا تَصَدَقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا﴾

خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم تھی جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں

سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی نہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی۔ بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے بیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ حضرت مریمؑ اور سینئزدوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اور ان کی مصنوعی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں۔ زردشت کی مسمکت میں آگ کی پرستش جاری تھی۔ ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں سادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی۔ چین کے سفوشس اپنے باپ دادوں کی مورتوں کے آگے خم تھے۔ خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، گنگامائی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ عراق کے صابئی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے۔ باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی۔ غرض میں اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی، ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمۡ ۚ اِنِّىۡٓ اَنَا رَبُّكُمۡ ۚ وَتَدۡبِرُوْا فِىۡٓ فُسُوۡكُمۡ﴾ (آل عمران: ۲۰)

لو! اپنے اس پروردگار کی پرستش رو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔

سابق کتب الہی کے ایمان داروں کو آواز دی گئی۔

﴿رَاۤہِلَ الْکُتُبِ تَعَالَوۡا اِلَیَّ کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ نَّبۡیَا وِّنۡبِیۡکُمۡ اِنَّ لَّیَعۡدُ اِلَآ اللّٰہُ﴾ (آل عمران: ۸۰)

اے کتاب والو! آؤ تم اس بات پر عمل متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عقیدۂ متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں۔

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکاراٹھے۔

﴿رَّسَّآ اِنَّا سَمِعۡنَا مُنَادِیۡنَا لِیَاۤدِیۡ لِلْاٰیۡمَانِ اِنَّ اٰمَنُوۡا بِرَبِّکُمۡ ۚ فَاَمَّا رَسَّآ فَاَعۡیۡرُنَا ذُنُوۡۤبُنَا﴾ (آل عمران: ۲۰)

خداوند! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے، تو اے پروردگار

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو

۲۔ صحیح مسلم باب خیبر شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ہے۔

ہمارے گناہ معاف کر۔

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپ کی زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الہی میں کی گئی تھی۔

خداوند! تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لئے ٹرنے پر آمادہ ہے۔ خداوند! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی۔“ ۱۔

خدا نے اپنے نبی کی دعا سنی اور قبول فرمائی کیوں کہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت:

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوت محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبودوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ۔

﴿إِنْ كُلُّ مِزْمِنٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا أِنْبَى الرَّحْمَنِ عِندًا﴾ (مریم: ۶۴)

آسمان و زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ زمین میں نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع، قیام کی مستحق ہے اور نہ ہی اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جاسکتی ہے اور نہ اس سے دعا مانگی جاسکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لئے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے۔

﴿إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْبَاتِي وَمَمْنَانِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (انعام: ۳۰)

بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا۔

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ، وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُوا مَا أَعْبُدُ، وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا

عَبَدْتُمْ، وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُوا مَا أَعْبُدُ، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ (کافرون: ۱۱)

اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو میں نہیں پوجتا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اس کو

پوجنے والا ہوں جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے

اور میرے لئے میرا دین ہے۔

خارجی رسوم کا وجود نہیں:

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب^۱ نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت^۲ نہ دیوتاؤں، دیویوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت^۳ نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم^۴ نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت، نہ لوہان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید^۵ ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے۔ اس کے لئے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے۔ اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں:

اسلام میں عبادت کے لئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانی کی حاجت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں، نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں، نہ ربی ہیں، نہ حاخام ہیں، نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ جیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لئے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت، یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے آپ عرض حال کرتا ہے۔ ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے۔ یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو میں جواب دوں گا۔

﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (مومن-۶)

تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں:

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش و فریب موثر اور بارعب بنانے کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا۔ انہیں ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازیں تھیں، کہیں ساز و ترنم اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غغلہ انداز شور لیکن دین محمدی کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لئے دل

۱۔ جیسا کہ ہندوؤں میں ہے۔

۲۔ جیسا کہ پارسیوں میں ہے۔

۳۔ جیسا کہ ہندوؤں عام بت پرستوں اور رومن کیتھولک میں ہے۔

۴۔ جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں ہے۔

۵۔ یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے۔

کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیر کا سہارا نہیں یہ تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خصوصاً واثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں:

ہر مذہب نے اپنی عبادت کو ایٹھ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے۔ بت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی درود دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت۔ وہ دیر و حرم معبد و صومعہ اور مسجد و منبر سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں من جملہ ان کے ایک یہ ہے۔

﴿وَجَعَلْتُ لِيَ الْأَرْضَ مَسْجِدًا﴾^۱

اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنا دی گئی۔

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشت چمن میں ہو کہ ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدہ نیاز بجالا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضہ عبادت ادا کر سکتے ہو۔^۲

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو مسلمانوں کے لئے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لئے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے۔ لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے۔ اسلام کا قبلہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی حدود سے پاک ہے۔ وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مغرب سے بھی مشرق سے بھی شمال سے بھی اور جنوب سے بھی۔ کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رخ کروادھر ہی خدا ہے۔ چنانچہ کسی چھتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عام نفل نمازوں کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں۔ جدھر سواری کا رخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جاسکتا ہے۔ ٹرائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر خدا نخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔ کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

۱ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب قول النبی ﷺ جَعَلْتُ لِيَ الْأَرْضَ مَسْجِدًا وَ طَهَوْرًا۔

۲ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیت۔

انسانی قربانی کی ممانعت:

بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھتی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلہ کاٹ کر، یا دریا میں ڈوبا کر، یا آگ میں جلا کر، یا کسی اور طرح بھیڑت چڑھا دے۔ اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہ کرے اور مارا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلہ کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوبا کر مر جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔^۱

حیوانی قربانی میں اصلاح:

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا۔ عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے۔ کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور مار کر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھپ دیتے تھے۔ یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں ساسکتی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا (احبار ۲۱-۶) ہے۔ بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے۔ پیغام محمدی نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا

لَا تَقْرَبُوا اللَّهَ لِحُومِهَا وَلَا دِمَائِهَا وَلَكِنْ بِسَائِهِ اتَّقُوا مِنْكُمْ ﴿۳۸﴾ (ج-۳۸)

اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دلوں کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہل استطاعت کے لئے جو موقع حج پر نہ گئے ہوں مقام حج کی یاد کے لئے قربانی مسنون کی گئی ہے تاکہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملت حنفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیغام محمدی نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا رواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں بلکہ اس سے مقصد دو ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت

غریبوں مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَسْكًا يُذْكَرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَفَعْنَاهُمْ مِنْ نَهْمَةِ الْأَنْعَامِ فَالْهَيْكُمُ
الهِ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ﴾ (حج-۳۴)

ہم نے ہر قوم کے لئے قربانی مقرر کی تاکہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں جو ہم نے ان کو روزی کی تو تمہارا
خدا ایک خدا ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوشخبری سنا دے۔

﴿وَالَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غَنَائِهِمْ شَاءَ اللَّهُ لَكُمْ فِيهَا حَبِيرٌ وَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ
وَادًا وَحَتَّ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا الْقَامِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ﴾ (حج-۳۶)

اور قربانی کے جانور کو خدا کی نشانیاں بتایا ہے۔ تمہارے لئے ان میں بہت فائدہ ہے۔ ان کو قہار میں ہڑا کر کے تم
ان پر خدا کا نام لو تو جب وہ پہلو کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند
فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو۔ اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت
میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ ﴿وَمَا أَهْلَ بِهِ لَعِبَرِ اللَّهِ﴾ عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب
کے مہینہ میں قربانی کرتے تھے۔ اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا ”خدا کے نام
سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرؤ نیک کام خدا کے لئے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ لے غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں۔
صرف خون بہانے کے لئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور نہ یہ خون بہانا مشرکوں کی دیہیوں اور دیوتاؤں کی طرح
اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے۔

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت:

اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں۔ عرب میں جانوروں کے قربانی
کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے۔ اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی
کر دیتے تھے اور اس کی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے۔ اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے۔ رجب کے پہلے عشرہ میں ایک
قسم کی قربانی کی جاتی تھی جس کا نام عتیرہ تھا۔ اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کر
دی۔

﴿قَالَ لَا فِرْعَ وَلَا عَتِيرَةَ﴾ ۱

آپ نے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اور ان کو کوئی شخص کسی اور سرے کام میں

۱۔ ابوداؤد باب فی العتیرہ جلد دوم صفحہ ۵۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الاما ضاحی جلد ۲ ص ۵۔

استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس سے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی۔

﴿لَا يَجْعَلُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ رِءُوسٍ سَحِيرَةً وَلَا مَسْنَدَةً وَلَا وَصِيْبَةً وَلَا حَامًّا﴾ (مائدہ: ۱۰۷)

نہ تو خدا نے بحیرہ نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس سے

سلسلہ میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا

﴿لَا عَقْرَ فِي الْإِسْلَامِ﴾^۱

اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں۔

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ وہ آدمی مقابل

ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے۔ اپنا ایک اونٹ یا بکری ذبح کرتا پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا۔ اسی طرح

یہ مقابلہ بدلتا رہتا۔ جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا وہ ہار جاتا۔ اسلام نے اس جان و مال سے

اتلاف کو روک دیا۔^۲

تجرّد ترک لذائذ ریاضات اور تکالیف شاقہ عبادت نہیں

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت

شمار ہوتی ہے۔ اسی لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا

اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی۔ چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت، اور

ہندوؤں میں جوگ، اس اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا، کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا

کرتا تھا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقریر کا ٹکڑا سمجھتا تھا، کوئی چدر کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی

عمر بھر یا سال بھر تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا

رہتا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرّد اور ترک دنیا

کرنے اہل و عیال اور زن و فرزند کے حقوق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدّعی بنتا تھا۔ لیکن نبوت محمدی نے راز آشکار

یا نہ دنیا میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے نہ ہاری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث

ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے

نہ ترک دنیا سے۔ دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے۔ اس نے کہا

﴿لَا يَكْفُرُ اللَّهُ بِنَفْسٍ أَلَا وَسْعَهَا﴾ (بقہ: آخر)

خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا۔

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں۔ اسلام نے اس میں

۱۔ ابو داؤد کتاب الجنائز باب تمکیر اہیۃ الدبع عبد القدر جلد ۲ ص ۳۲۔

۲۔ ابو داؤد کتاب الجنائز باب تمکیر اہیۃ الدبع عبد القدر جلد ۲ ص ۵۔

متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا۔

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (بقرہ-۳۰)

خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرما دیا۔

﴿مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (آل عمران-۱۰)

جس کو (زاد راہ اور چلنے کی) استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (حج-۱۰)

تمہارے لئے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿إِنَّ هَذَا الدِّينَ يَسْرُ وَلَنْ يَشَادُ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ﴾ ۱

یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

اور فرمایا۔

﴿إِنَّمَا آتَا بَعَثَ بِالْحِلَّةِ السَّمْحَةِ أَوِ السَّهْلَةِ الْحَقِيقَةِ الْبِضَاءِ﴾ ۲

میں تو سہل اور آسان روشن دینی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہوتا ہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا۔

﴿وَرَهْنَانِيَّةٌ ۖ اِتَّدَعَوْهَا مَا كَتَبَهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا اِتِّغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقًّا

رعايتها﴾ (حدید-۳)

اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے ان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا تھا تو جیسا چاہئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لئے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (اعراف-۳۱)

پوچھا اے پیغمبر کہ اس زیب و زینت اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے بتایا کس نے حرام کیا۔

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بعض بی بیوں کی خوشنودی مزاج کے لئے شہ نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا۔ خدا نے فرمایا

۱۔ جمع الفوائد طبع میرٹھ جلد اول صفحہ ۲ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری و سنن نسائی۔

۲۔ مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶۔

﴿لَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنْكُمْ أَحَدٌ مِنْكُمْ لِيُحَدِّثَ عَنْكُمْ أَوْ يَأْتِيَنَّكُمْ أَحَدٌ مِنْكُمْ لِيُحَدِّثَ عَنْكُمْ﴾ (بخاری)
 - پیغمبر! خدا کے کسی چیز کو تم سے حدال یا تو اس کو اپنی بی بیوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے،
 اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

صحیہ میں بعض ایسے لوگ تھے جو صحابی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تہجد ترک لہذا مذکور
 ریاضیات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لے کر
 نہیں آیا۔ قدامہ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ہم میں سے
 ایک نے عمر بھر مجھ رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا "میں تو
 دونوں باتیں کرتا ہوں" یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ ۱۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں
 گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ "اے عبداللہ تم پر تمہارے
 جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے۔ ۲۔
 اسی قسم کی نصیحت آپ ﷺ نے ایک دوسرے نقشب پسند صحابی حضرت عثمان بن مظعون کو فرمائی۔ آپ کو ان کی نسبت
 معصوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں،
 رات کو سوتے نہیں، آپ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ "کیوں عثمان تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے۔" عرض کی "خدا کی قسم
 میں نہیں بٹتا ہوں۔ میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں۔" فرمایا میں سوتا بھی ہوں، اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ
 بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال
 کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز
 بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ ۳۔

قبیلہ بہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل
 روزے رکھنے لگے۔ ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ
 ان کو پہچان نہ سکے۔ انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا "تم خوش رو تھے تمہاری صورت کیوں ایسی ہو گئی۔" عرض کی "یا رسول
 اللہ ﷺ جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں۔" فرمایا "تم نے اپنی جان کو ایوں عذاب میں ڈالا
 رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے۔" انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ نے مہینہ میں دو
 روزوں کی اجازت دی۔ انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیئے۔ انہوں
 نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔ ۱۔ ایک دفعہ چند صحابی پانے

۱۔ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یؤمر بہ من القصد فی الصوم۔

ازواجؓ مطہرات کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا ﷺ کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔ نبیوں نے آپ ﷺ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا۔ دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزے رکھوں گا۔ تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا، کبھی نکاح نہ کروں گا۔ آنحضرت ﷺ ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا ”خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں۔“ ۱

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے چاہا کہ اپنا عضو قطع کرادیں۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہؓ کہتے ہیں اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ ۲

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام و بالغ کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا۔ آپ نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے۔ صحابہؓ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے۔ آپ نے منع فرمایا۔ لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے افطار نہ کیا۔ آپ نے دو دن روزہ رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا۔ آپ نے افطار کر لیا اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزہ رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں۔ فرمایا ”تم میں سے کون میری طرح ہے؟ مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔“ ۳ اسی لئے اسلام میں عام امت کے لئے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گزر ہوا دیکھا تو ایک ستون میں ایک رسی لٹک رہی ہے۔ دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے۔ رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارا کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا ”یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے۔ جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے۔“ ۴

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گزری۔ حضرت عائشہؓ نے کہا یہ خولاء ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں

۱۔ ابوداؤد باب صوم، شہر الحرم۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب النکاح۔

۳۔ صحیح بخاری و ابوداؤد کتاب النکاح۔

۴۔ صحیح مسلم کتاب الصوم۔

۵۔ جمع القوائد بحوالہ معجم بیروہ و وسط ملطہ فی ابوداؤد عن انس جداول صفحہ ۲۰ طبع میرٹھ باب اقتصادی اعمال۔

سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے۔ فرمایا کہ ”یہ رات بھر نہیں سوتی! لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے۔“^۱
جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

﴿كَمَلُوا مِنَ الْعَمَلِ مَا تَطِيقُونَ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَمَلُّ حَتَّى تَمَلُّوا فَإِنَّ أَحْسَنَ الْعَمَلِ أَسَى اللَّهِ
ادومہ وَإِنْ قُلْ﴾^۲

اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو۔ کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ خدا نہیں اکتاتا۔ خدا کے نزدیک سب سے
پسندیدہ وہی کام ہے جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ عہد کرتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان
سے کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں
کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چھیں گے۔ بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لئے اپنی ناک میں نیل ڈال کر طواف
کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے۔ اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی
کا باعث نہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی۔ عقبہ نے آ کر آنحضرت ﷺ سے
فتویٰ پوچھا۔ آپ نے جواب دیا خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں۔^۳
اسی طرح آپ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے۔ آپ نے اس کو
سوار ہونے کا حکم دیا۔ اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ نے فرمایا ”میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور
ہے لیکن تم اس پر سوار ہولو۔“^۴ ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی
ہے۔ فرمایا ”خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو۔“^۵

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلا آتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ نے
پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ
وہ کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ نے فرمایا ”اس
سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے۔“^۶

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نیل پکڑ کر
کھینچ رہا ہے۔ آپ نے جا کر نیل کاٹ دی اور فرمایا کہ ”اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ۔“^۷

۱۔ جمع الفوائد بحوالہ صحیحین وموطاؤ نسائی۔

۲۔ ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ۔

۳۔ ابوداؤد ومسنن ابن جارود کتاب الایمان والاندور۔

۴۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۸۲۔

۵۔ ابوداؤد ترمذی ونسائی وابن جارود کتاب الایمان والاندور۔

۶۔ صحیح بخاری ابوداؤد وابن جارود کتاب الایمان والاندور۔

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپ نے فرمایا۔

﴿ لَا تَشَدُّوا عَمَلِي اَفْسَکُمْ فَاَمَّا هَلْثٌ مِّنْ کَانَ فَمِکُمْ تَشَدِّدٌ هُمْ عَمَلِي اَفْسَهُمْ وَ
مُتَّحِدُونَ بَقَايَا هُمْ فِی الصَّوَامِعِ وَالدِّیَارَاتِ ۝۱۰۰ ﴾

اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلے قومیں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی
گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔

خاتم الانبیاء ﷺ نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر

دیا۔ آپ نے فرمایا:

﴿ لَا صُرُورَ فِی الْاِسْلَامِ ۝۱۰۱ ﴾ (ابوداؤد)

اسلام میں رہبانیت نہیں۔

عزالت نشینی اور قطع علاقہ عبادت نہیں:

اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی نازکھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام
دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔ اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کی
بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے
الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے۔ اس لئے وہ کسی تعریف کا
مستحق نہیں۔ اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے اثر و دام اور علاقے کے جھوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک
کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے۔ جو شخص ان تعلقات و علاقوں اور حقوق و فرائض کے جھوم سے بھرا کر کسی
گوشہ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامزد اور بزدل سپاہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو جو انہر دہ سپاہی دینا
چاہتا ہے جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں۔ غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں بلکہ
ادائے فرض ہے۔ ترک عمل نہیں بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر
دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے فرمایا ”اے فلاں تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق
ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے۔“ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر
میں عبادت ان حقوق کو بجالانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گدرا ایک ایسے
مقام پر ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا۔ آس پاس کچھ جنگل کی بوئیاں بھی تھیں۔ ان کو
اپنی عزالت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمت بابرکت میں آ کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھ کو ایک غار ہاتھ آ
گیا ہے جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کر لوں۔ آپ نے فرمایا ”میں

۱ صحیح بخاری ابوداؤد وابن جارود کتاب الایمان والندور

۲ جمع الغوائد بحوالہ معجم کبیر وادوسطی مطہرانی و ابوداؤد صفحہ ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال

یہودیت اور عیسائیت کے کردار میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب کے لے کر آیا ہوں۔“ ۱۔
اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ کا حرام میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا، شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن 'گوشہ عزلت اور زاویہ تنہائی میں بسر ہوتے تھے ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ مل کر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہ کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادی عبادت تھی۔ ۲۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم:

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہو گا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور در ماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاحاً شریعت میں خدا کے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا آنا ہے۔ اسی کے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے۔

﴿اِنَّ الدِّينَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سُبْحٰنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ﴾ (مومن)۔
جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔

مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶

۱۔ خدم میں پیشہ یہی آواز نکلتی تھی کہ "اے اللہ میں فطرتاً ہی تیرے لئے بند ہوں۔" ۲۔
۳۔ وہ دنوں و راتوں میں بندگی کرتا رہتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو برائی سے بچنے کی تلقین یہ بتائی ہے کہ "لوگوں سے قطعاً قطع کر کے۔" ۴۔
۵۔ نبی میں ہے کہ یہ بدو ہے۔ آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا "ایک تو وہ جو اپنی جان و مال و خدی و راس و قبا و کتاب و اسلحہ و جو کسی گھائی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے۔" ۶۔ وہ لوگوں و اپنے شریعت سے محفوظ رہنے کے۔" (صحیح بخاری کتاب ۱۰۰ باب ۱۰۰) ۷۔ اس تعلیم نبوی کے تحت وہ لوگوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطرتی توفیق ملی۔ ۸۔ وہ لوگ پر یہ فاضل ہے۔ وہ جمع و روز میں روزوں کی بندگی کا فاضل جامد ہیں۔ یہاں تک کہ اس روز میں ان کی دولت میں خرچ ہو جائے۔ ۹۔ ان کی بات بھی کام آجائے۔ ۱۰۔ وہ لوگ ہیں جن میں طبع مروت و نرمی اور وہ لوگوں کو نصیحت پہنچانے کا وہ ہے۔ ۱۱۔ ان کی خدائی اور روحانی اصلاح میں ہے۔ ۱۲۔ وہ اپنے و جمع سے الگ رہ کر خدائی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں تاکہ وہ خدا کے بارے میں لوگوں سے آزار سے محفوظ رہیں۔ ۱۳۔ وہ موقع جس میں آنحضرت ﷺ نے عزت نشینی و اجازت دی ہے وہ وہاں جمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتوہ و حکم کا بار اسی طرح ادا کرے۔ ۱۴۔ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس سے استغناء و ہٹ چکی ہے۔ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے چنانچہ آپ کے مناجات سے فرمایا کہ "ایک یہ زمانہ تو ان پر آئے گا جس میں یہ مسلمان کی بہترین دولت بری ہوگی جس کو وہ وہ بارش کی جھریوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں و تلاش کرے گا تاکہ وہ اپنے دین و ایمان و تقویٰ سے بچا سکے۔" (صحیح بخاری کتاب الادب باب ۱۰۰) ۱۵۔ (رحمۃ من خطا السوء) گوشہ گیری اور عزت سے یہ موقع بھی درحقیقت نبوت صیغہ اصول پر مبنی ہیں۔ پہلے موقع میں ایسے افراد جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ ہو سکے۔ بجا نقصان کا اندیشہ ہو، نگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لئے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام قائم ہو یا نہ ہو اور وہی فرد جو بجا خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

فرشتوں کے متعلق فرمایا۔

﴿وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ﴾ (انبیاء-۲)

جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔

سعادت مند اور با ایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا۔

﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِإِيسَى الذِّينِ إِذَا ذُكِرُوا بِهَا حُرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا

يَسْتَكْبِرُونَ﴾ (سجده-۲)

میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جن کو ان آیتوں سے سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار

کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے

متضاد معنی ہیں۔ اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا اور خدا کے

سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام

کے سامنے اپنی گردن اطاعت کو خم کرنا ہے۔ اس بنا پر صحیفہ محمدی کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے

مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام

کرے لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا

کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت

کے درمیان ہر فارق ہے۔ قرآن پاک میں یہ نکتہ جا بجا ادا ہوا ہے۔

﴿وَسَبِّحْهَا اللَّاتِفَى، الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهُ یَتَرَشَّحِی، وَمَا لَاحِدٌ عِنْدَهُ مِنْ بَغْمَةٍ تُخْرِی، اِلَّا

اِنْتَعَا وَجْهَ رَبِّهِ الْاَعْلٰی، وَلَسَوْفَ یَرْصِی﴾ (ہل-۱)

دوزخ سے وہ پرہیزگار بچا لیا جائے گا جو اپنا دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان باقی

نہیں جس کا بدلہ اس کو دیتا ہو۔ بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا۔

﴿وَمَا تُفْقُونَ اِلَّا اِنْتَعَا وَجْهَ اللّٰهِ﴾ (بقرہ-۲۷)

صرف خدا کی ذات کی طلب کے لئے جو تم خرچ کرو۔

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ (انسان-۱)

ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے ہیں۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ، الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُونَ﴾ (مومن-۱)

پیشکار ہوان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور جو دکھ دے کے لئے کام کرتے ہیں۔

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت ﷺ نے ان مختصر لیکن مبلغ فقرہوں میں فرمادی ہے کہ

﴿اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ﴾ (صحیح بخاری و مسلم)

اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔

اسی کی تشریح آپ ﷺ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھریا چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے۔

﴿لِكُلِّ امْرِءٍ مَا بَوَىٰ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَاجِرُهُ عَلَى اللَّهِ وَمَنْ كَانَتْ

هِجْرَتُهُ إِلَىٰ دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَسْكُحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَىٰ مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ﴾ (نذری باب ذل)

ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اس کا ثواب خدا دے گا۔ اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہے یا کسی عورت کے لئے ہے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی نیت سے اس نے ہجرت کی۔

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں پہلی

چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے۔ اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے عبادت ہے۔ اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھوں دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔

تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ نَعْلَمُ تَقْوَنَ﴾ (بقہ ۳)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصول تقویٰ ہے۔

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ”تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔“ ۱۔ اور قرآن نے بھی سقوی القلوب ۲۔ ”دلوں کا تقویٰ“ کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے۔ نماز روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو سب عبادت ہیں۔

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے مثلاً نماز، دعا، قربانی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بے حد وسیع کر دیا۔ اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے کیا جائے، عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لئے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو لیکن

مسلم کتاب ابرو الصلۃ باب تحریم ظلم المسلم۔

اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت خوشنودی اور رضا مندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعہ مٹا دیا۔ دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کئے جائیں لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں دین کے کام ہیں اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو۔ غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔ چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن صَيْبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ آيَاهُ تَعْبُدُونَ﴾
(بقہ ۲۱-۲۰)

اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے۔ ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (حود-۱۰)

اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ رکھو۔

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا

﴿فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ﴾ (مریم-۱۳)

اس کی عبادت کر اور صبر کر۔

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و توفیق کی بات کرنا اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى﴾ (بقہ ۳۶-۳۵)

اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

﴿كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ﴾ (بخاری کتاب الادب)

ہر نیکی کا کام خیرات ہے۔

﴿تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ اخِيكَ صَدَقَةٌ﴾

تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے۔

﴿وَأَمَّا طَةَ الْإِذَىٰ عَنْ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ﴾

راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے۔

غریب اور یتیم کی مدد بھی عبادت، بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے فرمایا۔

﴿السَّاعِي عَلَى الْإِزْمَلَةِ وَالْمَسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَكَالَّذِي يَصُومُ النَّهَارَ وَ

يَقُومُ اللَّيْلَ﴾ (بخاری کتاب ادب)

یتیم اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے برابر

ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو۔

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز

روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا۔

﴿إِلَّا أَحْسَرَ كُمْ مَفْضَلُ مَنَاسِكِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ﴾

کیا میں تم کو روزہ نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں؟

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ارشاد فرمائیے، فرمایا:

﴿إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ﴾^۱

وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔

حضرت سلمانؓ فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابوذرؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی

اور میٹھے کپڑے پہنے ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے۔ اس

سے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا تو ابوذرؓ نے کہا میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں

کھاؤں گا۔ آخر انہوں نے افطار کیا۔ رات ہوئی تو ابوذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے۔ حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو

، پچھلی پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ

نے ان سے کہا "اے ابوذرؓ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق

ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو"۔ حضرت ابوذرؓ نے حضرت سلمانؓ کی خدمت میں آ کر حضرت سلمانؓ کی یہ

تقریر نقل کی۔ آپ نے فرمایا کہ سلمانؓ نے سچ کہا۔"^۲

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ تمام کاموں میں سب سے بہتر کونسا کام ہے" فرمایا

خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ لوگوں نے پوچھا کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔ ارشاد ہوا

۱۔ سنن ابی داؤد و جند دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲۔

۲۔ سنن بخاری کتاب ۱۰ باب صنع الطعام، الحکف للضعیف صفحہ ۹۰۶۔

جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو۔ انہوں نے کہا ”اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا ”پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو یا جس سے کوئی کام بین نہ آتا ہو اس کا کام کر دو۔“ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے۔ فرمایا ”تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو۔ یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو۔“ ۱۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ ”میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا“ وہ عرض کریں گے ”خداوند! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تم جہان کا پروردگار ہے“ فرمائے گا کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا۔ اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے۔“ اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا“ وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ وہ فرمائے گا تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا۔ اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔“ اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی“ وہ کہے گا ”اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔“ فرمائے گا ”تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر کرتا تو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔“ ۲۔

اس مؤثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے توبہ پر دے چاک کر دیئے اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں آپ نے انہیں بتایا کہ اے سعد! جو چہ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے اس کا تم کو ثواب ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو اس کا بھی ثواب ہے۔ ۳۔ ابو مسعودؓ انصاری سے ارشاد فرمایا ”مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔“ ۴۔ غریب و نادار صحابہؓ نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی، کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں وہ بھی روزے رکھتے ہیں ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں جو ہم نہیں بجالا سکتے۔ فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا ”یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے“ فرمایا کہ اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گنہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا۔“ ۵۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ ہو گا کہ حسن عمل ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی توبہ برتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدی نے بالکل

۱۔ ادب المفرد امام بخاری باب معونة الرجل احاء۔

۲۔ ایضاً باب عيادة المرضى۔

۳۔ ادب المفرد باب یوحرفی کل شی۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب النفقات۔

۵۔ ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ۔

صحیح طور سے خلقت انسانی کی غرض و غایت عبادت الہی قرار دی ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (ذاریات-۳)

میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں جن کے بحسن و خوبی انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک فریضہ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے۔ جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقرہ میں آکر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں اس لئے ان چار فرضوں کو جب طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

۲۔ وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے۔ صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔

۳۔ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھینا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کو نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حاصل ہوتی ہیں، روزہ ہے یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

دنیا کے اسلام میں ملت ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم مرکزی رشتہ اتحاد کا قیام اور اس مرکز کی آبادی اور کسب روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرعنوان حج ہے۔

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام اعمال اور اچھے کام انہی اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے (۱) توحید و رسالت کا اقرار کرنا (۲) نماز پڑھنا (۳) روزہ رکھنا (۴) زکوٰۃ دینا (۵) حج کرنا۔“ پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں۔ انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔

اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں

بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں۔ جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب میں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لئے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدا نے وعدہ فرمایا ہے مشکوک ہے۔ یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے یوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف یوں نہیں کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت و پست عت یوں نہیں بنتا اور قرن اول کی طرح ہماری نمازیں سکوں کو فتح اور ہماری زکوٰۃ ہماری قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتی اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (نور۔۔)

اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیک کام کرتے ہیں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان زمین میں خلیفہ بنالے گا۔

ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی بقاء کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیاۓ فانی کی بادشاہی کا اہل بنادے۔ مگر آسمان کی بادشاہت اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔



نماز

﴿اقِمُْوا الصَّلَاةَ﴾

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوزھے، جوان، عورت، مرد، بیمار و تندرست، سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو۔ اور اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔ اگر رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو۔ نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل زبان اور ہاتھ سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان و رحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکر، حسن ازل کی حمد و ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مجبور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بقرار روح کی تسکین مضطرب قلب کی تشفی، اور مایوسوں کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا، اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا، اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا انسان کی فطرت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجاتا رہتا ہے، یہی سب سے سب سے سکھ کا فطری جواب ہے۔ قرآن نے جا بجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو۔

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے، اندرون دل کی عرض نیاز کرے اور اپنی دلی تمنائیں کو اس کی سامنے پیش کرے، غرض عبادت روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش و خروش کا مداح ممکن نہیں۔ وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے چھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیوں کر خالی ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے چھ مراسم موجود ہیں۔ اسلام میں اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا، پارسیوں میں زمرہ، اور ہندوؤں میں بھیجن ہیں، اور دن رات میں اس فیضانے آکرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے۔ اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان

۱۔ نعل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۸ بروایت موقوف از دار قطنی۔

۲۔ ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب۔

۳۔ مسلم کتاب الصلوٰۃ باب جو از صلاۃ النافۃ علی الدائۃ فی السفر حیث نہ جہت۔

اصول میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔ خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ ﴿رَتَّبْنَا يُفْنِمُوا الصَّلَاةَ﴾ (برہیم۔ ۱) اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کریں۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں کہ ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقْبِلَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ اے میرے پروردگار مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا۔ حضرت اسماعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے۔ ﴿وَكَانَ بِأَمْرٍ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ﴾ (مریم۔ ۴) اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے۔ حضرت شعیبؑ کو ان کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں۔ ﴿أَصْلَوْثُ تَأْمُرُكَ أَنْ تَتْرَكَ مَا يُغْنِيكَ عَنْهُ﴾ (حمود۔ ۸) کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں۔ حضرت لوطؑ حضرت اسحاقؑ حضرت یعقوبؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے۔ ﴿وَإِذْ حَسْبُنَا بِهِمْ فِى الْحَبْرَاتِ وَ قَامَ الصَّلَاةُ﴾ (انبیاء۔ ۵) اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی۔ حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں۔ ﴿يُؤَسِّرُ الْفِى الصَّلَاةِ﴾ (لقمان۔ ۲) اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ﴿فِى الصَّلَاةِ لَدِكْرِى﴾ (طہ۔ ۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے ﴿وَقِيْلَ لَهُمْ الصَّلَاةُ﴾ (یونس۔ ۹) اور نماز کھڑی کیا کرو۔ بنی اسرائیل سے وعدہ تھا ﴿تَسْبِيْحًا مَعَكُمْ فِى اَفْتِنَةِ الصَّلَاةِ﴾ (مائدہ۔ ۳) میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔ حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے۔ ﴿وَهُوَ فَائِزٌ يُّصَلِّى فِى الْمِحْرَابِ﴾ (انعام۔ ۴) وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت یحییٰؑ کہتے ہیں ﴿وَاُصَلِّى بِالصَّلَاةِ﴾ (مریم۔ ۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔

﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَانِعَةٌ يَتْلُوْنَ اٰیَاتِ اللّٰهِ اَمَّا السَّبِيْلُ وَهُمْ يَسْتَحْذِرُوْنَ﴾ (آل عمران۔ ۱۱۳)

اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لئے اصطلاحی لفظ خدا کا نام لینا تھا چنانچہ تورات اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۱۲) حضرت احقؑ نے خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶-۲۵) حضرت اود نے خدا کا نام لیا (زبور ۱۱۶) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے و ذکر منہ رتہ فصلى (الاعلیٰ) اور اپنے رب کا نام لیا پس نماز پڑھی اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں یہودیوں کے پچھلے صحیفوں سفر انیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ صلوٰۃ کے ہم معنی ہے۔ اس لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے (متی ۷-۲۱ اور متی ۲۳-۲۴)۔

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو تہہ بند باندھ لو، یا چادر اوڑھ لو۔ یہودیوں کی طرح (ننگے) نہ پڑھو (ص ۷۲) تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو (ص ۷۳) نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو (ص ۱۱۲) تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو (ص ۱۱۳) میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے (ص ۸۴) ان حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔

عرب میں جو لوگ اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقہ عبادت سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گزر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھ کو کیسے پوجوں۔ یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے۔^۱ لیکن ایک دوا ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے؟ کہنے لگے جدھر رخ کر لیا۔^۲ عرب کا ایک جاہلی شاعر جرّان العود کہتا ہے۔^۳

وا در کن اعجازاً من اللیل بعدما اقام الصلوۃ العابد المتحف

(اور ان سوار یوں نے رات کے پچھلے حصہ میں اس وقت کے بعد جب کہ عبادت گزار صلی نماز پڑھ چکا تھا) اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب صنفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھادیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور نماز سے زیادہ انہوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا، جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔^۵

دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے۔ الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی۔ اس کی شکل و صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان

کنز العمال جلد چہارم طبع حیدرآباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھ دیئے گئے ہیں۔

۱۔ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل۔

۲۔ سنن مسلم فضائل بی ذر ۱۲۔

۳۔ لسان العرب لفظ تحف ۱۲۔

۴۔ دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (ورث) ۱۲۔

کے صحیفوں میں اس کی اصل شکل نظر نہیں آتی نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور امانت دار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤں کو پڑھتے تھے اور اس کی ادائیگی کے کیا اوقات تھے۔ جو پتہ ان میں رہ گیا تھا وہ صرف عملی رسم و رواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی چھ تجویزیں جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا۔ مجہد جو نماز کی روح اور نیاز الہی کی انتہائی منزل ہے اس کو یہود و نصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی۔ قرآن مجید میں ان کی اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

﴿فَحَنَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرَثُوا الْكُتُبَ يَأْخُذُونَ عَرَصَ هَذَا الْأَذْنَى وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَصٌ مِثْلُهُ يَأْخُذُوهُ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَنْهُمْ مِثْلُهَا أَنْ لَا يَقُولُوا عَنِ اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ وَالْذَّارُ الْأَحَرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ - أَفَلَا تَعْقِلُونَ، وَالَّذِينَ نَسَكُوا مِلَّةَ الْكُتُبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ثَمَّ لَا تُصْلِحُ أَعْرَاضَهُمْ﴾ (مائدہ - ۱۰)

ان کے بعد ان کے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادوں سے وراثت میں ملی، وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آنے والے ہیں (وہ مذہب کی پروا نہ کریں) یہاں سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ نہیں کے اور ان لوگوں نے جو پچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو پڑھا اور آخرت کا گھرانہ لوگوں کے لئے ہے جو پرہیزگار ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور انہوں نے نماز کو قائم کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنے والوں کی مزدوری کو برہاد نہیں کرتے۔

سورۃ مریم میں تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے۔

﴿فَحَنَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَصَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ﴾ (مریم - ۳)

ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنہوں نے نماز کو برہاد کر دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔

نماز کے ضائع اور برہاد کرنے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس کی حقیقت اور اس کی روح کو گم کر دینا ہے۔ مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حی علی الصلوٰۃ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے ہیں تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہلکی کھیل بنا لیتے ہیں۔

﴿وَإِذَا مَدَّيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ أَتَّخِذُوا هَا هُزُرًا وَلَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (مائدہ - ۵۸)

اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہلکی کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں۔

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے وہ نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا۔ حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کے نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے۔ موصدا نہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شاید تک نہ تھا۔ مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے

دیکھ لینے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، دھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءٌ وَتَصْدِيدَةٌ﴾ (نہ ۳)

اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجاتا ہے۔

اگلے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لئے ہیں ایک یہ کہ واقعا وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تال بجا کر کرتے تھے دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی۔ پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو و لعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔

ایک اور آیت میں ہے۔

﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يُنْهَىٰ، عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ﴾ (علق ۱)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی ذات ہے۔ آپ جب محن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے۔ کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے۔ اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشت مبارک پر نجب ست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ کو اس بار نجات سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ اسی نے آنحضرت ﷺ سلام کے آغاز میں تواخفاء کے خیاب سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی خار یا درہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا پھر رات کے سنانے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے، مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ابن احق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھائیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی۔ اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی۔

الغرض جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو خدا کے آگے سر سجدہ ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے۔ ان کی نمازیں بالعموم اخلاص و

۱ ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

۲ ایضاً۔

۳ صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکر۔

۴ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المرأة تطرح عن المصلي شيئا من الاذى۔

۵ سيرة ابن هشام (ابتداء ما فترض الله سبحانه من الصلوة)۔

اثر سکون و مجموعی خشوع و خضوع اور خوف و خشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انہوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آمینہ تھی ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا وہ اس روحانی لذت سے آشنائی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم:

آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا۔ ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (مذثر - ۱) اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ، اور ہشیار کر، اور اپنے رب کی بڑائی بول رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتے ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھولے ہوؤں کو بتایا، انجانوں کو سکھایا، اور خدا اور بندے کے نوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست کے، سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جد کھڑے تھے دھکیل کر نیچے را دیا۔ صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدہ کو حرام قرار دیا اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی۔ آپ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، موثر دعائیں تعلیم کیں، یہ مانیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا۔ یہودیوں کو نماز کے خضوع و خشوع، راز و نیاز اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونوں کے ساتھ ناقابل تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ:

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ﴾ (بقرہ - ۳۱)

نمازوں کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

﴿وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (انعام - ۱۱)

اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾ (معارج - ۱)

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (مؤمن - ۱)

اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

خود آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل و عیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس

کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جیسے رہو، فرمایا

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (طہ-۸)

اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جتے (پابند) رہو۔
نماز کیسی ہونی چاہئے؟ فرمایا۔

﴿وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ (بقرہ-۳۱)

اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔

تعریف کی گئی کہ

﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ (مومن-۱)

کامیاب ہیں وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔
حکم ہوا کہ

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ (اعراف-۱۷۰)

تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔

﴿وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ (اعراف-۱۷۱)

اور اس (خدا) کو ڈرا اور امید کے ساتھ پکارو۔

﴿وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (اعراف-۱۷۲)

اور خدا کو پکارو اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہو۔

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ:

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لئے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی ہی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرار عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح معین اور تاکید حیثیت حاصل نہیں یعنی کسی مذہب کے پیروؤں بلکہ معلموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسا کہ گذر چکا قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں واضح اور موکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتاب ہو کر آیا ہے اس لئے اس فریضہ الہی کو دین کامل میں ایسی منظم واضح مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان تنفس جب تک اس میں چھ بھی ہوش و حواس باقی ہے کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی

ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت ہے اور اس کا ترک کفر کی نشانی ہے بتائی گئی ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شہستانِ قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔ ۱

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے چنانچہ سورہ روم (۴۷) میں پہلا حکم یہ دیا گیا۔ ﴿وَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (روم ۴۷) اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دینِ توحید پر سیدھا رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملتا ہے۔

﴿وَاقِمْ الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ (۴۷-۴۸)

اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بزحمت نہ رہیں خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ذکر ظاہر فرماتے رہے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے۔ جس طرح ستون رُج جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آ کر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا۔ آپ نے دو پھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا۔ لیکن نماز کے متعلق فرمایا جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نماز دل کی روشنی ہے اپنی نسبت فرمایا ہے نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ ایک تمثیل میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے“ یہ محبوبِ ازل کے بحر و فراق کی آگ ہے اور نماز آبِ زلال ہے جو اس آگ کو نہ دہکاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے۔ کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے۔ عین اس وقت جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبانِ مبارک سے ادا ہو رہے تھے آپ فرما رہے تھے نماز اور غلام۔ ۲

۱۔ منافقین کی صفت میں ہے ﴿وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾ (نساء-۲۱) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہیں ﴿وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ إِذَا صَلُّوا﴾ (مومن-۱) افسوس بیان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں کفر کے بارے میں ہے ﴿لَمْ يَكُنْ مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (مشر-۲) ہم نمازیوں میں نہ تھے۔ یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو۔

۲۔ کتب صحاح و واقعات معراج و اسراء و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

۳۔ یہ تمام حدیثیں کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں۔

انسان کو اپنی روحانی تڑپ دلی بے چینی قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر، زمانہ، جسم کی ہر قوت، عاجز اور سلاستی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون و اطمینان کی راحت اس کو نہ فاسی یک قادر مطلق کی پکار دے اور التوجہ میں ملتی ہے۔ وحی الہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا۔

﴿إِلَّا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ (۴۰-۴۱)

ہاں! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور عینی چارہ کار بنتے ہیں

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (۵۰-۵۱)

ثابت قدمی اور نماز (یادِ عباد) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر و توانا کے سامنے سرنگوں ہے۔ آسمان زمین چاند ستارے دریا پہاڑ جنگل جہاز چاند پرند سب اس کے آگے سر بسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بے چون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح و نماز ہے۔

﴿وَالْأَشْيَاءُ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَكَسَّ لَا يُفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ (۵۱-۵۲)

اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے اب تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔

﴿سَمِيعٌ رَاقٍ يَخَذُّهُ مِنَ الْمَشْرِقِ شَمْسٌ وَمِنْ فِي الْأَرْضِ وَشَمْسٌ وَنَقْمٌ وَشُجُومٌ

وَنُحُومٌ وَشَجَرٌ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقٌّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ﴾ (۵۲-۵۳)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج چاند تارے پہاڑ درخت جانور اور بہت سے

آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا (یوں کہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثناء خدا کے سامنے سرنگوں ہے۔ لیکن استثناء ہے تو صرف انسان میں کہ بہتر سے اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہتر سے اس سے روگرداں ہیں اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثناء اطاعت گزار ہے کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے۔ اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت و انقیاد اور بندگی و رافقندگی کی دعوت دیتی ہے۔ جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح و جہیل میں مصروف ہے تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحانی غرض و غایت:

نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالق کل، رازق عالم، مالک الملک، منعم اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر

ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر ارادہ و نیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں جس سے اپنے برے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے مجبجیں اور باآخران سے بالکل باز آئیں۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ نے "کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں آ کر ایمان اسلام کی حقیقت دریافت کی۔ آپ نے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو جو یا تم اس کو دیکھ رہے ہو یوں کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھو کے کیوں کہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔ اس کو جانا چاہئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے۔ نماز میں ایک اور سے بڑا آواز کو مت دباؤ۔ ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عبادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر ایسے نفسیاتی اثرات جاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے اسی سے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی۔

﴿ اَقِمِ الصَّلَاةَ اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَذَكَرَ اللّٰهُ اَكْبَرُ ۝ (نملہ: ۵) ﴾

اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور ابدتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں۔ بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝ (طلہ: ۱) ﴾

کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام یاد کیا نماز پڑھی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے۔ اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے۔

﴿ اِنَّمَا تُنَدِرُ لَذٰلِكَ يَحْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ۚ وَاَقِمُوا الصَّلَاةَ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَاِنَّمَا تُنَدِرُ لِنَفْسِهِ ۚ (طہ: ۱۳) ﴾

وَاللّٰهُ الْمَصْبُورُ (طہ: ۱۳)

تو انہیں کو تو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور

دل کی صفائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جاتا ہے۔
اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَرُوعًا، وَإِذَا مَسَّهُ الْحَيْرُ مَوُوعًا، إِلَّا الْمُصَلِّينَ، الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ ذَاتِعُونَ﴾ (مہارج: ۱)

بے شک انسان بے صبر رہتا ہے، جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے نماز کے انہیں ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں صحیہؒ سے فرمایا کہ ”اگر کسی شخص کے گم کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس پر میل رہ سکتا ہے؟“ صحیہؒ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ ارشاد ہوا کہ ”نماز بھی اسی طرح گنہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو“۔ ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آ کر اپنے ایک گنہ کی معافی کی تدبیر پوچھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَاقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي السَّهَارِ وَرُفَعَا مَسِّ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُ السَّيِّئَاتِ ذَلِكِ ذِكْرِي﴾ (ص: ۱۰۰)

اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز ٹھہری یہ کر، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت:

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب ”قلب کا عالم“ اور فلسفہ نفسیات یا دماغی کیفیات کہتا ہے اس کے لئے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجے مرتب ہوتے ہیں۔ سائنس کا لوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس رہ کو بالکل کھول دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یاد دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور دلوں کے پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب

یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے کنز العمال (جلد ۴ صفحہ ۶۷ و ۶۸) میں حاتم احمد، ابن خزیمہ، طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایات یکجا مذکور ہیں۔

۲ صحیح بخاری کتاب مواقیات الصلوٰۃ و تفسیر سورہ ہود۔

نیکل و صورت اور ماحول (گرد و پیش) نہ اختیار کریں؟ تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے تمام تمدنی اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔ معبدوں ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، آب و لحاظ، گھنٹوں کی پر شکوہ آواز اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں۔ شاہانہ رعب و اب سے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلوسوں اور سلطان و درباروں میں فوجوں کے پرے قوی نیکل چو بدار، عصا بردار، نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بندوقیں، تخت و تاج، عمامہ و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور مہم دم دور باش اور نگاہ رو برو کی پر رعب صدائیں ضروری ہیں۔ کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لئے فضا کا سکون و خاموشی مقام کی سادگی و صفائی، شور و غوغا اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں۔ بزم عروسی کے لئے رنگ و بو، نور و سرور، گانا بجانا اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے۔

انہی طبعی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے۔ نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انابت، پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی اور خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار، نیز دل و دماغ اور نفس و روح میں پاکی صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو۔ مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچے کئے رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے۔ اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر موثر انداز میں کیوں کر پیدا ہوگا۔ یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری و ساری ہے۔ اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دو بالا کر دے گا اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے اسی اصول کے ماتحت اسکولوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی کھیل میں فریقین کی ہم رنگی و ہم لباسی فوجوں میں وردی اور حرکت و عمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہم قدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری حرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکلیف ہوں ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پر کیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے اسی لئے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آ جاتا ہے۔ نفسیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح

واضح ہے غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی و نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے۔ نماز کے آداب شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

ذکر و دعاء و تسبیح کے دو طریقے:

یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع و خشوع، ذکر الہی، حمد و ثناء، اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے۔ اسی سے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے اس کا نام عام تسبیح و تہلیل اور ذکر الہی ہے جس کے لئے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پاسکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے فرمایا

﴿فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ﴾ (نساء: ۱۵)

پس تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔

اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرام کی یہی حالت تھی خدا نے ان کی مدح فرمائی۔

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ (آل عمران: ۲۰)

جو کھڑے بیٹھے لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔

دنیاوی مشغول اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے فرمایا۔

﴿رَحَالًا لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا تَبِيعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (نساء: ۵)

ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے:

دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ ادا کی جائے اس کا نام نماز ہے۔ پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لئے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو جماعت کے ساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی دوسرے لفظوں میں ہم اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل انفرادی طریقہ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا کسی وجہ

سے پیچھے رہ گیا اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظام وحدت کا اصول:

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سرا سرار ہے۔ اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے۔ یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے۔ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ، اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراش کرنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت آئین و طریق اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادا نہیں کر سکتی تھیں۔ نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنہوں نے دعوت محمدی کو قبول کیا فرض تھی اب اُتران میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے جب چاہے جدھر منہ کر کے چاہے ادا کر لے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا ہویدا کرنا توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح و اجسام میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد صورت و شکل میں واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظام کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتی ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات:

یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے خوف میں زرد پڑ جاتا ہے خوشی میں کھل اٹھتا ہے غم میں سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل فروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں۔ اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت و ولایت اور خیر کل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کر سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و التجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔

انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کی مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں جز خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدہ نیاز ادا کریں غرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں زمین پر سر رکھ دیتے ہیں۔ نماز کے بھی یہ تین رکن ہیں چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجود)

ارکان نماز:

معلوم ہو چکا ہے کہ نماز ملت ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی۔

﴿وَطَهَّرَ بَيْتِي لِلطَّائِعِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعَ السُّجُودَ﴾ (ن-۳)

اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کھڑے ہونے والوں رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک و صاف کر۔

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان قیام رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلہ

اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا:

﴿يَمْرُؤُا فَتَنِي لِرَبِّتْ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ (م-۱۵)

مریم! اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس نماز مریمی میں بھی نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب:

جب کوئی حقیقت تین مرتبہ ارکان سے مرکب ہو اور اس میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے موخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجدہ سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

﴿وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَتُنْقِمُ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا آسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ﴾ (نساء۔ رکوع ۱۵)

جب تو ان میں ہے تو ان کے لئے نماز کھڑی کرنی تو چاہئے کہ ان میں سے ایک تروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لئے رہیں پھر جب یہ سجدہ کر لیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے پس لامحالہ رکوع قیام و سجود کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے ارکان سرگاندہ کی ترتیب یہ ہوگی کہ اول قیام پھر رکوع پھر سجود۔
تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظ کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیئے ہیں جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہر حال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام:

”پرابرہام (ابراہیم) بنو خداوند کے حضور میں کھڑا رہا“ (پیدائش ۱۸-۲۲)

رکوع:

”اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند“ (پیدائش ۱۸-۲)

سجدہ:

”اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انہوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کئے“ (خروج ۳-۲۱)

”تب ابرہام (ابراہیم) منہ کے بل گر اور خدا سے ہم کلام ہو کر بولا“ (پیدائش ۱۷-۳)

”تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا تم یہاں گدھے پاس رہو میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لئے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا“ (پیدائش ۲۲-۵)

”تب اس مرد (حضرت اسحاقؑ کا چچا) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام

کا خدا مبارک ہے“ (پیدائش ۲۳-۲۶)

”اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا“ (۲ سوال ۱۵-۳۲)
زبور میں حضرت داؤد خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں۔

”اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس بیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا“ (زبور ۵-۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے۔ موجودہ انجیل میں دعا اور نماز کا ذکر متی ۶-۵ و ۱۷-۲۱ و ۲۶-۳۶ مرقس ۱۳-۲۳ و لوقا ۲۲-۳۱ وغیرہ میں ہے طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا نیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲-۳۱) اور دوسری میں (متی ۲۶-۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔

عہد بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے کھڑے ہو کر توراۃ زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے۔ قرآن پاک کی شہادت ہے۔

﴿لَبَسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتَّبِعُونَ آيَاتَ اللَّهِ الْمَاءِ الْبَلِّ وَهُمْ يَسْتَحْذُونَ﴾ (آل عمران۔ روم ۱۲)

وہ برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں^۱۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔

اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آ رہی تھی چنانچہ انسانی کلوپینڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
”اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے“^۲

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعظیم و عمل سے اس کی ظہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا۔

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تہلیل اور ذکر الہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ پچھارکان بھی ہیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

۱۔ فتح الباری ابن حجر جلد ۲ صفحہ ۲۲۷ مصر۔

۲۔ مضمون صلوٰۃ جلد ۳ صفحہ ۹۶۔

﴿حَافِظُوا عَمَى الصَّلَوتِ وَالصَّلَاةَ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۖ فَإِنْ حَفِظْتُمْ مِنْ حَرَالِ أَوْ
رُكُوعًا فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ (بقرہ۔ ۲۳۸)

نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر
(پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ایسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اس کی تفصیل سورہ
نساء میں ہے اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا
گیا ہے۔

﴿وَإِذَا قُضِيَتْ الصَّلَاةُ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأَنَّكُمْ فَأَقِيمُوا
الصَّلَاةَ﴾ (نساء۔ ۱۵)

جس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر یاد کرو پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی
کرو۔

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ (نماز) کہا
گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اس کو
صف ذکر اللہ کہا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ
سے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الہی تسبیح و تہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان
ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد
و ثناء اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامت صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل حمد و ثناء اور قرأت کے علاوہ کچھ اور
ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر
بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورہ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب
خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔

اب ہم کو یہ دیکھنے ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے گو س کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ
آنحضرت ﷺ نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہؓ کو کس طرح کی نماز سکھائی کیوں کہ نماز کی یہ عملی کیفیت
پورے تواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے اور اسلام
کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلم ہے تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لئے قرآن پاک سے ان کا ثبوت پہنچ
دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں۔

﴿حَافِظُوا عَمَى الصَّلَوتِ وَالصَّلَاةَ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ (بقرہ۔ ۲۳۸)
نمازوں پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو۔

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى﴾ (اسی-۱)

اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔

﴿وَرُئِثٌ فَكَتَرَ﴾ (مثر-۱)

اور اپنے رب کی بڑائی کر۔

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعمیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں۔

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ﴾ (طور-۲)

اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

پھر قرآن پڑھتے ہیں۔

﴿فَاقْرَأْ وَامَّا تيسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ (زل-۲)

قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان

کرتے ہیں جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے۔

﴿قُلْ اذْعُوا لِلّٰهِ اَوْ اذْعُوا الرَّحْمٰنِ ۔ اَيُّمَا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی وَلَا تَجْهَرُ

بِصَلَاتِكَ وَلَا تُحَافِتْ بِهَا وَانْتَخِزْ مِنْ ذٰلِكَ سُبُوْلًا، وَقُلْ اِحْمَدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّهٗ

يَكُنْ لَهُ شَرِیْطٌ فِی الْمُنْبُتِ وَهٗ يَكُنْ لَّهٗ وِیْسٌ مِّنْ اٰثَرٍ وَكَثْرَةُ تَكْبِیْرٍ﴾ (اسی-۱۲)

کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں، اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھا اور نہ بہت

چپکے سچ کی راہ تلاش کرو اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ سبطت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ

درماندگی کے سب سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی بڑائی کر بڑی بڑائی۔

چونکہ اس کی یہ حمد سورہ فاتحہ میں بہ تمام و کمال مذکور ہے اس لئے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں اس کے

بعد قرآن میں جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں۔ پھر خدا کی سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع

کرتے ہیں۔

﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِیْنَ﴾ (بقہ-۵)

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

پھر اس سے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

(حج- رکوع ۱۰)

۱۔ ایمان والو! جھکو (رکوع آرد) اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو تاکہ کامیاب ہو۔
ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ﴾ (واقعہ ۲-۳)

تو اپنے بزرگ پروردگار (رب عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔

﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ (علی ۱)

اپنے بزرگ (رب علی) کی تسبیح کر۔

آنحضرت ﷺ کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے۔ ۱۔

قیام رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورہ حج (۳۲- ذکر ابراہیم) اور آل عمران (۵۵- ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے سورہ نساء (۱۵- آخر نماز خوف) سے ثابت ہے۔ درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے۔ پہلے کھڑا ہونا پھر جھک جانا پھر سجدہ میں گر پڑنا اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے۔ تعظیم کی ابتدائی اور کثیر وقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرط بے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بند ترین حصہ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم سے پست ترین حصہ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے۔

﴿وَأَسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ (علق- رکوع ۱)

اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔

گو سجدہ قربت الہی کی اخیر منزل ہے شاید اسی لئے وہ ہر رکعت میں تکرار ادا کیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے:

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے پھر جھکانے اور سرنگوں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے۔ خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے۔ دعا اور استغفار کی تعلیم ہے۔ دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے۔ رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے۔ اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے۔ اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گونا گوں جسمانی، لسانی اور روحانی عبادت کا مجموعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام رکوع، سجود و جہیل، تسبیح، تکبیر، قرأت، قرآن ذکر الہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہیں ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں۔ دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کی ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کر لے جو چاہے سجدہ کر لے جو چاہے صرف قیام کر لے جو چاہے زبان ہی سے

ذکر و قرأت پر اکتفا کر لے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرائض ابھی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انکاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی۔ نہ جماعت ہو سکتی اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جاسکتا اور نہ جماعتی رموز و شعائر کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملی تعلیم دی ہے اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے سلا بعد نسل موجودہ اور آئندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تواتر عمل کے ساتھ جن میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا:

نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جاسکتی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کو نماز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے، جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں وہ سورۃ فاتحہ ہے جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے اسی لئے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے۔ یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی۔

﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ مَلِكٌ يَوْمَ الدِّينِ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
سُتَعِينُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴾ (فاتحہ-۱)

حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے رحم والا ہے مہربان ہے ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے) (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں تو ہم کو سیدھا راستہ پر چلا ان کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں یعنی اے خدا تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان ہر نماز میں دہراتا ہے جس کے بغیر ہر نماز نامتمام اور ادھوری رہتی ہے ۱۔ یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے۔ خدا کی حمد و ستائش ہے۔ توحید ہے۔ اعلیٰ کی جزا و سزا کا یقین ہے۔ عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے۔ توفیق و ہدایت کی طلب ہے۔ اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے۔ جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت کل جہانوں کا پروردگار زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں سب سامنے آ جاتی ہیں۔ جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی

۱۔ مؤطا امام مالک صحیح بخاری کتاب الصلوۃ۔

۲۔ جامع ترمذی قرأت فاتحہ۔

وسعت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ انسان ہوں کہ حیوان چرند ہوں کہ پرند پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب مخدوم ہوں یا خادم بادشاہ ہوں یا گدا کا لے ہوں یا گورنے عرب ہوں یا مجسم کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یہاں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو رحمان و رحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت بے پایاں شفقت غیر محدود بخشش اور ناقابل بیان کیف محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے۔ روز جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے۔ ”ہم تجھی کو پوجتے ہیں“ کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں ”ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں“ بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیازمند بن جاتے ہیں۔ سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔ یہ سیدھی راہ (راہ مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں۔

﴿ قُلْ نَعَانُوْا اَنْتُمْ مَّحْرُوْمٌ لَّكُمْ عِيْذُكُمْ اِلَّا نَشْرُكَوْا بِهِ شَيْئًا وَّمَا وَلَدْنَا مِنْ حِسَابٍ وَّ لَا نَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اَمْلَاقٍ ۔ سَحْسُ بَرِّكُمْ وَاِيَاهُمْ وَلَا تَقْرُبُوْا اَنْفُسَكُمْ مَّا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنٌ وَّ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَ اَنْتُمْ حَرْمٌ اِنَّهُ اِلَّا سَاحِقٌ ۔ ذَنْكُم وَاَعْنُكُمْ تَغْفُلُوْنَ وَاَنْتُمْ تَقْرُبُوْا مَالِ اَيْتِيْمٍ اِلَّا بِالتَّيِّ هِيَ اِحْسَنُ حَتّٰى يَبْسُغَ اَشْدُّهُ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْرَانَ بِالْقِسْطِ لَا تُكْتَفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعُهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا ۔ وَكَانَ دَافِرُنِيْ وَّبَعْدَ اِنَّهُ اَوْفُوا ذَنْكُم وَاَعْنُكُمْ نَذَرَ كُرُوْنَ ۝ وَاِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۝ (۱۹) ﴾

کہہ دے (اے پیغمبر) آؤ میں تم کو پڑھ کر سنائوں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت کے سبب اپنی والد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خدا نے تمہارے تحت مایا ہے اس کو مت مارو لیکن انصاف کے ساتھ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے۔ شاید تم سمجھو اور یتیم کے مال سے پاس مت جاؤ لیکن اچھی نیت سے، یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور تاپ اور تول کو انصاف سے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے۔ جب تم بات ہو تو انصاف کی تمہارے عزیز ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پڑو اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو۔

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی کی اصطلاح میں صراط مستقیم کیا ہے یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، تاپ تول میں ایمان داری، بلا اور رعایت بچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کو صراط مستقیم کی مختصر سی ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں۔

یہی وہ صفات حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل و انعام ہوا۔ یہ خاص

بندے وہ ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے۔

﴿وَمَنْ تُصِيعِ إِلَهَهُ وَاسْتَشْوَلَ فَأَوْثَقَتْ مَعَهُ أَلْسُنُ الْعَمَمِ مَعَهُ عَذَابُهُمْ مِنَ السَّيِّئِ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءَ وَالْأَصْنَانِحِينَ . وَحَسُّوا ثَمَّتَ رَفِيقًا﴾ (۱۰۰)

اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی نبی 'صدیق' شہید اور صالح لوگ۔ ان کی رفاقت کسی اچھی ہے۔

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لئے دعا کرتا ہے وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) علی قدر مراتب چل سکے۔

سیدھے راستے سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کم) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و کرام چھین لیا جاتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں۔ دوسری کا نمونہ یہود ہیں جنہوں نے احکام الہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ الہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی یہ دعا (سورہ فاتحہ) دین ۱۰ نبی کی عبادت کی جامع، جسم و روح کی نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے۔ اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا۔

”جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں بنی ہوئی ہے۔ آدمی میرے لئے ہے اور آدمی اس کے لئے، بندہ جب ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (حمد ہو سارے جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میرے بندہ نے میری ستائش کی، پھر جب وہ ﴿إِنَّا بِكَ حَافِظُونَ﴾ (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ پھر وہ کہتا ہے ﴿مَسْأَلَتِ يَوْمَ الدِّينِ﴾ (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی۔ اتنا میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا۔“

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کا جو نقش و نگار نظر آتا ہے وہ روح میں نشا و نور اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یورپین فاضل اے جی وینسک (A.G. Wensinck) کو بھی جس نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پُر معلومات مضمون لکھا ہے

تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے۔

” (اسلام کی رو سے) نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے۔ ایک دفعہ محمدؐ نے ایک پر نقش و نگار پڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بنتی ہے۔ یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ اس میں ان خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمدؐ نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں خوشبو، اور عورت، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔ محمدؐ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جاتا ہے بعض اوقات منقول ہے۔ نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں جن میں بیان ہے کہ ”نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے“ اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ سورہ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان مٹی ہوئی ہے۔ ۱۔

اس دعا۔ عَمَّ مُحَمَّدٌ ﷺ کا موازنہ دوسرے انبیاء کی منصوص دعاؤں سے:

دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کے لئے کوئی دعا تعلیم نہ دی گئی ہو۔ وہ طور پر جلوہ ربانی کے وقت حضرت موسیٰؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے۔ زبور تو شمع سے تخریب دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے۔ مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ ”داود کی نماز“ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو تاج تک میسایوں کی نماز کا اصلی جزو ہے۔ ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیر کی غایت حسن تعبیر جامعیت پائیزگی اور اختصار کا اندازہ ہو گا اور پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مشابہت ہے جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لئے اس کا انتخاب ہوا؟ اسی نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی بن عبسؓ سے فرمایا تھا کہ نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اتری نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے۔ ۲۔ اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہو گا۔

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا:

توراۃ کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ توراۃ سینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لئے وہ طور پر چڑھے اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی ”خداوند خدا، خداوند خدائیم، و مہربانِ قہر میں، ہمیں اور رب، غیظ و عافیتِ ارپشتوں کے سے فضل رکھنے والا“ ۳۔ ”نہ اور“ ۴۔ ”تعمیر اور خط کا بننے والا“ ۵۔ ”ملین وہ جس میں معاف نہ کرے گا بلکہ باپوں کے“ ۶۔ ”نہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا“۔ (۶-۲۳)

۱۔ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔

۲۔ جامع تہذیبی انداز میں۔

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت موثر ہیں لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے۔ پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں باب اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعاء:

زبور باب ۸۶

داؤدؑ کی نماز

”اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے، اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے تالہ کرتا ہوں، اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند میں اپنے دس کو تیری طرف اٹھاتا ہوں کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے اور بخشنے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں وافر ہے۔

اے خداوند! میری دعا سن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بپت سے ان تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سنے گا، معبودوں کے درمیان اے خداوند تجھ سے کوئی نہیں اور تیری صفیں میں نہیں۔ اے خداوند! ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا آئیں گی اور تیرے آگے سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور بڑی سب کام کرتا ہے، تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا میں تیری سچائی میں چوں گا، میرے دل کو یک طرفہ کرتا کہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل سے تیری ستائش کروں گا اور بد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دلا۔

اے خدا مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے، اور کئی لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے، اور انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھ تا کہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں دیکھیں اور شرمندہ ہوں کیوں کہ تو اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔“

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبادت کا ذکر، راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے لیکن طول و کراہ اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

انجیل میں نماز کی دعا:

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں:

”اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین

پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیوں کہ با شہادت اور قدرت و جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے۔ آمین“

نام کی تقدیس ”خدا کی حمد“ ہے با شہادت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے جو دعائے قرآنی میں ﴿مَلائِکَہُ سَیِّدُہُمُ السَّمٰوٰتِ﴾ کے غلط سے ادا ہوا ہے۔ نیز استعارہ کی زبان میں روزی روٹی سے مراد دنیاوی روٹی نہ لی جائے بلکہ روح کی غذا یا صراطِ مستقیم نہ جائے اور قرض سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائیں جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں آزمائش میں نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے معنی وہی لئے جاسکتے ہیں جو اسلامی دعا کے خاتمہ میں مذکور ہے کہ یہ ان کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں۔

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبان نبوت سے ادا ہوئیں کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیل دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آ سکتی ہے۔ دعائے محمدی تمیمی شکل کی آئینہ دار ہے وہ مختصر ہے تاثر سے لبریز ہے خدا کی تمام صفات کا مد کا مرقع ہے تمام مقصد اور احکام شریعت کی جامع ہے اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے وہ اپنے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہوں۔ نیز وہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے۔ خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا (یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مالکیت اس کی تمام جہاں صفتوں کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراض مثل شہد، اچھائیوں کے نئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے، طرز بیان خدا اور بندہ کے شایان شان ہے، درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں، اوصاف الہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں۔ دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے۔ للہیت اور روحانیت کا کمال منجھائے نظر ہے اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے۔ خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے۔ یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت اور بندہ کے خشوع و خضوع، بندہ حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر اور پراثر بیان سورہ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے۔

نماز کے لئے تعیین اوقات کی ضرورت:

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایسا اور تنظیمی کارنامہ اوقات نماز کی تعیین ہے ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا اس لئے کسی کام کے کرنے کے لئے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس دین کامل و لے کر مبعوث

ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں اس نے نماز کی تعمیری تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے انسان کی نفسی (سائیکولوجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کر لے کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہیں دے سکتا اسی لئے ہر منظم باقاعدہ اور دائمی عمل ایسے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کیسے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھنٹہ بھی نذر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لئے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت نذر نہ کرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آ جاتا ہے اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے ہیں۔

اوقات نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مد نظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی راز اور شعار ہے مسلمان مختلف شہروں، ملکوں اور اقلیتوں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرہ ہوا میں لگی ہوئی دور بین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤں کے اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہے گا مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس حالت میں ایک جہد آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جہد بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت وہاں ادا ہوتا ہے۔ یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحہ ارضی تو کجا ایک محلہ ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آ سکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں:

اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعیین کی اس مصمت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمرہ خواں ہوتے ہیں، رومن کیتھولک عیسائی کو طلوع آفتاب سے پہلے پھر شام کو پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو "تفلا" کہتے ہیں دانیال نبی کی کتاب میں ہے۔

"جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہوئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف

تھا کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہن رہا تھا دعا اور شکر گزاری

(حمد) کرتا رہا۔ "پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے" (۶-۱۳۳۱۰)

حضرت داؤدؑ کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے۔

”پر میں خدا کو پکاروں گا تب خدا مجھے بچالے گا“ شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا سو وہ میری آواز سن لے گا۔“ (۵۵-۱۶-۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے۔

”پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ انکو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا ضرور ہے ایک تمثیل کہی“ (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو

یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی چنانچہ اعمال میں ہے۔

”پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا تگنے گیا۔“ (اعمال ۱۰-۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے۔

”پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ٹیکل کو چلے“ (اعمال ۳-۱)

یونانی میں تیسرے پہر کی بجائے ”نویں گھڑی کو“ لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر

اعمال ۱۰-۳ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین

وقت آدمی رات ہے۔

اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا، جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ

اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا، اس نے ان سے کہا جب تم دعا

مانگو تو کہو اس نے ان سے کہا تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدمی رات کو اس کے پاس آ کر کہے

اے دوست مجھے تین روٹی ادا کر دے۔“ (لوقا ۱۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک

جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد میں مصروف تھے (لوقا ۲۲-۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے۔ مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے ”اور بڑے تڑکے پو

پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی“ ۱۔ بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے

ہوا ہے ۲۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو امانت وقت نماز پڑھا کرتے تھے چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی

ترجمہ یہ ہے وفي الصبح باكر اقام و حرح الى موضع حلاء و كان يصلي هناك یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کر لیں تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵-۱۶-۱۷) میں صبح کا مرقس (۱-۳۵) میں عصر کا اعمال (۳-۳۱۰۱-۳۰) میں ہے اور عشاء (رات کی نماز) کا لوقا (۱۱-۲۲-۳۹) میں۔

نماز کے لئے مناسب فطری اوقات:

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا اس لیے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات مقرر کر دیئے ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے صبح کو بیدار ہوتا ہے دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستا رہتا ہے پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے یہ وفرت اور دلچسپ مشاغل میں دل بہاتا ہے شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھاپی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری جی علی الصلوٰۃ کا غمہ جاتفرانتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیات امر و زہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرائش ہو اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا ہے اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لئے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو پھر سوتے وقت جب انسان اپنی یا احساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا۔ اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہلے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں اسی صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی اسی طرح عشاء سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے یہ وقت صرف خواب راحت کے لئے موزوں ہے ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں انھیں کام کے اوقات کے شروع میں نماز بیچ گانہ مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ:

اوقات نماز کی تعیین میں اسلام نے سب سے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے دنیا کے مشرکانہ مذاہب

کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسد کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ آفتاب ہے۔ ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی جس کی روشنی قلوب انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات تھے جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے پھر جب وہ آہستہ آہستہ مہلت نیمروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے پھر شام کو جب وہ عالم کائنات سے رخصت ہو کر نقاب شب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔

سب سے پہلے موجد جس نے آفتاب پرستی گلے سے لے لی حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے ملت ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق کی عبادت ہے جس کے آستانہ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے دین محمدی ملت ابراہیمی کا دوسرا نام ہے اس لئے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملت ابراہیمی میں تھے دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردہ عدم میں روپوش ہوتا ہے دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھٹکا ہے اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں جب سر (سمت الہی) سے نیچے اترتا ہے جس کو زوال کہتے ہیں جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے اترتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں آفتاب کے ان تینوں اوقات انحطاط میں ایک نماز اور ہوتی ہے خوب اچھی طرح ادب نے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسی سے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تار یک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے۔

﴿وَقَدْ أَصْنَوْا دُلُوكَ الشَّمْسِ الَّتِي عَسَىٰ أُنْزِلَ ۖ وَفَرَاغَ الْمَخْرِقِ﴾ (نبی اسرائیل - ۹)

نماز بھڑی آفتاب کے انحطاط کے وقت رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز۔

تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر قدر نیچی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلنے وقت اس کے عروج و کمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔ ۱

اسلام میں طریق و اوقات نماز:

نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں ادا کرے اور کتنی کتنی رکعتیں کرے پڑھنی چاہئے اور اس کے کیا ادا و

۱ قرآن پاک سورہ انعام، ۱۹۔

۲ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ الاوقات التي نهي عن الصلوة فيها۔

شرائط ہیں ان سب کے لئے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے۔

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۚ هَٰذَا بِحَقِّهِ مَرَاحِلُ أَوْ رُكُوعًا ۖ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْمَلُونَ﴾ (بقرہ۔ رکوع ۳۱)

نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اللہ کے لئے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو پھر اگر دشمنوں کا خوف ہو یا تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔

اس آیت پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے جس طرح خود قرآن پاک کی اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریر اور مسلمانوں کے سلا بعد نسل متفقہ تواتر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

نمازوں کی پابندی و نگرانی:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں ان کی نگہداشت رکھیں اور ان پر مداومت کریں قرآن پاک میں نماز کی پابندی نگہداشت اور مداومت کے لیے ایک خاص لفظ ”محافظة“ کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں فرمایا:

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ﴾ (بقرہ۔ ۳۱)

نمازوں کی نگرانی رکھو۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (معارج۔ ۱)

اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (مؤمنین۔ ۱)

اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔

﴿وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (انعام۔ رکوع ۱۱)

اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ ذَائِعُونَ﴾ (معارج۔ ۱)

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو

ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں:

اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں ارشاد ہے

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى النَّاسِ كِتَابًا مَوْفُوتًا﴾ (نہ، ۵)

بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے نئے اوقات مخصوص ہیں۔

وہ اوقات کیا ہیں؟

ادائے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کیے ہیں، صلوٰۃ، یا اقامت صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ۔

پہلا لفظ اقامت صلوٰۃ نماز کے لئے مخصوص ہے لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح و تحمید اور یاد الہی کے لئے بولا جاتا ہے جس کا جزو اعظم تسبیح و تحمید ہے۔ احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں۔ ۱۔ اور اشعار عرب ۲۔ وقت عرب ۳۔ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ وقت مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے اس سے خدا کی عام یا تو صیغ مراد ہو سکتی ہے۔

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہئے۔

۱۔ ﴿قُمِ اللَّيْلَ أَقْبِلًا نَّصْمَةً أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَبِيلًا ۖ أَوْ رُذْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ (زل، ۱)

رات کو کھڑا ہاں اگر بچھڑا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھالے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر پڑھ۔

۲۔ ﴿وَتَسْبِيحٌ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ﴾ (الزمر، ۶)

اور اپنے رب کی حمد سے پہر اور صبح کو کر۔

۳۔ ﴿وَتَسْبِيحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (الزباب، ۶)

اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔

۴۔ ﴿وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (فتح، ۱)

اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔

۵۔ ﴿وَادْكُرْ رَتْلٌ فِي سَفْسِ تَصْرُعًا وَخَبْمَةً وَذُؤُنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْعُدُوِّ وَالْأَصَالِ

وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ﴾ (اعراف، ۲۴)

۱۔ صحیح مسلم باب النسخی ہارایت رسول اللہ ﷺ یسبی سبحة الصبحی فطہ، ی لا مسحہ فی صحیح مسلم باب حو۔ ۲۔ فہ

علی الداء و باب و کت اسبح فقام ال اقصى فقام سحی۔

۲۔ عشی کا شعر ہے و مسح عشی حس عشیات و صبحی و لا یحمد یسبحہ، عہ و حمد، شعر الجہلیہ ج ۳ ص ۲۶۵۔

۳۔ سان احمد سن ۳ ص ۳۰۱ ص۔

اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور پست آواز میں صبح کو اور دو پہر کو یاد کر اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔

۶۔ ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدُوَّةِ وَالْعَشِيِّ﴾ (احزاب-۶)

اے رسول! ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔

۷۔ ﴿فِي يَتُوبُ آدِنَ اللّٰهُ اَنْ تَرْفَعَ وَيُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغَدُوِّ وَالْاَصَالِ

رحال﴾ (نور-۵)

ان گھروں میں جن کو بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار اللہ سے غافل نہیں کرتا صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

۸۔ ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدُوَّةِ وَالْعَشِيِّ﴾ (ہف-۳)

اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ رو کے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔

۹۔ ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ، وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ﴾ (طور-۲)

اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر جب تو اٹھتا ہے اور رات کے پچھلے حصے میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھرتے وقت۔

۱۰۔ ﴿وَاقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرُفُقَاتِ اللَّيْلِ﴾ (ہور-۱)

اور نماز کو قائم کر دو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ گھڑوں میں۔

۱۱۔ ﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوكِ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ اِنْ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ

مَشْهُودًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (نبی اسرائیل-۹)

نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا بیشک فجر کا پڑھنا پر حضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ (تہجد)۔

۱۲۔ ﴿وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا﴾ (ہر-۲)

اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح اور سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کر۔

۱۳۔ ﴿فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ

اِمَاثِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى﴾ (طہ-۸)

کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں تاکہ تو خوش رہے۔

۱۴۔ ﴿فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ﴾ (روم-۲)

تو خدا کی تسبیح پڑھ جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں اور دو پہر کو اور جب تم دو پہر کرو۔

۱۵۔ ﴿فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ،

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ﴿۳﴾ (ق-۳)

تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھا آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھا اور ڈوبنے کے بعد۔

۱۶۔ ﴿مَنْ قُلِ صَلَوةُ الْمَجْرُوحِ حَيْثُ تَصْعُقُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الطَّهْيَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَوةِ

الْعِشَاءِ﴾ (نور-۸)

فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد۔

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں۔ مکرر اوقات کو مراد دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسل ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام 'فجر' 'ظہر' 'عصر' 'مغرب' 'عشاء' ہیں 'غدا' 'غدا' 'بکرة' فجر قبل طلوع شمس اور حین تصحیوں کے معنی صبح کی نماز، صیل، عشی اور قبل عروب شمس سے مراد عصر (د لوک الشمس) (زوال) اور حین تطہروں (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف اشہار (دن کا کنارہ) اور تمسوں (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من الی الیل (پانچ رات گزرے) عسق الیل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوة العشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں جن میں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔



اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل:

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے۔ سورہ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے یہ آیتیں ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ ۖ قُمْ الْبَلَّ إِلَّا قَبِيلًا ۖ نَصْعَةً أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَبِيلًا ۖ أَوْ رُدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلْ سُورَانَ تَرْتِيلًا ۖ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۖ إِنَّ نَاشِئَةَ الْبَلِّ هِيَ أَشَدُّ وَضًا وَأَقْوَمُ قَبِيلًا ۖ اُلْتُ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۖ﴾ (مزمل-۱)

اے کملی اوڑھ کر سونے والے تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ اور اس میں قرآن غہر غہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ (شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے، بے شبہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برما نہیں دی جاسکتی تھی، کیونکہ جہاں

﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۖ﴾ (شعرا-۱۱)

اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہوشیار کرو۔

کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے وہیں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے۔

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۖ الَّذِي يَرْكَ جِبْنَ تَقُومُ ۖ وَبَقِيتُ فِي السَّاحِدِينَ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۖ﴾ (شعراء-۱۱)

اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلان دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت ﷺ ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں معروف ہے اور کون سویا ہوا ہے جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے، ایسی پرخطر حالت میں آپ کا راتوں کو تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کو طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھللا ہوتے وقت بھی ایک ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی۔

﴿وَاضْرُ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ خَبْرًا وَمِنْ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ
وَإِذَا بَرَأَ النَّجُومَ﴾ (طور-۲)

اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، اب شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔ یہ آیت سورہ طور کے آخر میں ہے اور سورہ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی ۱۔ اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی سورہ میں اس آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے۔ سورہ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورہ طور کے بعد اتری ہے انہیں معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہتے اور بڑھتی ہے۔

﴿وَاضْرُ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطْعَمْنَاهُمْ مِنْكُمْ إِنْ عَاَوْ كَفُورًا ۖ وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۚ
وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا﴾ (دھر-۲)

تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان مخالفوں میں سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گدار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر۔ اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح اخیر دن اور ابتدائی شب مگر "نوز اصیل" ۲ میں ظہر و عصر اور مس الیل (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی کیوں کہ کل تین نمازیں تھیں ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہتے کا حکم تھا جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی تسبیح و تحمید باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہیں، حکم ہوتا ہے۔

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي ۖ السَّهَارِ ۖ وَرُفَا ۖ مِنَ اللَّيْلِ﴾ (ص-۱۰)

دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔

یہ آیت سورہ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی آنحضرت ﷺ کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے جس میں تسبیح کی بجائے باقاعدہ صلوٰۃ کی اقامت کا حکم آیا ہے اس

۱ صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبر بن مطعم

۲ اصیل ۱۔ سے آخری حصہ کہتے ہیں ۲۔ اب وقت میں نماز پڑھنا ۳۔ وقت جو عصر ۴۔ بعد ۵۔ طرف شب ۶۔ اس ۷۔ اصیل کہتے ہیں اسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں جو عصر کے لئے سورہ روم میں استعمال ہوا ہے۔

۳ طرفی سہار ۴۔ کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے قبل ۵۔ ۶۔ الشمس و قبل عروبھا ۷۔ عشی و الاصل

۸۔ بعدہ ۹۔ لا حاصل اس میں پہلا طرف فجر بکرة اور خدا ہے دوسرا طرف عصر عشی اور اصیل ہے۔

وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا﴾ (سورہ ۱۰۰)

پس تو سیدھا چلا چلا جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ جنہوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو۔

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں۔ ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں، پہلی صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی، جس کو پہلے اکیلے کہا گیا تھا اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا دوسری میں ظہر و عصر، اور تیسری میں مغرب و عشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں۔ اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں۔ سورہ ق میں جو کی سورہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۖ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ﴾

پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر۔ اور کچھ رات گئے پر (عشاء) اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے) ۱۔ سجدہ کر مٹنے کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر۔

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تحقیر کے درپے تھے۔ اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعیین کر دی گئی۔ ایک کی نسبت کہا گیا و مس الیل (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا ”و ادبار السجود“ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبت کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا۔ زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اکیلے اور پھر طر فی السہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں قبل غروب کی نماز کہا گیا ہے ہنوز تفصیل طلب ہے جس کے اندر ظہر و عصر دونوں نمازیں داخل ہیں۔ چنانچہ سورہ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی تفصیل کی

۱۔ آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے اس لئے ”و ادبار السجود“ سے ”و ادبار الشمس“ ہے۔ جیسا کہ قبل غروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے۔ آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ذوب جانا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے۔ چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا غف پہلے آچکا تھا۔ اس لئے کلامی فصاحت کا اقتضایہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ آیا جائے۔ چنانچہ اس معنی کے لئے سجود کا غف استعارۃً ”یا سجود اصل میں زمین پر بیٹھتی رہنے کو کہتے ہیں اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے اس طرز ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجود شمس کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا مہر اپنے خالق سے آگے سجدہ میں ہو تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ تفسیر دس میں حضرت علیؑ سے روایتیں ہیں کہ اس سے ”مغرب کی نماز“ حدیثیں ہیں۔

گئی ہے۔ اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکست کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لے کر آٹھویں نویں سال تک ہے۔

﴿فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ﴾ (روم: ۱۲)

اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔ تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر طہ، طور، دہر، ہودق، روم اور نور میں۔ ظہر کا بالا جمال، دہر، طہ اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں عصر کا بقرہ، دہر، ہودق، طہ اور روم میں مغرب کا بالا جمال، ہود، طہ اور روم میں اور بالتصریح طہ میں، عشاء کا بصورت صلوٰۃ اللیل منزل، طور اور دہر میں اور بصورت عشاء کا بالا جمال، طہ، ہود اور روم میں اور بالتصریح طہ اور ہود میں ہے۔ تمام نمازوں کا بالا جمال تذکرہ بقرہ، اسراء اور طہ میں ہے، طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء ہود اور طہ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مراد لیں) اور طہ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلوٰتین:

ادپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے۔ پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں یعنی دونوں کو ایک لفظ ”قبل الغروب“ یا ”اصیل“ یا ”طرف النہار“ کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے آخر آیت میں جو سورہ روم کی ہے، ظہر و عصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے مگر شام کی نماز میں اجمال ہے۔ یعنی مغرب و عشاء دونوں کو ”حسب تمسوں“ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے اس

۱۔ موطا امام مالک، مسلم ترمذی، اب القصر فی الصلوٰۃ فی السفر والحضر، بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین حدیثیں دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں۔ (ناسیکو پیڈیا آف اسلام میں فضل وینسک بوجی کی شبہ ہوا ہے) دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی ہیں بہت ضرورت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر پڑھتے تھے۔ رعتیں اتنی ہی رہتی تھیں، صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی۔ فقہاء میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جاسکتا ہے۔ احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر حج میں عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر مل جاتا ہے)

لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔

اوقات پنج گانہ اور آیت اسراء:

محدثین اور مؤرخین کا اتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنج گانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے۔ جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ گو اوقات پنج گانہ کا ذکر سورۃ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن اقامت صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسراء (معراج) میں نماز پنج گانہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنج گانہ کی تکمیل بصورت صلوٰۃ اسی معراج میں ہوئی جس طرح وضو پر عمل کو پہلے سے تھا مگر اس کا حکم قرآن میں نہ فی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے۔ سورہ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنج گانہ کا ذکر ہے حسب ذیل ہے۔

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى عَسْقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾
(اسرائیل۔ ۹)

آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت قائم کر بے شک فجر کی قرأت میں حضور ہوتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اوقات پنج گانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ دلوک ہے دلوک کے اصلی معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ دلوک الشمس یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہل عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی۔ غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھنسا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں۔ ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی ہے اس طرح ”دلوک“ کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں چوتھی نماز کا وقت غسق اللیل (رات کی تاریکی) ہے یہ عشاء کی نماز ہے اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا (پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

ادا کی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کے لئے ہے۔ بقیہ نمازوں میں خفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں بلکہ محض صورتاً دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے خفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقتاً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جاسکتی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے یہ کیا ہے۔ شیعوں میں دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

ہونا چاہئے جب آفتاب کا چہرہ نورانی تو برتو حجابات ظلمت میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی تاکہ خواب کی غفلت کی سلامتی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت قرآن الفجر (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق اکبر کا نام لے، اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں تیری ظاہر کرے، غرض اس آیت پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنج گانہ کا ثبوت ملتا ہے اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنج گانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق:

مفسرین میں سے بعض نے دلوک سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں یعنی مقابل نقطہ نگاہ سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔

﴿وَدَلَّكَ الشَّمْسُ تَدْلُكَ دَلُّو كَا عَرَبٌ وَقِيلَ اصْفَرْتُ وَمَالَتْ لِلْعُرُوبِ وَفِي التَّنْزِيلِ الْعَرَبِ اَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ اِلَى عِشْقِ الْبَلِّ وَقَدْ دَلَّكَ رَأَيْتَ عَنْ كَيْدِ السَّمَاءِ وَ قَالَ الْفَرَاءُ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي دُلُوكِ الشَّمْسِ اِنَّهُ رَوَّالُهَا الظُّهْرُ قَالَ وَرَأَيْتَ الْعَرَبَ يَذْهَبُونَ بِالْدُلُوكِ اِلَى غِيَابِ الشَّمْسِ۔

قال الشاعر:

هذا مقام قدمي رباح ذبب حتى دلكت براح

یعنی الشمس۔ قال ابو منصور وقد روينا عن ابن مسعود انه قال دلوك الشمس عروبها وروی ابن هاشم عن الا خفش انه قال دلوك الشمس من روالها الى عروبها و قال الرجاج دلوك الشمس زوالها في وقت الظهر وذاك ميلها للعروب وهو دلوكها ايضا يقال دلكت براح و براح اي قد مالت للزوال حتى كاد الناظر يحتاج اذا تبصرها ان يكسر الشعاع عن بصره براحتة، فان قيل ماعنى الدلوك في كلام العرب قيل الدلوك الروال و لذلك قيل للشمس اذالت بصف النهار دالكة و قيل لها اذا افلتت دالكة لانها في الحالتي زائنة قال الفراء في قوله راح جمع راحتته و هي الكف يقول يصع كفه على عينيه ينظر هل غربت الشمس بعد ﴿

آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب ہوا اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا اور غروب کے لئے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی وہ آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا.... اور فراء نے کہا کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ دلوک شمس کے معنی ظہر کے وقت

آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب مراد دیکھا ہے شاعر کہتا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا، ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ دلوک شمس آفتاب کا غروب ہے اور ابن ہانی نے انخس سے نقل کیا کہ دلوک شمس کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں اور یہ بھی اس کا دلوک ہے۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت سراح و سراح یعنی آفتاب زوال کے لئے جھک گیا یہاں تک کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا چاہے تو اس کرن کی شدت کو توڑنے کے لئے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے..... تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لئے آفتاب کو دالکتہ کہتے ہیں جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی اس کو دالکتہ کہتے ہیں کیوں کہ ان دونوں حالتوں میں وہ جھک جاتا ہے۔ فراء نے کہا کہ اس قول (شعریا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے یہ راحت کی جمع ہے جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں۔ شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آ جانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجب لے کہتا ہے۔

﴿وَالشَّمْسُ قَدْ كَادَتْ تَكُونُ دَلْفًا اَدْعٰهَا بِالرَّاحِ كِي تَرْحَلْفَا﴾

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دبلا ہو جائے میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے۔

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کے آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گزرا تھا یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے اور بالآخر اس کا مل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾

آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر۔

سے مراد تین نمازیں ہیں کیوں کہ تین دلوک ہوتے ہیں ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الہاس سے ہوتا ہے عصر جب اس کا دلوک سمت نظر سے ہوتا ہے، اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں اس طرح اس آیت سے جو سورہ اسراء میں واقع ہے اوقات پنج گانہ میں اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

اوقات نماز کا ایک اور راز:

اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقات پنج گانہ کی تعلیم کا ذکر ہے اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا ظہر کے بعد عصر، پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشاء، یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں اس کے بعد صبح کی نماز ہے جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فاصلہ رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اس قدر فاصلہ ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے چند گھنٹے ظہر کو صبح کا حکم ہوتا ہے پھر خاموشی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے جو صبح سے ظہر تک ہے، اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقات پنج گانہ کی ایک اور آیت:

سورہ اسراء کی آیت کی طرح سورہ طہ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقات پنج گانہ کی تفصیل ہے وہ یہ ہے ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قُلُّ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقُلُّ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ﴾ (طہ-۸)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھا آفتاب نکلنے سے پہلے، اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے، اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھا اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے ڈوبنے سے پہلے عصر ہے رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے، اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔

۱۔ تفسیر میں بھی صحیح کی روایتوں سے نہیں نمازوں کا باختم روایت مراد ہونا ضرور ہے۔ حضرت ابن مسعود، لوگ سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آفتاب مائل آفتاب مائل لیتے ہیں۔ ان طرح غسق اللیل و بعض لوگ مغرب و بعض عشاء سمجھتے ہیں اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر، اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء، اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنج گانہ کو بتاتی ہے۔

۲۔ سیرت ابن ہشام باب ابتداء فریضہ صلوٰۃ۔

اطراف النہار کی تحقیق:

یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اطراف کا لفظ جمع ہے جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح اور شام یا تین ہیں اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح دو پہر اور شام۔ پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے اور ظہر غائب ہو جاتی ہے دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آ جاتی ہے مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف کو جمع ہے مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین، دو مشرق اور دو مغرب ہے۔ دوسری جگہ انہیں کو مشارق اور مغارب کہا گیا ہے سورہ تحریم میں ہے فَفَذَّ صَعْتَ فَنُونُكُمَا (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں گے قلوب (بمعنی جمع) نہیں ہو سکتا مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے۔ اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں۔ یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں ایک صبح سے دو پہر تک، اور دوسرا دو پہر سے شام تک، اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں۔ صبح سے مراد دو پہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے اور دو پہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے لیکن چونکہ عصر کا ذکر فصل عروہا کے اندر مستقل موجود ہے اس لئے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقہ ثبوت:

اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقات پنج گانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مثلاً

۱۔ ﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوكِ الشَّمْسِ﴾ (۱۱۱-۹)

زوال آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔

یہ ظہر کی نماز ہے۔

۲۔ ﴿وَقَبْلَ الْغُرُوبِ﴾ (۱۱۱-۳)

اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو۔

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (دہر-۲)

اپنے پروردگار کا نام صبح کو اور عصر کو۔

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو۔

﴿وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى﴾ (بقرہ-۳۱)

پنج کی نماز۔

سورہ بقرہ میں اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ (ہود-۱۰)

اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر۔

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

سورہ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زمانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

﴿مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ﴾ (نور-۸)

صبح کی نماز سے پہلے۔

اس سے نماز صبح کا عملی ثبوت بھی مل پھر اسی میں اسی موقع پر ہے۔

﴿وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ﴾

اور عشاء کی نماز کے بعد۔

اس کی رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے کسی کے مکان میں بلا

اجازت اندر جانے کا حکم نہیں یہ بھی نماز عشاء کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقات نماز ہیں۔

نماز پنج گانہ احادیث و سنت میں:

تمام انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت ﷺ کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آئے اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی، اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرمادی اور خود عمل فرما کر اور اپنے تمام پیروؤں سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک و شبہ کی جزاکاٹ دی۔ اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان و آداب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرمادی اور ان میں سے ہر چیز ناقابل شک و قولی و عملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی۔ نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، اس میں کیا کیا پڑھنا چاہئے، کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہئے، کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں، ان میں سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی۔ صحابہؓ کو تلقین کی اور عمل نبوت کی پوری زندگی میں جو حکم نماز کے بعد گزری، ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں تخلف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنج وقتہ اعلان نماز کی آوازیں بلند ہوئیں اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا یہ فرض ادا ہوتا تھا۔ آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیروان محمدی جہاں بھی رہے اور جہاں بھی پہنچے اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاشبہ، سفر و حضر میں تمام عمر ادا کرتے رہے۔ کیا ایسی مستمر علی الاعلان، متواتر اور دائمی چیز میں کسی کو شک واقع ہو سکتا ہے یہ ہتمامیہ علامیہ استمرار اور یہ تاکید بلیغ اس لئے فرمائی تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبروں کا طریق عبادت بعد کے پیروؤں

کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہو گیا، خاتم الانبیاء ﷺ کی شریعت آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے کیوں کہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آ کر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروان محمدی میں آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایات متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں۔ نماز وہ فریضہ الہی ہے جس کی فرضیت خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید میں دیا، جب آنحضرت ﷺ معراج کے تقرب خاص سے ممتاز ہوئے، حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں۔ جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ارشاد ہے کہ ﴿مَنْ حَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (انعام-۲۰) یعنی جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب ملے گا اس لئے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں۔

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتہ الہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقات خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتدا اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی ۱ اور وہی آپ نے اپنے پیروؤں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔

چنانچہ آپ نے شیوع اسلام کے بعد ہر جگہ احکام شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمت اقدس میں آ کر عرض کی یا رسول اللہ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، کیا یہ سچ ہے۔ فرمایا، ہاں سچ ہے۔ عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں۔ ۲

خود آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریل اترے اور انہوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی پھر پڑھی پھر پڑھی پھر پڑھی یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو تین چار پانچ گنتے جاتے تھے ۳ ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہیں نہیں رہے گا، فرمایا تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے ۴ اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آ جائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے۔ پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس کا

۱۔ بخاری و مسلم و بوداؤد وغیرہ کتاب الصلوٰۃ و کتاب الاسراء۔

۲۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب الرکۃ قصر الاسلام ص ۱۱۔ صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص ۲۳ و ۲۵ مصر۔

۴۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم و مؤطا باب اوقات الصلوٰۃ الخمس۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوات الخمس کما رہ۔

وقت ہے۔ ۱۔

ابو برزہؓ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قرأت کرتے تھے اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے ۲۔ حضرت جابرؓ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز دو پہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے۔ ۳۔ صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی۔ مغرب میں سورہ المرسلات پڑھی اور کبھی سورہ طور پڑھی، عشاء میں اذ السماء انشقت اور التین والزیتون قرأت کی ہے اور صبح میں سورہ طور پڑھی ہے۔ ۴۔ اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے اس وقت سے آج تک تمام امتیاز محمد رسول اللہ ﷺ کا عملی توازن دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے۔ ۵۔

تہجد اب نفل ہوگئی لیکن کیوں؟

ان نماز پنج گانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی عام امت کے لئے نفل ہوگئی چنانچہ پوری آیت یہ ہے۔

﴿اِقِمِ الصَّلَاةَ بُدُّوْكَ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۚ اِنْ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝۱﴾
 وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰ اَنْ يَّسَعَّكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۱۹﴾ (اسراء: ۱۹)
 نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر عصر مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قرأت قائم کر، بے شک صبح کی قرأت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ وہ نماز پڑھ شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابل تعریف مقام میں اٹھائے۔

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جاسکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی اور حکم آیا

۱۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوات الخمس۔

۲۔ صحیح بخاری باب وقت الطہر عبدالروا۔

۳۔ صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا جمع اساس او تأخروا۔

۴۔ ایضاً باب القراءة فی الطہر و العصر و المغرب و العشاء والعصر بروایات متعدده۔

۵۔ چونکہ بعض مستشرقین نے (انس کیلویڈیا، ف، اسلام غلط صلوٰۃ) دانستہ یا نا دانستہ طور پر اوقات نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے اس لئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

سلاطین اول میں ہے۔

”جب تیرا روہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے جہاں کہیں تو انہیں بھیج دے اور خداوند کے آگے دعا مانگے اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لئے بنایا“ (۴۷-۴۳) اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے۔

اور اس زمین کی طرف جس کو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے جن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا مانگیں“ (۴۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی اس لئے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے۔

﴿وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾

اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے جدھر وہ منہ پھیرتی ہے تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہو گا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے ستارہ پرست یا ستارہ پرستی سے متاثر پرستش کے لیے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو اور سائبی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو عنصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔

ابراہیمی قوموں میں اسی قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاق اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لیے وہ ان کا قبلہ تھی دوسری مسجد کے متولی حضرت اسماعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے جنہوں نے اس کو قبلہ بنایا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں رہے خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا، لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی چنانچہ سورہ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں۔

﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ وَلِيَسْمَا تُؤْتَا فَنَّهُ وَخَهُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (بقرہ-۱۳)

اور خدا ہی کے لئے ہے پورب اور پچھتم تو جدھر رخ کروادھر ہی خدا کا منہ ہے بیشک اللہ بڑی گنجائش اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی

اسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے۔

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّيْتُمْ هَٰؤُلَاءَ عَنْ قِبَلَتِهِمْ أُنْتُمْ كَانُوا عَنِيهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝﴾ (بقرہ۔ ۱۷)

بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا، جس پر وہ تھے، کہہ دے کہ پررب اور پچھم دونوں خدا کے ہیں وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا۔

﴿لَيْسَ الْبِرُّ اَنْ تَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَاليَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّنَ . وَاَنَّى الْحَالُ عَلٰى حُبِّهِ دَوٰى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَاَنَّى السَّبِيْلَ وَالسَّابِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاَنَّى الرِّكْوَةَ وَالْمُؤَفُّوْنَ بَعْدَهُمْ اِذَا غَاظُوْا وَاَصْاٰرِيْنَ فِى النَّسَاۗءِ وَاَصْرَآءِ وَاَنَّى النَّاسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ (بقرہ۔ ۱۷۷)

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا کی امت، فرشتوں، کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر) رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں، سالکوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور یہی پرہیزگار ہیں۔

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہیں ہے لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اسی لئے اھم میں خانہ کعبہ بنانے کا حکم ہوا۔

﴿هُوَ اَوْ وَجْهَتُ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْكُمْ شَطْرَهُ ۝﴾ (بقرہ۔ ۱۷۷)

پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا، جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جاسکے اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بہ یک وقت مسلمانان عالم کا قبلہ ہیں جس سے ایک لطیف رمزیہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا کلیتہً خاتمہ ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مستحق تھیں۔

(۱)۔ یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص بہ بند سے بہ ملک میں منہ پھیر سکے اور چیز یہ تو

کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی مثلاً چراغ، کوئی موسیٰ شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب جیسا کہ اوپر گذرا بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر و کواکب ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹٹنے والا قطب تھا اور دوسری چہرہ خورشید کا مطلع اور بیاض سحر کا دیباچہ تھی۔ دین تو حید کیلئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

(۲) یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرنج سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی۔ اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کا طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے اس لئے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے متعلق وجوہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دین تو حید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

(۳) اسی لئے ملت ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا تا کہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

(۴) اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے۔

﴿اِنَّ اَوَّلَ نَبِيٍّ وُضِعَ لِنَاسٍ لِّلّٰہِیْ بِسْمِکَ مُبَارَکًا﴾ (آل عمران۔ ۱۰)

اے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لئے (خدا کا) بنا دیا ہے جو مکہ میں ہے۔

﴿وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰہِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمَاعِیْلُ﴾ (بقرہ۔ ۱۲۵)

اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کے کھمبے اٹھا رہے تھے۔

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا چنانچہ قرآن پاک میں ہے

﴿وَ اِنَّ الدِّیْنَ اَوْتُوْا الْکُتُبَ لِیَعْلَمُوْا اِنَّہٗ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّہُمْ﴾ (بقرہ۔ ۱۷۷)

اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)۔

پولوس (پال) ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے لکھتا ہے۔

کہ یہ لکھا ہے ابراہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے ایک لونڈی (ہجرہ) سے دوسرا آزاد (سارہ) سے پروردگار

لوغی سے تھا (اسماعیلؑ) جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد تھا (اخنؑ) سو وعدہ کے طور پر یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں اس لئے کہ یہ عورتیں وہ عہد ہیں ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں اور سین مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جتنی ہیں یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے (گلیوں سے نام ۲۲-۲۶ باب ۴) اس اقتباس سے یہ واضح ہو گا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں "اب کے یروشلم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کیے تھے ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں سینا پہاڑ پر آگیا اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے۔ یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا۔ سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی گویا حضور انور ﷺ کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تہذیب کشی اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورہ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر اسماعیلؑ کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت ﷺ کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتداء کا اعلان تھا جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں سلسلہ معراج

﴿سُحْرَانِ الَّذِي اسْرَىٰ بَعْدَهُ لِبَلَا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ﴾ (بنی اسرائیل-۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔
کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیل کا نشان تھا اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسماعیل سے تھا (یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے۔

﴿وَادْبَتَلَىٰ اِبْرٰهِيْمَ رُبُّهُ كَسَمَتِ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ سَنَاسَ اِمَامًا ۚ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ قَالَ لَا يَبَالُ عَهْدِی الْظَّالِمِیْنَ ۚ وَاِذْ جَعَلْنَا الْاِنْسَانَ مِثْلًا لِّنَاسٍ وَاَمَّا ۙ وَاتَّخَذُوْا مِنْ مَّقَامِ

إِبْرَاهِيمَ مُضَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهَّرَا بَنِي لِبَطْنَيْهِمُ الْعَاكِفِينَ وَالرُّكْعَ
السُّجُودِ ﴿١٥﴾ (بقرہ-۱۵)

اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیم کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا، خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم براہیم کے گھر سے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اعتکاف کرنے والوں رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

غرض یہ رمزا الہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا میں عرش الہی کا سایہ اور زمین پر خطیرۃ القدس کا عکس تھا اس لئے حکم ہوا۔

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (بقرہ-۱۸)
اور تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر۔

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فرض عبادت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیم کھڑے ہوئے تھے لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کر لے ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا۔

﴿فَإِيَّمَا تَوَلَّوْا فَنَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ (بقرہ-۴۲)

پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و معبود نہیں نہ مشرکوں بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے، اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے۔ اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ مل سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو، ادھر ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جاری ہو پڑھ سکتے ہیں۔ گھمسان کی ٹرائیوں میں بھی ایسا کیا جاسکتا ہے یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دین محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز امت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت دنیا کے قدیم موحدوں کی پہلی یادگار تھ رسول اللہ ﷺ کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبول اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے

ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے وہ مسلمان ہے اگر خیال کے پر پرواز سے اڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانوں عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سر بسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد:

ایک قیام اس کے بعد رکوع پھر سجدہ اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں صبح کو دو ظہر عصر اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں کیونکہ مصدحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا کر سکے نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بد دل بنادے ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا کیونکہ صرف چند سیکنڈ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بد دلی کا باعث ہوتی کیونکہ دیر گننے کی وجہ سے جی گھبراتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے اس لحاظ سے اس وقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا اسی لئے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی۔ جب مدینہ آ کر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں کر دی گئیں لیکن مسافر کے لئے وہی دو رکعتیں قائم رہیں کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے جو اس تخفیف کی علت تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مہاجر کے لئے چار رکعتیں ہیں مسافر کے لئے دو اور بحالت خوف ایک۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بناء پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام و سفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا اور صبح میں چھ دو رکعتیں ہیں ان میں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے ”مغرب میں تین اس لئے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لئے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کر دی گئی ہے“۔

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ گزر چکا ہے بین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا ۵ مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری براءت ظاہر کریں اسی لئے اس

۱ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فصل استقبال القبلة۔

۲ صحیح بخاری باب الحجۃ صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر و مسند ابن فضال ج ۶ ص ۲۴۱ وابن خزیمہ وابن حبان والبیہقی (فتح الباری ج ۱ ص ۳۹۳)۔

۳ صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر۔

۴ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۱۔

۵ صحیح مسلم النہی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثمۃ۔

وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رہ گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے۔ ۱۔ یہ عدد واحد تو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع و خشوع اور تضرع کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے طاق نہیں بنا بریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں نیز نماز کے خضوع و خضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا ہے اس لئے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال و انحطاط جس کو غروب کہتے ہیں اسی وقت ہوتا ہے اس لئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہیے اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿اوتروا یا اہل القرآن فان اللہ وتر يحب الوتر﴾ (ابوداؤد)

اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے۔

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام و سکون کے بعد بیدار ہوتا ہے یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے طبیعت موزوں ہوتی ہے دل مطمئن ہوتا ہے تمام عالم اس وقت سراپا اثر مجسم کیف نظر آتا ہے اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزوں ہے، اور قرآن مجید میں اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔

﴿ان قرآن الفجر کان مشہوداً﴾ (بنی - مل)

صبح کی نماز کی قراءت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی اصل کیفیت کو پیش نظر رکھا یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں مگر حکم دیا گیا کہ قراءت لمبی کر دی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں چنانچہ خود آنحضرت ﷺ اور نمازوں میں ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لے کر سو آیتوں تک قراءت کرتے تھے ۲۔ اور اسی نسبت سے رکوع و سجود بھی ہوتا تھا۔ ۳۔

رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس کو اتار پر بلا استثناء عامل بھی ہیں تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے پھر اگلا حصہ امام کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا امام کے پیچھے آ کر ایک رکعت ادا کرے اس طرح امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک ایک اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں جب نماز خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے نماز قصر کی آیات سورہ نساء کے پندرہویں رکوع میں ہیں۔

۱۔ مشاء کے بعد وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے یعنی جو رت کی نماز ہے۔

۲۔ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءۃ۔

۳۔ مسلم کتاب الصلوٰۃ باب عند انکسار النجوم و تحفہا فی تمام۔

نماز کے آداب باطنی:

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح اور ذکر الہی اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات و آداب ظاہر کرتے ہیں۔ نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں بہتر از پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گل بے رنگ اور شراب بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی۔

اقامت صلوٰۃ:

نماز پڑھنے کے لئے قرآن پاک میں جب اقامت صلوٰۃ (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب اور ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے۔ ﴿فَادْأْصْصَاٰنْتُمْ فَاَقْبِصُوا الصَّلٰوةَ﴾ پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے آداب و ارکان و شرائط کے ساتھ بجالایا جائے اس بناء پر نماز میں اطمینان ارکان کا اعتدال باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہئے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قنوت:

نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِیْنَ﴾ (بقرہ-۳۱)

اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا۔ قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے کیوں کہ نماز میں ذکر و قرأت تسبیح و استغفار سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعاء بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس میں دیر تک قیام بھی ہے، اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اس قدر نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائے گی۔

خشوع: تیسری چیز خشوع ہے چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے۔

﴿الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ حَاشِعُونَ﴾ (سومن-۱)

(وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں۔

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا۔ یعنی ہر ادا سے مسکنت عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی۔

تَجَلُّل:

تَجَلُّل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے چنانچہ سورہ مزمل میں ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمُلُ، قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا، يَصُفُّهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا، أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا، إِنَّا سُلِّقْنَاهُ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَلَاثًا، إِنْ يَأْسُفُ عَلَى هَدًى وَاسْتَدْرَكَ أَشَدُّ وَطَاءً، وَاقُومْ قِيْلًا، إِنْ لَمْ يَلْكُ فِي السَّهَارِ سَمْحًا طَوِيلًا، وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾ (مزمل-۱)

اے کھلی اور بھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات اٹھ کر نماز پڑھ! آدمی رات یا اس سے کچھ کم و بیش اور اس میں قرآن غہر غہر کر پڑھ! ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور موثر ہوتا ہے تیرے لئے دن کو بڑی فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عبسہ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوا پھر خدا کی حمد کی ثنا کی، اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا جس کا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا (وَفَرَّغْ قَلْبَهُ لِلَّهِ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو۔ یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تَضَرُّع:

تَضَرُّع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی زاری اور عجز و الحاج کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا۔

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ (اعراف-۱۷)

تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دہمی آواز سے پکارو۔

اخلاص:

نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریاء اور نمائش ہوگی اور بعض اہل حق کے نزدیک شرک لازم آئے گا، فرمایا ﴿وَأَقِمُوا وَحُوْطُكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (عراف-۳) اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

ذکر:

نماز خدا کی یاد کے لئے ہے اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی اس لئے فرمایا: ﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ (طہ-۱) میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

ظاہر ہے کہ یاد صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہم و تدبیر

نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا اسی لئے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں، فرمایا:

﴿لَا تَقْرَءُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (نساء-۷)

نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبیر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ کیوں کہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو۔^۱ دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہئے تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔^۲ حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو

۱۔ مسلم کتاب الصلوة باب امر من نغمس فی صلاتہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۳۔

۲۔ بخاری و بویہ و مسند احمد عن نس۔

جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ ۱۔

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی۔ جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا نماز سے غفلت ہے اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لی غلط نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں۔

﴿مَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۖ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهَوْنَ ۚ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ﴾ (۱۰۸-۱۰۹)

پھٹکار ہوان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے ”ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو“ نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب مثلاً وقت کالی ظ اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع و خضوع، تضرع و زاری اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہیں ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔

نماز کے گزشتہ آداب کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہدایات تعیسات اور عملی مثالیں ہیں جن میں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک شخص نے آ کر نہایت عجلت میں نماز پڑھی آپ نے فرمایا اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا اس طرح کھڑے ہو اس طرح قرأت کرو، اس طرح اطمینان و سکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو۔ ۲۔

نماز میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے اس سے انسان کی توجہ ہمتی اور حضور قلب میں ضل پڑتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھا کرو کیا تمہیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر واپس نہ آ سکے۔ ۳۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف متفت نہیں ہوتا خدا اس کی طرف متفت رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔ ۴۔ طبرانی میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو کیوں کہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو ۵۔ منہ بزار میں ہے کہ جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر

۱۔ مستدرک (ترغیب و ترہیب حافظ منذری جلد اول صفحہ ۷۳ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہئے ورنہ چاہئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں ان کے معنی ذہن نشین کر لیں اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔

۲۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم والبوداؤد کتاب الصلوٰۃ۔

۳۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۱۰ ص ۱۰۸۔

۴۔ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۷۲ والبوداؤد باب الالتفات فی الصلوٰۃ۔

۵۔ طبرانی فی الاوسط من ابی ہریرۃ بحوالہ کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۸۔

کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ دوسری دفعہ بھی خدا کی فرماتا ہے پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے۔^۱

ایک دفعہ آپ نے فرمایا سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے؟ فرمایا رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہونا۔^۲ ایک دفعہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ اے فلاں تو خدا سے نہیں ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے۔ جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے۔^۳ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا۔ کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے نماز پڑھتا ہے۔^۴ نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو۔^۵ دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوئے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے۔^۶ مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے۔^۷

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں۔ ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو اور تم باہر سے آؤ تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون اور وقار طاری ہو۔^۸ اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لی جائے۔ مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو۔^۹ اسی طرح اگر استنجایا قضاے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لی جائے تب نماز پڑھی جائے۔^{۱۰}

۱۔ کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۱۰۸۔

۲۔ مسند احمد عن قتادہ و دارمی باب من لا ینم لک رکوع، السجۃ، دو بن ابی شیبہ، و ابن خزیمہ، و ابن حبان، و عبد بن حمید، و عبد الرزاق، و طبرانی فی الاوسط اخیر لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے۔

۳۔ مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ جلد اول صفحہ ۲۳۶ (علی شرط مسلم)۔

۴۔ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الامر بتحمین الصلوٰۃ۔

۵۔ صحیح مسلم کتاب المساجد باب الھی عن البصاق فیہا و حاکم فی المستدرک و ابودود۔

۶۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ و المساجد۔

۷۔ ایضاً باب الھی عن البصاق فیہا۔

۸۔ صحیح مسلم باب استحباب اہتات الصلوٰۃ بوفار۔

۹۔ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی باب کراہۃ الصلوٰۃ بحصرۃ الطعام۔

۱۰۔ صحیح مسلم و ابوداؤد و موطائے امام مالک و ترمذی و حاکم فی الصلوٰۃ۔

آغاز اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے۔ لیکن مدینہ آ کر یہ اجازت منسوخ ہو گئی ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی آنحضرت ﷺ کو کئی دفعہ نماز میں سلام کیا اور جب آپ نے جواب نہ دیا تو نماز کے بعد انہوں نے اس کا ذکر کیا فرمایا۔ ۱۔

﴿ان فی الصلوۃ شغلاً﴾

نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے۔

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے مکروہ ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی پھر فرمایا اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اس کو ابو جہم (تاجر کا نام) کے پاس لے جاؤ اور انجانی سادہ چادر لے آؤ۔ ۲۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا آپ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یکسوئی نہ رہی آپ نے اس کو اترا دیا۔ ۳۔

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مد نظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتاً سکون میسر ہوتا ہو اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہئے تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے اس لئے توقف کا حکم دیا گیا۔ گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ یہ دو پہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے اس لئے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔

﴿فان الصلوۃ مشہودۃ محضورۃ﴾ ۴۔

کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے۔

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ کیوں کہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے۔ ۵۔ کبھی کبھی آنحضرت ﷺ پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے۔ ایک صحابی جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نماز میں ہیں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں روتے روتے ہچکیں بندھ گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا جھکی چل رہی ہے یا ہانڈی

۱۔ صحیح مسلم باب نہریم الکلام فی الصلوۃ۔

۲۔ صحیح مسلم باب کراۃ الصلوۃ فی ثوب لها اعلام۔

۳۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس۔

۴۔ صحیح مسلم باب النہی عن الاوقات الثلث۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب الایمان۔

اہل ربی ہے۔ ۱۔

رات کی نمازوں میں آنحضرت ﷺ پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے چلے جاتے۔ جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے۔ ۲۔ آپ نے فرمایا کہ نماز دو دور رکعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشهد ہے اور تضرع و زاری ہے خشوع اور خضوع ہے عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب! اے رب کہتا ہے جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔ ۳۔

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرأت کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا لوگو تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔ ۴۔

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ ہدایت فرمائیے۔ ارشاد ہوا کہ ”جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اس وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو“ ۵۔ تمہاری نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترتا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیات کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا موثر ذریعہ ہے؟ اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (انعام۔ ۱۱)

اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے:

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے

۱۔ ترمذی و ابوداؤد و ابی البکاء فی الصلوۃ۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۳۔

۳۔ ابوداؤد باب صلوۃ السہار و ترمذی باب ما جاء فی التخصیع فی الصلوۃ صفحہ ۷ مطبوعہ دہلی۔

۴۔ ابوداؤد و صلوۃ البلیل۔

۵۔ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۴۱۲ عن ابی ایوب۔

بدوی وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنادیتا ہے اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا اب اکسیر بن جاتا ہے۔

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے انسان کا شرم و حیا کی نگہداشت کے لئے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں حج کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں اور اکثر تنگی ہو کر طواف کرتی تھیں اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں آیت نازل ہوئی۔

﴿حُذُوا رِبَاسَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (۱۱۱-۱۲۰)

ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لئے کمر پائوں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ اس کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنادیا افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے دوسری طرف متمدن قومیں زیب و زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی ہیں مرد گھنٹوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے اقراء کے بعد دوسری ہی وحی میں جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا۔

﴿وَبِأَنِّ طَهَّرَ﴾ (۱۱۱-۱۲۰)

اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے اور آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات سے اس سے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی

یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آ کر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے آپ نے ان کو روکا اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ ”یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے اس قسم کی نجاستوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہے“ اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گزرے تو فرمایا کہ ”اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا“ غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا اور استنجاء بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی نا آشنا ہیں۔

نجاستوں سے اپنے بدن کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی جو صی بہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے خدا نے ان کی مدح فرمائی۔

﴿فَبِهِ رَجَالٌ يُّحِثُّونَ أَنْ يَتَّصِلُوا بِهِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهِّرِينَ﴾ (آۃ: ۱۳)

اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک و صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے؟

۳۔ نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے ایک بڑے ڈائمنڈ نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کی نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں نمازیوں کو بیچ وقت وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانٹوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں آنحضرت ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ ”اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا“۔

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے ان کے کپڑے عموماً ان کے ہوا کرتے تھے وہ محنت مزدوری کرتے تھے جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو مفتوں پہنے رکھتے تھے اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز

سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿غسل يوم الجمعة واجب على كل محتلم﴾ (بخاری کتاب النہج)

جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں فرمایا۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ (المائدہ: ۶)

اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

۴۔ پابندی وقت:

انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کا مقولہ ہے۔

﴿النسوة مکیال فمن اوفى اوفى به و من طغف فقد علمتم مالمطمعین﴾ ۱

نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس کو پورا ناپا اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جاسکتی ہے۔

۵۔ صبح خیزی:

طب اور حفظان صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہیں جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی اسی لئے آنحضرت ﷺ نے رات کو نماز عشاء کے بعد بے کار باتیں

کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے۔ تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو مؤذن کی پرتا شیر آواز

﴿ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ﴾

سونے سے نماز بہتر ہے۔

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھاوے۔

۶۔ اللہ کا خوف:

ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے تو رحمت الہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے۔

﴿ اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾ (عنکبوت۔ ۵)

بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

۷۔ ہشیاری:

نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیات الہی میں تدبر اور غور خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے اس لئے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم اور احساس کو کھودیں نماز کی حقیقت کے منافی ہیں اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا۔

﴿ لَا تَقْرَءُوا الصَّلَاةَ وَانْتُمْ سُكَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (نہ۔ ۱۰۰)

نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔

اس بناء پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دیں قطعاً پرہیز کرے گا۔

۸۔ مسلمان کا امتیازی نشان:

مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی خلافت کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جز تھا فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی

گراں نہیں ہو سکتی تھی، فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھاپی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا۔

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَى﴾ (نساء۔ ۲۱)

اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔
نیز فرمایا۔

﴿وَأَنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ (بقرہ۔ ۵)

خضوع و خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔

خصوصاً عشاء اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿لَيْسَ صَلَاةٌ أَثْقَلُ عَلَى الْمُنَافِقِينَ مِنَ الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ﴾ ۱

منافقین پر فجر و عشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس

سے بدگمان ہو جاتے تھے۔" ۲

مدینہ آ کر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی، وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے، مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدینہ میں یہود آباد تھے جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنُعْظِمَ مَنْ يَشْعُرُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبِهِ﴾

وَإِنْ كُنَّا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ﴾ (بقرہ۔ ۱۴۴)

اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا لیکن اس لئے تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان سے الگ

کر دیں جو اٹلے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ گراں ہوا لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی۔

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور

ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے۔ ۳

۹۔ باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت

۱۔ بخاری کتاب الصلوة باب فصل صلاة العشاء فی الجماعة۔

۲۔ مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین) جلد اول صفحہ ۲۱۱۔

۳۔ بخاری ۱۔ فصل استقبال القبۃ۔

تیار رہنا چاہئے اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں چنانچہ ابو داؤد میں ہے۔

﴿كَانَ السَّبِي سَيِّئًا وَجِيوشًا إِذَا عَمُوا النَّسَاءَ يَكْرُواو إِذَا هَطُوا سَحُوا فَوَضَعَتِ

الصلوة على ذلك﴾ (ابو داؤد)

آنحضرت ﷺ اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا تو تسبیح کہتا تھا نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔

صف بندی ایک افسر (امام) کی اطاعت تمام سپہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دیکھ بھری اور ایک تکبیر کی آواز پر پوری صفوں کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صف جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا عصر کے وقت لہو و لعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا رات کو سونے سے پہلے دعا و زاری کر لینا صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری میں مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساس فرض کے تقاضے کو بجا آنا ضروری سمجھیں اور اس کے لئے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا دن رات کے پر آرام سے پر آرام وقت میں ممکن تھا مگر اس کے لئے بھی دو پہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلات وقت کے اتفاقات میں اس کے لئے کس قدر مدد ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔ تمام عبادات بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے روزہ حج زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے برخلاف ان کے نمازوں میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے سجدہ رکوع قیام و قعود جہز خفاء تسبیح و تہلیل تکبیر و تشہد نے اس کے ارکان و اعمال میں تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور ہر چوبیس گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے اس طرح نفس کو رات دن تنبہ ہوا کرتا ہے۔

۱۱۔ الفت و محبت:

نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ. مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِيَهُمْ
وَكَانُوا شِيعًا﴾ (روم-۴)

خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈال
اور بہت سے جتنے ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتنی بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے کہ جب یہ
دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

۱۲۔ غمخواری:

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے جب امیر و غریب
سب ایک جگہ ہوں گے اور امراء اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی ایک دوسرے کے دکھ درد
کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

ابتداءً اسلام میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا
صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی چنانچہ اکثر صحابہ کعبور کے خوشے لے لے جا کر مسجد میں لٹکا دیتے
تھے جس پر یہ گروہ گندراوقات کرتا تھا اکثر صحابہ اور خود آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور
اپنے گھروں میں کھانا کھاتے تھے اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور
زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُعْقُونَ﴾ (آہ-۵)

اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔

۱۳۔ اجتماعیت:

اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے تمام قوموں نے اس کے لئے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہیں
جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں، کانفرنسوں، اینورسریوں اور
دوسرے جیسوں، جیسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے لیکن یہ اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے وہاں اپنے مضر اثرات
بھی ضرور پیش کرتی ہے اجتماعیت کام چاہتی ہے اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص و سرود، شراب خواری،
تہ بازی، چوری، بد نظری، بدکاری، رشک و حسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے میسے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں
عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں اور اب بھی ملتی ہیں قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور
فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف، سند ادبی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام کے سامنے کوئی
دوسری چیز پیش نہ کرتا تو محض یہ سببی علاج کافی نہ ہوتا ضرورت تھی کہ وہ اپنے قوی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرنے
جس سے قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کی بجائے نیکی کے رخ کی طرف بہنے چنانچہ

اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازیں ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور شرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیادی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت کو قرار دیا اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

۱۴۔ کاموں کا تنوع:

انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہر گئی کے باوجود تفنن اور تجمد کا طالب ہے لیکن اگر انسان کے دل و دماغ اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں تو سکون و اطمینان، عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے مفقود ہو جائے مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چھ اٹھے اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیات الہی میں شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظام عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور لحظہ انسان پر فرض ہے اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آ کر توڑ دیا پھر مشغولیت ہوئی اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا بعد ازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشاء پر جا کر ختم ہوئی اب نیند آگئی اور صبح تک بے خبری رہی اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے وہ اس روحانی "انٹروال" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کر لی۔

۱۵۔ تربیت:

انسان کی عملی کامیابی استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع کیا پھر اس پر عمر بھر قائم رہے اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیرکڑ کی مضبوطی ہے جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکڑ کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو۔ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بارے میں عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان میں استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے اس لئے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اس لئے قرآن پاک نے صبح و شام میں فرمایا۔

﴿الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾ (معارج-۱)

وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿حُبِّ الْعَمَلِ أَيْ أَنَّهُ ادْوَمَهُ وَ نَقَلَ﴾ (باب ۱۱۰۶، میرزا حسن قزوینی ص ۷۰)
محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔

۱۶۔ نظم جماعت:

کسی قوم کی زندگی اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گروہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملنا، اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضاف من، مشارکت، میل جول اور باہمی بہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ: ”جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔“ ۱

۱۷۔ مساوات:

یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے، یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی جہشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لئے حسب و نسب، نسل و خاندان، رنگ روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ و گدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں، اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا، اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

۱۸۔ اطاعت:

جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعہ امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے، جس کی اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لئے بانگ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

اطاعت امام کے لئے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے، جس کی تعلیم مقتدیوں کو

نماز میں ہوتی ہے دوسری طرف امام کو اخلاق صاۃ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے وہ ایک دائمی حرکت ہے جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گزاری کے لئے تیار رکھتی ہے اس کے ساتھ نماز پنج گانہ اور جمعہ و عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے عمل کے اقتساب اس پر نکتہ چینی اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش و عشرت میں مصروف ہو نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینی کیں احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں آمد وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

۱۹۔ معیار فضیلت:

نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرء) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آنے اور یافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کسمن ہیں انہیں قرآن زیادہ یاد ہے چنانچہ آپ نے اسی کم سن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔

۲۰۔ روزانہ کی مجلس عمومی:

آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنائی ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی اجتماعی سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل و سستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی لطم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر

نظر ہوتی تھی ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارہ تھا وہی دارالشوریٰ تھا وہی بیت المال تھا وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا وہی درس گاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و پیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلاف باہمی کو تہہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سر لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا جہد کر لینا ضروری ہے اسلام کی نماز انہیں رموز و اسرار کا گنجینہ ہے یہ مسلمانوں کا نظم و جماعت اطاعت پذیری و فرمانبرداری اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے اسی لئے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے نہ اقتیاد امامت ہے نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے اسی بناء پر داعی اسلام نے یہ فرما دیا۔

﴿العهد الذی بیسوا و بسہم اصلوۃ فمن تر کھا فقد کفر﴾ (حدیث ترمذی نسائی ابن ماجہ)

ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز ہے تو جس نے اس کو چھوڑا اس نے کفر کا کام کیا۔

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان شراب بے نشہ اور گل بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

عرب کی روحانی کاپیٹلٹ:

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تہمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا وہ جس کی روح ربانی تسکین و تسلی کے احساس سے خالی تھی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعظیم سے دفعتاً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الہی اس کے ہر کام کا مقصد بن گئی۔ اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔ اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی۔ اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں۔ اس کی روح یاد الہی کی تڑپ اور ذکر الہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

تاہوئے از نسیم میس در مشام رفت

دل را کہ مردہ بود حیاتے ز نور سید

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ

﴿وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (نساء۔ ۲۱)

اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

دعوت حق اور فیض نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو

ذکر الہی سے غافل نہ کر سکیں۔

﴿رَحَالٌ لَا تُنْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (۵-۲)

ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔

انھتے بیٹھتے چتے پھرتے غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بے قراری تھی۔

﴿وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ (۱۱-۲۰)

جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہیں۔

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے نثار میں ہوتی وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سر بسجود اور راز و نیاز میں

مصروف ہوتے تھے۔

﴿تَتَحَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ (۲-۳۰)

جن کے پہلو (رات کو) خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَزُكُّوْنَ﴾ (مرسلات-۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ

﴿نَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَسْتَغْنُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾ (ن-۴)

تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ

﴿وَإِذَا ذُكِّرَ اللَّهُ وَخُدَّةُ اشْمَارُتْ قُنُوتِ اُنْدِيں لَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا حَرَةً﴾ (۵-۲)

اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے مکر ہو جاتے ہیں۔

آفتاب نبوت کے پر تو نے ان مکر آیتوں میں خشیست الہی کا جو ہر پیدا کر دیا۔

﴿اُنْدِيں اِدَا ذِكْرَ اللَّهِ وَجَلَّتْ قُنُوتُهُمْ﴾ (ن-۱۱-۵)

وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دمل جاتے ہیں۔

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی

روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو حقہ جوش اسلام ہو چکے تھے خواہ وہ کھیتی کرتے

ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی قنوت کہتے ہیں کہ یہ لوگ

(ص ۱۰) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یاد الہی سے

غافل نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے۔ ۱۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی

تکبیر ہوئی دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکائیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ ۱۔

صحابہؓ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی۔

﴿إِنَّ رُتْبَ بَعْدُكُمْ أَنْتُمْ نَفُومٌ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلَاثِي أَثِيلٍ وَبُضْعَةٌ وَثُلَاثَةٌ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الْأَدْنَىٰ مَعَكَ﴾ (مزل-۲)

بے شک تیرا رتبہ جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور تہائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

اس زمانہ میں صحابہؓ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا۔ صبح و دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو نہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے۔ ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے۔ دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے۔ قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے۔

﴿وَنَوَكُلُ عَنَى الْعَرَبِ الرَّحِيمِ أَلَدَىٰ بَرَكٌ حِينَ تَقُومُ، وَتَقْلُتُ فِي الشَّجَدِ﴾ (شعر-۱۱)

اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔

مدینہ منورہ میں آ کر سب سے پہلا فقرہ جو آپؐ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اصْعَمُوا الطَّعَامَ وَاشْكُوا السَّلَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ بِيَامٍ﴾ (ترمذی)

اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو پھیلاد اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں۔

بعض صحابہؓ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا۔ آخر آنحضرت ﷺ کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ”عثمان تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی“ ۲۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ ۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا۔ ۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی۔ ۵۔ حضرت ابو درداءؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں

۱۔ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۵۳ بحوالہ عبد الرزاق۔

۲۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴۰۰۔ ۱۴۰۱۔ ۱۴۰۲۔ ۱۴۰۳۔ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۔ ۱۴۰۶۔ ۱۴۰۷۔ ۱۴۰۸۔ ۱۴۰۹۔ ۱۴۱۰۔ ۱۴۱۱۔ ۱۴۱۲۔ ۱۴۱۳۔ ۱۴۱۴۔ ۱۴۱۵۔ ۱۴۱۶۔ ۱۴۱۷۔ ۱۴۱۸۔ ۱۴۱۹۔ ۱۴۲۰۔ ۱۴۲۱۔ ۱۴۲۲۔ ۱۴۲۳۔ ۱۴۲۴۔ ۱۴۲۵۔ ۱۴۲۶۔ ۱۴۲۷۔ ۱۴۲۸۔ ۱۴۲۹۔ ۱۴۳۰۔ ۱۴۳۱۔ ۱۴۳۲۔ ۱۴۳۳۔ ۱۴۳۴۔ ۱۴۳۵۔ ۱۴۳۶۔ ۱۴۳۷۔ ۱۴۳۸۔ ۱۴۳۹۔ ۱۴۴۰۔ ۱۴۴۱۔ ۱۴۴۲۔ ۱۴۴۳۔ ۱۴۴۴۔ ۱۴۴۵۔ ۱۴۴۶۔ ۱۴۴۷۔ ۱۴۴۸۔ ۱۴۴۹۔ ۱۴۵۰۔ ۱۴۵۱۔ ۱۴۵۲۔ ۱۴۵۳۔ ۱۴۵۴۔ ۱۴۵۵۔ ۱۴۵۶۔ ۱۴۵۷۔ ۱۴۵۸۔ ۱۴۵۹۔ ۱۴۶۰۔ ۱۴۶۱۔ ۱۴۶۲۔ ۱۴۶۳۔ ۱۴۶۴۔ ۱۴۶۵۔ ۱۴۶۶۔ ۱۴۶۷۔ ۱۴۶۸۔ ۱۴۶۹۔ ۱۴۷۰۔ ۱۴۷۱۔ ۱۴۷۲۔ ۱۴۷۳۔ ۱۴۷۴۔ ۱۴۷۵۔ ۱۴۷۶۔ ۱۴۷۷۔ ۱۴۷۸۔ ۱۴۷۹۔ ۱۴۸۰۔ ۱۴۸۱۔ ۱۴۸۲۔ ۱۴۸۳۔ ۱۴۸۴۔ ۱۴۸۵۔ ۱۴۸۶۔ ۱۴۸۷۔ ۱۴۸۸۔ ۱۴۸۹۔ ۱۴۹۰۔ ۱۴۹۱۔ ۱۴۹۲۔ ۱۴۹۳۔ ۱۴۹۴۔ ۱۴۹۵۔ ۱۴۹۶۔ ۱۴۹۷۔ ۱۴۹۸۔ ۱۴۹۹۔ ۱۵۰۰۔ ۱۵۰۱۔ ۱۵۰۲۔ ۱۵۰۳۔ ۱۵۰۴۔ ۱۵۰۵۔ ۱۵۰۶۔ ۱۵۰۷۔ ۱۵۰۸۔ ۱۵۰۹۔ ۱۵۱۰۔ ۱۵۱۱۔ ۱۵۱۲۔ ۱۵۱۳۔ ۱۵۱۴۔ ۱۵۱۵۔ ۱۵۱۶۔ ۱۵۱۷۔ ۱۵۱۸۔ ۱۵۱۹۔ ۱۵۲۰۔ ۱۵۲۱۔ ۱۵۲۲۔ ۱۵۲۳۔ ۱۵۲۴۔ ۱۵۲۵۔ ۱۵۲۶۔ ۱۵۲۷۔ ۱۵۲۸۔ ۱۵۲۹۔ ۱۵۳۰۔ ۱۵۳۱۔ ۱۵۳۲۔ ۱۵۳۳۔ ۱۵۳۴۔ ۱۵۳۵۔ ۱۵۳۶۔ ۱۵۳۷۔ ۱۵۳۸۔ ۱۵۳۹۔ ۱۵۴۰۔ ۱۵۴۱۔ ۱۵۴۲۔ ۱۵۴۳۔ ۱۵۴۴۔ ۱۵۴۵۔ ۱۵۴۶۔ ۱۵۴۷۔ ۱۵۴۸۔ ۱۵۴۹۔ ۱۵۵۰۔ ۱۵۵۱۔ ۱۵۵۲۔ ۱۵۵۳۔ ۱۵۵۴۔ ۱۵۵۵۔ ۱۵۵۶۔ ۱۵۵۷۔ ۱۵۵۸۔ ۱۵۵۹۔ ۱۵۶۰۔ ۱۵۶۱۔ ۱۵۶۲۔ ۱۵۶۳۔ ۱۵۶۴۔ ۱۵۶۵۔ ۱۵۶۶۔ ۱۵۶۷۔ ۱۵۶۸۔ ۱۵۶۹۔ ۱۵۷۰۔ ۱۵۷۱۔ ۱۵۷۲۔ ۱۵۷۳۔ ۱۵۷۴۔ ۱۵۷۵۔ ۱۵۷۶۔ ۱۵۷۷۔ ۱۵۷۸۔ ۱۵۷۹۔ ۱۵۸۰۔ ۱۵۸۱۔ ۱۵۸۲۔ ۱۵۸۳۔ ۱۵۸۴۔ ۱۵۸۵۔ ۱۵۸۶۔ ۱۵۸۷۔ ۱۵۸۸۔ ۱۵۸۹۔ ۱۵۹۰۔ ۱۵۹۱۔ ۱۵۹۲۔ ۱۵۹۳۔ ۱۵۹۴۔ ۱۵۹۵۔ ۱۵۹۶۔ ۱۵۹۷۔ ۱۵۹۸۔ ۱۵۹۹۔ ۱۶۰۰۔ ۱۶۰۱۔ ۱۶۰۲۔ ۱۶۰۳۔ ۱۶۰۴۔ ۱۶۰۵۔ ۱۶۰۶۔ ۱۶۰۷۔ ۱۶۰۸۔ ۱۶۰۹۔ ۱۶۱۰۔ ۱۶۱۱۔ ۱۶۱۲۔ ۱۶۱۳۔ ۱۶۱۴۔ ۱۶۱۵۔ ۱۶۱۶۔ ۱۶۱۷۔ ۱۶۱۸۔ ۱۶۱۹۔ ۱۶۲۰۔ ۱۶۲۱۔ ۱۶۲۲۔ ۱۶۲۳۔ ۱۶۲۴۔ ۱۶۲۵۔ ۱۶۲۶۔ ۱۶۲۷۔ ۱۶۲۸۔ ۱۶۲۹۔ ۱۶۳۰۔ ۱۶۳۱۔ ۱۶۳۲۔ ۱۶۳۳۔ ۱۶۳۴۔ ۱۶۳۵۔ ۱۶۳۶۔ ۱۶۳۷۔ ۱۶۳۸۔ ۱۶۳۹۔ ۱۶۴۰۔ ۱۶۴۱۔ ۱۶۴۲۔ ۱۶۴۳۔ ۱۶۴۴۔ ۱۶۴۵۔ ۱۶۴۶۔ ۱۶۴۷۔ ۱۶۴۸۔ ۱۶۴۹۔ ۱۶۵۰۔ ۱۶۵۱۔ ۱۶۵۲۔ ۱۶۵۳۔ ۱۶۵۴۔ ۱۶۵۵۔ ۱۶۵۶۔ ۱۶۵۷۔ ۱۶۵۸۔ ۱۶۵۹۔ ۱۶۶۰۔ ۱۶۶۱۔ ۱۶۶۲۔ ۱۶۶۳۔ ۱۶۶۴۔ ۱۶۶۵۔ ۱۶۶۶۔ ۱۶۶۷۔ ۱۶۶۸۔ ۱۶۶۹۔ ۱۶۷۰۔ ۱۶۷۱۔ ۱۶۷۲۔ ۱۶۷۳۔ ۱۶۷۴۔ ۱۶۷۵۔ ۱۶۷۶۔ ۱۶۷۷۔ ۱۶۷۸۔ ۱۶۷۹۔ ۱۶۸۰۔ ۱۶۸۱۔ ۱۶۸۲۔ ۱۶۸۳۔ ۱۶۸۴۔ ۱۶۸۵۔ ۱۶۸۶۔ ۱۶۸۷۔ ۱۶۸۸۔ ۱۶۸۹۔ ۱۶۹۰۔ ۱۶۹۱۔ ۱۶۹۲۔ ۱۶۹۳۔ ۱۶۹۴۔ ۱۶۹۵۔ ۱۶۹۶۔ ۱۶۹۷۔ ۱۶۹۸۔ ۱۶۹۹۔ ۱۷۰۰۔ ۱۷۰۱۔ ۱۷۰۲۔ ۱۷۰۳۔ ۱۷۰۴۔ ۱۷۰۵۔ ۱۷۰۶۔ ۱۷۰۷۔ ۱۷۰۸۔ ۱۷۰۹۔ ۱۷۱۰۔ ۱۷۱۱۔ ۱۷۱۲۔ ۱۷۱۳۔ ۱۷۱۴۔ ۱۷۱۵۔ ۱۷۱۶۔ ۱۷۱۷۔ ۱۷۱۸۔ ۱۷۱۹۔ ۱۷۲۰۔ ۱۷۲۱۔ ۱۷۲۲۔ ۱۷۲۳۔ ۱۷۲۴۔ ۱۷۲۵۔ ۱۷۲۶۔ ۱۷۲۷۔ ۱۷۲۸۔ ۱۷۲۹۔ ۱۷۳۰۔ ۱۷۳۱۔ ۱۷۳۲۔ ۱۷۳۳۔ ۱۷۳۴۔ ۱۷۳۵۔ ۱۷۳۶۔ ۱۷۳۷۔ ۱۷۳۸۔ ۱۷۳۹۔ ۱۷۴۰۔ ۱۷۴۱۔ ۱۷۴۲۔ ۱۷۴۳۔ ۱۷۴۴۔ ۱۷۴۵۔ ۱۷۴۶۔ ۱۷۴۷۔ ۱۷۴۸۔ ۱۷۴۹۔ ۱۷۵۰۔ ۱۷۵۱۔ ۱۷۵۲۔ ۱۷۵۳۔ ۱۷۵۴۔ ۱۷۵۵۔ ۱۷۵۶۔ ۱۷۵۷۔ ۱۷۵۸۔ ۱۷۵۹۔ ۱۷۶۰۔ ۱۷۶۱۔ ۱۷۶۲۔ ۱۷۶۳۔ ۱۷۶۴۔ ۱۷۶۵۔ ۱۷۶۶۔ ۱۷۶۷۔ ۱۷۶۸۔ ۱۷۶۹۔ ۱۷۷۰۔ ۱۷۷۱۔ ۱۷۷۲۔ ۱۷۷۳۔ ۱۷۷۴۔ ۱۷۷۵۔ ۱۷۷۶۔ ۱۷۷۷۔ ۱۷۷۸۔ ۱۷۷۹۔ ۱۷۸۰۔ ۱۷۸۱۔ ۱۷۸۲۔ ۱۷۸۳۔ ۱۷۸۴۔ ۱۷۸۵۔ ۱۷۸۶۔ ۱۷۸۷۔ ۱۷۸۸۔ ۱۷۸۹۔ ۱۷۹۰۔ ۱۷۹۱۔ ۱۷۹۲۔ ۱۷۹۳۔ ۱۷۹۴۔ ۱۷۹۵۔ ۱۷۹۶۔ ۱۷۹۷۔ ۱۷۹۸۔ ۱۷۹۹۔ ۱۸۰۰۔ ۱۸۰۱۔ ۱۸۰۲۔ ۱۸۰۳۔ ۱۸۰۴۔ ۱۸۰۵۔ ۱۸۰۶۔ ۱۸۰۷۔ ۱۸۰۸۔ ۱۸۰۹۔ ۱۸۱۰۔ ۱۸۱۱۔ ۱۸۱۲۔ ۱۸۱۳۔ ۱۸۱۴۔ ۱۸۱۵۔ ۱۸۱۶۔ ۱۸۱۷۔ ۱۸۱۸۔ ۱۸۱۹۔ ۱۸۲۰۔ ۱۸۲۱۔ ۱۸۲۲۔ ۱۸۲۳۔ ۱۸۲۴۔ ۱۸۲۵۔ ۱۸۲۶۔ ۱۸۲۷۔ ۱۸۲۸۔ ۱۸۲۹۔ ۱۸۳۰۔ ۱۸۳۱۔ ۱۸۳۲۔ ۱۸۳۳۔ ۱۸۳۴۔ ۱۸۳۵۔ ۱۸۳۶۔ ۱۸۳۷۔ ۱۸۳۸۔ ۱۸۳۹۔ ۱۸۴۰۔ ۱۸۴۱۔ ۱۸۴۲۔ ۱۸۴۳۔ ۱۸۴۴۔ ۱۸۴۵۔ ۱۸۴۶۔ ۱۸۴۷۔ ۱۸۴۸۔ ۱۸۴۹۔ ۱۸۵۰۔ ۱۸۵۱۔ ۱۸۵۲۔ ۱۸۵۳۔ ۱۸۵۴۔ ۱۸۵۵۔ ۱۸۵۶۔ ۱۸۵۷۔ ۱۸۵۸۔ ۱۸۵۹۔ ۱۸۶۰۔ ۱۸۶۱۔ ۱۸۶۲۔ ۱۸۶۳۔ ۱۸۶۴۔ ۱۸۶۵۔ ۱۸۶۶۔ ۱۸۶۷۔ ۱۸۶۸۔ ۱۸۶۹۔ ۱۸۷۰۔ ۱۸۷۱۔ ۱۸۷۲۔ ۱۸۷۳۔ ۱۸۷۴۔ ۱۸۷۵۔ ۱۸۷۶۔ ۱۸۷۷۔ ۱۸۷۸۔ ۱۸۷۹۔ ۱۸۸۰۔ ۱۸۸۱۔ ۱۸۸۲۔ ۱۸۸۳۔ ۱۸۸۴۔ ۱۸۸۵۔ ۱۸۸۶۔ ۱۸۸۷۔ ۱۸۸۸۔ ۱۸۸۹۔ ۱۸۹۰۔ ۱۸۹۱۔ ۱۸۹۲۔ ۱۸۹۳۔ ۱۸۹۴۔ ۱۸۹۵۔ ۱۸۹۶۔ ۱۸۹۷۔ ۱۸۹۸۔ ۱۸۹۹۔ ۱۹۰۰۔ ۱۹۰۱۔ ۱۹۰۲۔ ۱۹۰۳۔ ۱۹۰۴۔ ۱۹۰۵۔ ۱۹۰۶۔ ۱۹۰۷۔ ۱۹۰۸۔ ۱۹۰۹۔ ۱۹۱۰۔ ۱۹۱۱۔ ۱۹۱۲۔ ۱۹۱۳۔ ۱۹۱۴۔ ۱۹۱۵۔ ۱۹۱۶۔ ۱۹۱۷۔ ۱۹۱۸۔ ۱۹۱۹۔ ۱۹۲۰۔ ۱۹۲۱۔ ۱۹۲۲۔ ۱۹۲۳۔ ۱۹۲۴۔ ۱۹۲۵۔ ۱۹۲۶۔ ۱۹۲۷۔ ۱۹۲۸۔ ۱۹۲۹۔ ۱۹۳۰۔ ۱۹۳۱۔ ۱۹۳۲۔ ۱۹۳۳۔ ۱۹۳۴۔ ۱۹۳۵۔ ۱۹۳۶۔ ۱۹۳۷۔ ۱۹۳۸۔ ۱۹۳۹۔ ۱۹۴۰۔ ۱۹۴۱۔ ۱۹۴۲۔ ۱۹۴۳۔ ۱۹۴۴۔ ۱۹۴۵۔ ۱۹۴۶۔ ۱۹۴۷۔ ۱۹۴۸۔ ۱۹۴۹۔ ۱۹۵۰۔ ۱۹۵۱۔ ۱۹۵۲۔ ۱۹۵۳۔ ۱۹۵۴۔ ۱۹۵۵۔ ۱۹۵۶۔ ۱۹۵۷۔ ۱۹۵۸۔ ۱۹۵۹۔ ۱۹۶۰۔ ۱۹۶۱۔ ۱۹۶۲۔ ۱۹۶۳۔ ۱۹۶۴۔ ۱۹۶۵۔ ۱۹۶۶۔ ۱۹۶۷۔ ۱۹۶۸۔ ۱۹۶۹۔ ۱۹۷۰۔ ۱۹۷۱۔ ۱۹۷۲۔ ۱۹۷۳۔ ۱۹۷۴۔ ۱۹۷۵۔ ۱۹۷۶۔ ۱۹۷۷۔ ۱۹۷۸۔ ۱۹۷۹۔ ۱۹۸۰۔ ۱۹۸۱۔ ۱۹۸۲۔ ۱۹۸۳۔ ۱۹۸۴۔ ۱۹۸۵۔ ۱۹۸۶۔ ۱۹۸۷۔ ۱۹۸۸۔ ۱۹۸۹۔ ۱۹۹۰۔ ۱۹۹۱۔ ۱۹۹۲۔ ۱۹۹۳۔ ۱۹۹۴۔ ۱۹۹۵۔ ۱۹۹۶۔ ۱۹۹۷۔ ۱۹۹۸۔ ۱۹۹۹۔ ۲۰۰۰۔ ۲۰۰۱۔ ۲۰۰۲۔ ۲۰۰۳۔ ۲۰۰۴۔ ۲۰۰۵۔ ۲۰۰۶۔ ۲۰۰۷۔ ۲۰۰۸۔ ۲۰۰۹۔ ۲۰۱۰۔ ۲۰۱۱۔ ۲۰۱۲۔ ۲۰۱۳۔ ۲۰۱۴۔ ۲۰۱۵۔ ۲۰۱۶۔ ۲۰۱۷۔ ۲۰۱۸۔ ۲۰۱۹۔ ۲۰۲۰۔ ۲۰۲۱۔ ۲۰۲۲۔ ۲۰۲۳۔ ۲۰۲۴۔ ۲۰۲۵۔ ۲۰۲۶۔ ۲۰۲۷۔ ۲۰۲۸۔ ۲۰۲۹۔ ۲۰۳۰۔ ۲۰۳۱۔ ۲۰۳۲۔ ۲۰۳۳۔ ۲۰۳۴۔ ۲۰۳۵۔ ۲۰۳۶۔ ۲۰۳۷۔ ۲۰۳۸۔ ۲۰۳۹۔ ۲۰۴۰۔ ۲۰۴۱۔ ۲۰۴۲۔ ۲۰۴۳۔ ۲۰۴۴۔ ۲۰۴۵۔ ۲۰۴۶۔ ۲۰۴۷۔ ۲۰۴۸۔ ۲۰۴۹۔ ۲۰۵۰۔ ۲۰۵۱۔ ۲۰۵۲۔ ۲۰۵۳۔ ۲۰۵۴۔ ۲۰۵۵۔ ۲۰۵۶۔ ۲۰۵۷۔ ۲۰۵۸۔ ۲۰۵۹۔ ۲۰۶۰۔ ۲۰۶۱۔ ۲۰۶۲۔ ۲۰۶۳۔ ۲۰۶۴۔ ۲۰۶۵۔ ۲۰۶۶۔ ۲۰۶۷۔ ۲۰۶۸۔ ۲۰۶۹۔ ۲۰۷۰۔ ۲۰۷۱۔ ۲۰۷۲۔ ۲۰۷۳۔ ۲۰۷۴۔ ۲۰۷۵۔ ۲۰۷۶۔ ۲۰۷۷۔ ۲۰۷۸۔ ۲۰۷۹۔ ۲۰۸۰۔ ۲۰۸۱۔ ۲۰۸۲۔ ۲۰۸۳۔ ۲۰۸۴۔ ۲۰۸۵۔ ۲۰۸۶۔ ۲۰۸۷۔ ۲۰۸۸۔ ۲۰۸۹۔ ۲۰۹۰۔ ۲۰۹۱۔ ۲۰۹۲۔ ۲۰۹۳۔ ۲۰۹۴۔ ۲۰۹۵۔ ۲۰۹۶۔ ۲۰۹۷۔ ۲۰۹۸۔ ۲۰۹۹۔ ۲۱

گزار دیتے تھے۔ حضرت سہمان فارسیؓ ان کے اسلامی بھائی تھے ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر مہمان ہوئے۔ جب رات کو حضرت ابوذرؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سہمانؓ نے منع کیا۔ پچھلے پہر جب سنا چھایا ہوا تھا حضرت سہمانؓ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔ ۱۔ کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عداقت کی ہو یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے۔ ایک صحابی کو آنحضرت ﷺ نے ایک پرخطر کام کے لئے کہیں بھیجا تھا۔ جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے۔ ۲۔ سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ ۳۔ پھر وہ جس خضوع و خشوع محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے اس کا نظارہ بڑا پراثر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا۔ ۴۔ حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی۔ ۵۔ حضرت تمیم داریؓ ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی۔ بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ ۶۔

ع شب شود صبح وہاں کو تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔ ۷۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جا ملے سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ۸۔

ایک رات میدان جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں۔ ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا

۱۔ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

۲۔ ۱۰۱۶۔ سنن ابی داؤد۔

۳۔ سنن ابی داؤد۔ ۱۰۱۶۔ سنن ابی داؤد۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب ادب الایمان فی الصلوٰۃ۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب الصلوٰۃ باب المسجد یکون فی الطریق۔

۶۔ اسد اللہ پتہ ۱۰۱۶۔ حضرت تمیم داری۔

۷۔ صحیح بخاری باب المکتب بین المسجدین۔

۸۔ حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصحابہ و اسد الغابہ وغیرہ۔

پنہ سے خون سے تریہ ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے۔ نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں۔ ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ بگایا۔ جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دوں۔ ۱۔

اس سے بھی زیادہ پڑا اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں تیرہوں کا مینہ برس رہا ہے میزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں، سر و گردن دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آ جاتا ہے فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا تزکا ہے اسلام کے دائرہ کا مرکز فروق اعظم امام نماز ہے۔ پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتاً ایک شعلہ خنجر بلف آگے بڑھتا ہے اور خیفہ پر حمد آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے۔ آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے یہ سب چھہ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں۔ پہلے صبح کا دو گانہ ادا ہو رہا ہے تب خیفہ وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔ ۲۔

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو وگوں نے ان کو نماز کے لئے بگایا تو بولے ہاں جو شخص نماز پھوڑا۔ اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا آپ نے نماز پڑھی۔ ۳۔

حضرت علی مرتضیٰ صبح کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں ۴۔ کہ ابن ماجہ کی تواران کوٹھل روایتی ہے اور چھ ایر کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی ناشیں میدان میں جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں بناروں اشقیاء آپ کو زخم میں سے ہوتے ہیں اتنے میں ظہر کا وقت آ جاتا ہے۔ آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔ ۵۔

نماز میں جس خضوع اور خشوع کا حکم ہے صحابہ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اُتران کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا۔ حضرت ابو طلحہؓ انصاری اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آ کر چھبھانا شروع کیا۔ حضرت ابو طلحہؓ دیر تک ادھر ادھر، بھٹکتے رہے پھر جب نماز کا خیاں آیا تو رکعت یاد نہ رہی۔ ۶۔ میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا۔ یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ نے

۱۔ ابو داؤد کتاب الطہارۃ ص ۱۰۷

۲۔ ابن ماجہ، قدس سرہ نماز

۳۔ موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیہ علی علیہ السلام

۴۔ الریاض النضرۃ للعلب الطبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۶ مصر۔

۵۔ تاریخ طبری بصرہ ص ۳۲۷ ج ۱ واقعات ۶۱ھ۔

خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے۔

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسبز شاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی۔ جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا دور تھا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا راہ خدا میں دیتا ہوں چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔



زکوٰۃ

﴿وَاتُوا الزَّكَاةَ﴾

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم:

نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچتا ہے۔ زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے جس کا اطلاق تقسیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن فقہی اصطلاح میں ”زکوٰۃ“ صرف اس مال ادا کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گزشتہ مذاہب میں:

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو ریفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں۔

﴿أَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ (بقرہ-۱۱۰)

(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ۔

﴿لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ﴾ (مائدہ-۳)

(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔

حضرت اسماعیلؑ کے ذکر میں ہے۔

﴿وَإِذْ كَرَّمْنَا النُّجُبَ لِسَمْعِيلَ إِذْ كَانَ صَادِقَ لُغْوٍ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا، وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ

بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا﴾ (مریم-۴)

اور قرآن میں اسماعیلؑ کا ذکر کر کے شہد کہ وہ عہد کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیج ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور

زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

حضرت یحییٰؑ کہتے ہیں۔

﴿وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا﴾ (مریم-۲)

اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

توراة سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار ۲۷-۳۰-۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمروا لے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھہ مثقال دینا واجب تھا۔ (خروج ۳۰-۱۵-۱۳) ساتھ ہی غلہ کاٹنے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عمل ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی۔ یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارون کی اولاد (ماویین) قومی خاندانی کا بن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور ہر تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ لے اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی۔ ۲۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا۔ انجیل لوقا (۱۸-۱۰) میں ہے کہ جو اپنے عشر (زکوٰۃ) ریا، نمائش اور فخر کے لئے دیتا ہے اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔ اسی انجیل کے ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت میں ہے۔

”اگر کوئی دولت مند مکمل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دھڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولت مند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

حضرت عیسیٰ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے۔

”کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا آسان ہے مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔“

(متی ۱۹-۲۳)

ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی نادراری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے۔ (متی ۱۷-۲۳)

توراة کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی اس لئے انہیں دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے۔ سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی اس لئے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک دو جگہ ہے۔ اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے تصریحاً معلوم نہیں ہوتی نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے اس کی تفصیل بھی خود توراة کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو پیچھ ہوں مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھل دیا تھا اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا ملک بن بیٹھے تھے چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ أَلا قَلِيلًا مَّا كُنْتُمْ مُعْرِضُونَ﴾ (بقہ ۱۰۰)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبعیاتی، سماجی، اخلاقی (Charity) باب، یہودیوں میں نہ تھی۔

(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل:

محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا۔ اس نے نہایت خوبی اور وقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا۔ انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے سونا چاندی اور جانور اور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں۔ سونے چاندی میں سے چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ متعین کیا۔ جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں۔ پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت:

اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ نماز حقوق الہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے۔ ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اقام الصلوٰۃ کے بعد ایفاء الزکوٰۃ آیا ہے۔ مثلاً

﴿اقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ (یا) ﴿اقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾

اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ بارگاہ نبوی میں آ کر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبد اللہ بجليؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت تین باتوں پر کی تھی نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ وفد عبد القیس نے ۵ھ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو

جگہ دی۔ ۱۔

۹ھ میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ پہلے ان کو تو حید کی دعوت دینا جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ ان میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔ ۲۔

صحابہؓ میں جو لوگ شریعت کے رازدان تھے وہ اس نکتہ سے ابھی طرح واقف تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو تو حید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے رڑوں گا کہ زکوٰۃ ماں کا حق ہے خدا کی قسم! جو رسول اللہ کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو اپنا پڑے گا۔ حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا۔ ۳۔ اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے اسلام کی تنظیمی زندگی صرف ان بنیادوں پر قائم ہے۔ جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔ اسلام کا نظام روحانی نماز باجماعت سے جو کہ مسجد میں ادا ہوا قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کہ بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہوتا ہے اسی سے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدیؐ نے خاص زور دیا ہے۔ نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے ہندہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے تو شریعت محمدیؐ کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزوران کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم کرنی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔

۱۔ یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۸۸ میں ہیں۔

۲۔ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرذیل النجس۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸۔

۴۔ درحقیقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پائے جاتا ہے۔

۵۔ یہ حدیثیں صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب کراہیۃ الاحادیث میں ہیں اور زکوٰۃ کی

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، یتیموں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل:

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آ کر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ بعض مورخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے پریشانی ہوئی ہے۔ حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا۔ اس کی مقدار انصاف، سادہ اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے۔ خدا کا حق اور بھائیوں کا حق۔ پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے۔ اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق جب بند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی۔ آنحضرت ﷺ جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ نے بعثت کے وقت آپ ﷺ کی نسبت فرمایا آپ قرابتداروں کا حق پورا کرتے ہیں۔ قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کمواتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں لوگوں کو مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں۔ غور کر دیا کیا زکوٰۃ انہیں فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بناء پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔

سورہ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے لیکن اس سر زمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تنویر و درخت تیار ہوا۔ اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے

﴿وَرِثْتُ فِکْرًا﴾ (مدثر: ۱)

اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے۔ اس کے بعد ہے۔

﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ (مدثر: ۱)

اور بدلہ بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر۔

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں۔ مدثر کے بعد سورہ مزمل اتری اس میں یہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے۔

﴿وَاقْبِضُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ حَبِيرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا﴾ (مزل-۲)

اور نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے، اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے اس میں ہے "اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبد القیس کے (جو تقریباً ۵۵ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔ ۶۲ھ میں جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ کا ۳۲ بھی تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۸ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کار بند بنانا تھا اس لئے حالات کے اقتضاء اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی۔ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی، پراگندگی شکستہ حالی اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی۔

﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقْبَةُ ۖ فَلَكَ رَقَبَةٌ ۖ أَوْ أَصْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ دِیْ مُسْغَبَةٍ ۖ یَتَّبِعُهَا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾ (بد-۱)

اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے کسی (قرض دار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں تاتے کے کسی بن بپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔

عام قریش پر جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا عتاب آیا۔

﴿فَدَلَّتْ أَلْدَىٰ يَدُ الْيَتِيمِ ۖ وَلَا يَحْصُ عَلَىٰ ضِعَامِ الْمَسْكِينِ﴾ (م-۱)

وہی ہے جو بن بپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا۔

﴿كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۖ وَلَا تَحَاصُّونَ عَلَىٰ ضِعَامِ الْمَسْكِينِ﴾ (ن-۱)

۱۔ سند احمد بعد اول صفحہ ۲۰۲۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب زکوٰۃ۔

۳۔ صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ کتاب التفسیر۔

یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کے کھلانے کی تائید نہیں کرتے۔

اور مسلمانوں کے اخلاص باہمی ہمدردی اور ان کے جذبہ رحم کی تعریف فرمائی کہ

﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۚ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا﴾ (احقہ۔ ۱)

اور وہ (حاجت مند ہونے کے باوجود) محتاج یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو صرف خدا کے لیے کھلاتے ہیں تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں نہ شکر یہ۔

مدینہ منورہ آ کر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقہ الفطر واجب ہوا۔ یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غنہ خدا کی راہ میں خیرات کرے تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گزاریں اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی۔ انہوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ہم کیا خیرات کریں۔

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ﴾ (بقرہ۔ ۷۷)

وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔

ارشاد ہوا۔

﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ (بقرہ۔ ۲۷۷)

کہہ دو (اے پیغمبر) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں آئندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں ۱۔ کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا انْفِقُوا مِنْ صَبَاتٍ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾

(نور۔ ۳۷)

اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات میں دو۔

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ (بقرہ۔ ۱۱۰)

اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب و نادار صحابہؓ نے آ کر عرض کی، اے خدا کے رسول جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ کیا کرے۔ فرمایا، وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے۔ انہوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے۔ فرمایا، کہ وہ فریاد خواہ حاجت مند کی مدد کرے۔ انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے یہی اس کا صدقہ ہے۔ ۱۔ آنحضرت ﷺ کی ان پر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہؓ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدائی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ ۲۔

لیکن بایں ہمداب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس لئے اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا۔ رمضان ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کر دیا اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿حُذِّ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةٌ تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (توبہ: ۳)

(اے محمد رسول اللہ) ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک و صاف کر سکو۔

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاطلوں کا تقرر ہوا۔ ۳۔ اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی یہ تمام احکام و قوانین سورہ براءت میں مذکور ہیں جو ۸ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین:

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط و تفریط تھی، توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا۔ (استثن ۱۴-۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی۔ اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعیین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے۔ اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی کیوں کہ تمام متمدن دنیا

۱۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ابن سعد جلد مغازی صفحہ ۱۱۵ و تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۲۷ مطبوعہ یورپ۔

نے خوب سوچی سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کا بیوپار کرنا ہے آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سارا مختلف موسم اور فصلیں جاڑا گرمی برسات ربیع اور خریف گزر جائیں تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع و نقصان کی میزان لگ سے اور زمیندار کا شکار تاجرانہ نوکری صناع ہر ایک اپنی آمدنی و سرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے۔ بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال لگتا ہے۔ ان تمام وجوہات سے ہر منظم جماعت ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے۔ شریعت محمدی نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے۔ چنانچہ اس کا کھلا ہوا ارشاد سورہ توبہ میں موجود ہے جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے۔

﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اَشْهُرٌ اَشْرَ شَهْرًا هٰی كَتَبَ اللّٰهُ يَوْمَ حَقِّ السَّمَوٰتِ

وَالْاَرْضِ ﴾ (توبہ-۵)

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں جس دن اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔

زکوٰۃ کی مقدار:

تورہ اچھے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار پیداوار کا دسواں حصہ تھا اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر و غریب سب پر یکساں فرض تھا۔ لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آ جاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا۔ انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹیکل اکنامی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے تورہ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا۔ اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم و بیش جو وہ چاہے خدا کی راہ میں دے دے اس کا نام انفاق یا عام خیرات و صدقہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔

﴿ اَتَدِیْسُ مِنْ عَلٰی صَلَواتِهِمْ دَائِمُوْنَ وَ اَتَدِیْسُ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّمَسٰئِلِ

وَالْمَحْرُوْمِ ﴾ (معارج-۱)

۱۔ بکری کی مدت محل چھ مہینے، گائے کی نوادٹ کی تیارہ اور بھینس کی بارہ مہینے ہے۔

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگتے اور محروم کا معلوم حصہ ہے۔

اس آیت سے صاف و صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین مقرر معلوم اور عملاً رائج ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ﴿مَنْعُومٌ اور مَغْنُومٌ﴾ کے الفاظ جہاں آئے ہیں وہاں یہی مقصود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا۔ عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر ہے۔ یعنی پیداوار میں دسواں حصہ اور نقد میں نصف مثقال۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے اجتناب زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرح معلوم کے مساوی ہیں اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا۔ یہی تحریری فرامین تدوین حدیث کے زمانہ تک بعینہ محفوظ تھے اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتب حدیث میں درج کیا گیا جو آج تک موجود ہیں۔ اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے۔ اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے۔ اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو رباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے۔ شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو۔ ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مد نظر تھی اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا۔ اس طرح چوتھ کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنے ذاتی ضروریات المل و عیال کے نان و نفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مدد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے 'فَس' ہے قرآن نے کہا۔

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

وَالْمَسَاكِينِ وَأَبْنِ السَّبِيلِ﴾ (انفال-۵)

اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت مندوں کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔

نکتہ:

اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا۔ اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور

آنحضرت ﷺ نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرمادی ہے۔ اس بنا پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا حق ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے۔

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آ جائے اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے تاکہ وہ جماعت کے مشترک مقاصد کے صرف میں آئے وہی ہے جس کی بنا پر رکاز یعنی دھنہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آ جائے (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے۔ توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا۔ شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ نخی کے ساتھ پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں تاکہ ان سے حسب منشاء خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی بنا پر ہزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات مکان لباس سامان اسباب سواری قیمتی پتھران پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چیزیں چار ہیں۔ زمین، جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی ماں، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کے جوتے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچہ گواشتکار کرتا ہے مگر

قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں ان پر اس لئے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے فرمایا **حَسْبُكُمْ** (نحل و فاطر) زینت جن کو تم پہنتے ہو۔ یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہاء کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زینت میں ہیں اب اگر کوئی شخص ہزیوں اور ماکھوں روپے کے جواہرات جمع کر لے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو تجارت کے لئے ہیں تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوئی دوسری یہ کہ کوئی بد نصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لئے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے تو گویا وہ اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کر سکتا۔ تیسری یہ کہ ایک سخت گھبرائے ہوگا اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان قییش و فخر و مہبات کے لئے جمع کرتا ہے تو اس کی حالت وہی ہوگی جو پیش قیمت لباسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کر کے، اس کا شمار اسراف میں ہوگا اور اس پر وعید ہے۔

اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی رائی اللہ بن (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے بلکہ محض فرضی ہے نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں نہ اس سے ضروریات زندگی کا مہار یا خریداری معمولاتی جاتی ہے چند دوست مندوں کی طلب و مانگ سے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے اگر جواہرات کی آب جاتی رہی یا وہ فوٹ با میں یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی بخلاف سونے چاندی کے۔ ان کی قیمت کی رائی طبعی اسباب سے ہے اور وہ ضروریات زندگی کے لئے ضروری ہے۔ وہ بھی فوٹ با میں یا میلہ بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے اس لئے وہ معیار زر ہیں۔

موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدمی زکوٰۃ یعنی عشر (۱/۱۰) مقرر کیا گیا۔ زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنوئیں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنا کر پانی لانا تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ (۱/۲۰) مقرر ہوا۔ نقدی سرمایہ جس کی ترقی حفاظت نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری گم شدگی لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں (۱/۴۰) حصہ مقرر ہوا۔ لے (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے)۔

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے صرف غذا ہے۔ زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی جاتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپے دیتے ہیں جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں شہر شہر ملک ملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس لئے نسبتاً وہ قومی ضروریات دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس اتفاق یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس شخص والی آیت سے ایک اور نکتہ معصوم ہوتا ہے کہ خمس میں چونکہ امامت و حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہیں اس لئے وہ کل کا خمس یعنی ۱/۵ مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورہ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ ہیں اس بناء پر ان آٹھ مصروفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے۔ ان دو سو درموں کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائے گا۔ یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں ۱/۵ اور ۱/۱۰ اور ۱/۲۰ اور ۱/۴۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم و تحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاوالمعاد میں بیان کیا ہے۔

جانوروں پر زکوٰۃ:

توراة میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ کا تھا۔^۱ لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہو سکتا اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی۔ شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا۔ چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت کیفیت اور کیفیت) کی بنا پر اونٹ بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا۔ مثلاً خچر گھوڑے^۲ پر کوئی زکوٰۃ نہیں دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی۔ یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے فیصد فرما کر طے کیا اور زبانی نہیں بلکہ فرامین کی صورت میں لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلیں حدود حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں	اونٹ	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری	"	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
"	۱۰ سے ۱۴ تک	دو بکریاں	"	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دو سالہ بچہ
"	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں	"	۴۶ سے ۶۰ تک	اونٹ کا تین سالہ بچہ
"	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ کا بچہ	بکری	۴۰ سے ۱۲۰	ایک بکری
"	۷۶ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو بچے	"	۱۲۱ سے ۲۰۰	دو بکریاں
"	۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے	"	۲۰۰ سے ۳۰۰	تین بکریاں
"	۱۲۰ کے بعد ہر ۳۰ پر	دو سال کا ایک بچہ	"	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری
اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ	گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں	
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہیں	"	۳۰	ایک دو سالہ چھڑا
			"	۳۰	تین سال کا ایک چھڑا
			"	۶۰	دو سال کے دو چھڑے

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
			گائے بیل، بھینس	۸۰	تین سال کے دو
			"	۹۰	تین سال کے تین
			"	۱۰۰	دو سال کے دو اور
			"		تین سال کا ایک
			"	پھر ہر دس پر	ایک دو سالہ

نصاب مال کی تعیین:

شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کمی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے کر دی۔ جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے ان میں امیر و غریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ مثلاً اگر دس بیس روپے والوں یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تو ان پر ظلم ہوتا، توراۃ میں غنہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مشقال مقرر کیا گیا ہے اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے بلکہ آدھے مشقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ:

"خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مشقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے"۔ (خروج ۳۰-۱۵)

لیکن شریعت محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا۔ سونے کی زکوٰۃ وہی آدھا مشقال رکھا لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مشقال اسی سے لیا جائے گا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مشقال ۱ سونے کا مالک ہو اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مشقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درہم چاندی کے سکے ہیں یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے۔ ۲ وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے۔

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غنہ اور پھل	پانچ وسق ۳ سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔
اونٹ	پانچ عدد
گائے بیل بھینس	۳۰ عدد
بھینز بکری	۴۰ عدد

۱ موجودہ انگریزی حساب سے بیس مشقال سونا سات تولہ کے اور دو سو درہم چاندی ۵۲ روپے کے برابر ہے۔

۲ سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من يعطى الزکوٰۃ والعسی جداول صفحہ ۱۶۴ ص ۱۶۴ مطابع لکھنؤ۔

۳ ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو۔

پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں	سونا
۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں	چاندی

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی نامواری تھی وہ دور ہو گئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے وہ اس قومی محصول سے بری ہو گئے۔

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہے مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں۔ پانچ وسق غلہ دو سو درہم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے۔ ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درہم کے برابر ہے۔ اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درہم برابر ہیں۔ اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس یا ۴۴ مثقال تھی یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دو سو درہم یا ۲۰ مثقال ہوگی۔

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات:

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی۔ (خروج ۳۰-۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹنے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں۔ وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا۔ (احبار ۱۹-۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے اور لادویوں میں جو موثری کا ہن اور خدا کے گھر کے خدمت گزار ہیں نام بنا تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں کہ ان سے مسافروں قیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے۔ (استثنا ۱۳-۲۶ سے ۲۹ تک) شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی۔

۱۔ وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا۔ یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے۔ اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہو گئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا کلیتہً اڑ گیا۔

۲۔ عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا اس لئے سونے چاندی کے سامانوں قربانی کے برتنوں اور محرابوں کے طلائی شمع دانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۳۔ حج ان ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زادراہ ہو اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہو گئی۔

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی کہ اگر وہ

مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوگئی تو اس میں ایثار کیا ہوا۔

۵۔ اسی طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جو ان مہموں سے بچیں، غریبوں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں۔

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں مثلاً

۶۔ شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی بلکہ ذخیرہ میں جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غرباء میں تقسیم ہوتا تھا لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آمدھے مثقال والی تھی وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی۔ شریعت محمدیہ نے بیس مثقال پر آمدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دے دیا۔

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہو سکتا ہو مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے۔ جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن و طنز کرنے لگتے۔ اسامہ نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادت بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جمد مصارف کی تعیین کر دی اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس رقم سے کس کس کو مدد دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ کے ساتویں روع میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

۱۰۔ اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیے جاتے تو یہ تمام سرمایہ خفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے پیش و عشرت کے پرکلف سامانوں کی نذر ہو جاتا اس لئے تاکید کر دی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تباہ مکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

۱۱۔ اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنو لاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کا بن مقرر ہوئے تھے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعاً طور پر حرام

قراردی۔

۱۲۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے۔

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ
وَالْعَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأَنَّ السَّبِيلَ فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (توبہ۔ ۸)

زکوٰۃ کا مال تو غریبوں مسکینوں اور زکوٰۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں، اور ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور گردن چھڑانے میں جو تادان بھریں ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے)

فقراء میں ان خوددار اور مستور الحال شرفاء کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو بہ حال میں قائم رکھتے ہیں چنانچہ فرمایا

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسِبُهُمُ
الْجَاهِلُ أَغْيَاءً مِّنْ انْتَعَافٍ نَّعَرَفُهُمْ بَسْمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ الْحَافَا﴾ (بقرہ۔ ۳۰)

ان مفسوس کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہیں سکتے، تاوقف ان کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے پہچانتے ہو کہ وہ حاجت مند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانتے۔

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ ان کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے۔ چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:

﴿وَأَنَّىٰ أُمِّلَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ وَأَنَّ السَّبِيلَ وَالسَّائِلِينَ وَفِي
الرِّقَابِ﴾ (بقرہ۔ ۳۱)

اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور (غلاموں یا مقررہ صوں کی) گردن چھڑانے میں مال دیا۔ اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے۔

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَعِنْدَ الَّذِينَ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ وَأَنَّ السَّبِيلَ﴾ (بقرہ۔ ۳۶)

کہو جو تم مال خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔

دو ضرورت مندوں میں ترجیح:

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے،

لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی معاملہ اور فریب تھا۔ ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں وہ تمام تر تعلقات کی کمی و بیشی پر مبنی ہیں۔ جو جتنا قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں۔ انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے پھر اہل و عیال کا۔ ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں پچھنچ رہے تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں۔ چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اس اصول کی رعایت کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کرے گا ایک قسم کا معاملہ ہے دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہو جانا چاہئے مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے اس کا مدار دو چیزوں پر ہے ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت دوسرے ان اشخاص کی حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی و بیشی۔ قرابت مندوں کی ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت اتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو ان لوگوں پر ترجیح ہے جن کی ضرورت اور حاجت مندی ان سے کہیں زیادہ ہے بلکہ مستند کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا۔ یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی و بیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی نہ کہ پہلا سبب اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے۔

فقراء اور مسکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں ان کو ترجیح دی گئی ہے جو فقر و فاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں لیکن اپنی عزت و آبرو اور خود داری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں۔ یہ تعلیم خود قرآن پاک نے ہی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا نیز آنحضرت ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا، مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو تھمے در بدر پھرایا کرتے ہیں۔ صحابہؓ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے۔ ارشاد ہوا، وہ جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔ اس تعلیم کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دے گا اور وہ کہیں نہ کہیں سے پائی جائیں گے اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہئے جو صبر و قنوت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر اکثریت کو نہیں ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے کہ بے حیاء گدائروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔

شریعت نے مصارفِ زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو اور ہر کس و ناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے۔ جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ وحی الہی نے ان کی پردہ داری ان الفاظ میں کی۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْعُرُ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْضُوا مِنْهُمْ رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْضُوا مِنْهَا دَاهُهُمْ سَحَابُونَ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ﴾ اِنما الصلقات لفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وهي الرقاب والغارمين وهي سبيل الله وابن السبيل فربصة من الله ﴿توبہ ۸۷﴾

اور جنس ان میں سے ایسے ہیں جو تجھ کو (یعنی میر کو) زکوٰۃ بانٹنے میں طعن دیتے ہیں اگر ان کو اس میں سے ملے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے ہیں کہ ہم کو اللہ بس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دے رہے ہیں گئے ہم کو تو خدا ہی چاہئے زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا، اور اس کا کام کرنے والوں کا، اور ان کا جن کا دل (اسلام کی طرف) پر چاہتا ہے، اور گردن چھڑانے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں میں یہ حصے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا: "اے شخص اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس سے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں اگر تم ان آٹھ میں سے ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں۔" اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشت گانہ:

یہ آٹھ مصارف تین بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں، فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے جیسے بوڑھے بیمار اندھے لوگ، نکلے، مفوج، کوڑھی یا وہ جو محنت کر سکتے ہیں لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے جیسے مسبین، مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم جو الفقراء و المسکین حصرو فی سبیل اللہ لا یسقطون صرفاً فی الارض کے میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

﴿وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا﴾ یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہیں اور ﴿وَالْمُؤَلَّفَةُ قُلُوبُهُمْ﴾ (جن کی تائیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں جن کی گردنیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کی طرح ادا نہیں کر سکتے ﴿وَالْغَارِمِينَ﴾ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ یہ مالی ضمانت ایک قومی نظم کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جاسکتی ہے۔ ﴿وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم

ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے۔ ۱۔ اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفر حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جاسکتے ہیں اور ﴿وَالَّذِينَ السَّبِيلِ﴾ (مسافر میں) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے۔ ۲۔ یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد:

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لو لے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے۔ نادار قیموں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے۔ یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں۔ لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہیں جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

غلامی کا انسداد:

غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے ان کے ساتھ نیک احسان اور حسن سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرفد یہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی انسانوں کے اس در ماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آ سکتی۔ پیغمبر اسلامؐ کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔

مسافر:

گزشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور دقتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ پآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مسافروں کی امداد

۱۔ اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد یا ہے مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ آیت مذکور چکی سلفہ، اللہ، احصاء، فی سبیل اللہ یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد ہی نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو سلفہ، کے ام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے ہو سکتا ہے کہ ام انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَكُمْ مِمَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔

۲۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف باب الصدقات۔

اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی۔ صحرا اور بیابان جنگل اور میدان آبادی اور میرانی ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ یہ وہ ہیں جو اپنے اہل و عیال عزیز و اقارب دوست و احباب مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہہ کر کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آ جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے آرام و آسائش کا سامان کیا جائے اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانہ کہن اور داستان پارینہ ہو گئی ہیں اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بینک، اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوئی ہیں اور سفر و حضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ مگر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولت مندوں اور سرمایہ داروں کی راحت و آسائش کے لئے ہوا اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولت مند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹوران، قہوہ خانے، اور آرام خانے موجود ہیں وہاں اس پورے مسکن ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں۔ کسی کی جیب میں جب تک کسی بینک کا نوٹ اور چیک نہیں اس کے لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول و عرض میں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کے قبضہ میں آئے سرائوں، مسافر خانوں، کنوؤں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان چین کے سنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بہ آرام و آسائش پہنچ جاتا تھا اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک پہنچا تھا۔ ادھلا ساہلی واد صائب و طاہر کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا اور آج بھی اس نظام کی بدولت ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہیں ہیں غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے کہ راسرا اور دولت مندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہاں سردیاج بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق۔

منعم بومہ و دشت و بیابان غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات:

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں جماعت کے کمزوروں معذوروں اور مفلسوں کی مدد جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت جماعت کی آمد و رفت اور سفر کے وسائل کی ترقی و تعمیر جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا جماعت کے ان کارکنوں و معاوضہ دینا جو جماعت کی مذہبی علمی تعلیمی خدمات بجالائیں اور اس رقم کی فراہمی اور نظم و

نسق کے فرائض انجام دیں زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایہ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات:

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ ”زکوٰۃ“ کے اندر ہے۔ زکوٰۃ کے لفظی معنی پاکی اور صفائی کے ہیں یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک و صاف ہونا قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے۔ سورہ والشمس میں ہے۔

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ رَكَّهًا، وَقَدْ حَابَ مَنْ دَسَّهًا﴾ (ش۔ ۱)

مراد پایادہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔

ایک اور سورہ میں ہے

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ (ط۔ ۱)

مراد پایادہ جو پاک و صاف ہوا۔

یہ تزکیہ اور پاکی و صفائی نبوت کی ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے۔

﴿يَبْنُوا عَلَيْهِمُ آيَاتِهِ وَيُرَكِّبُهُمْ يُعَنِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آ۔ ۱۰۰)

وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو سناتا ہے اور ان کو گنہوں سے پاک و صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

تزکیہ نفس:

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی و صفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت، مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔ انسانوں کی روحانی و نفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف و رجاء اور تعقل و محبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا بڑا سبب غیر اللہ کی محبت اور مال و دولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے۔ زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے غزوہ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ و بستان کی محبت کے سبب سے جوان کی دولت تھی غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (توبہ۔ ۱۳)

ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک و صاف بنا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے چھ نہ چھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا رنگ جس کا نام محبت ماں ہے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ بغل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا

ہے۔ ماں کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے۔

﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ﴾ (بقہ ۳۸)

خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے کیوں کہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے۔ بلکہ اخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود کو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ و عطا سے قوم کے نہ کرنے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خور اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے۔ سود خور اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے آخراسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے۔ لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کونھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہیں اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام اخلاقی محسن کا سنگ بنیاد ہے۔ بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿لَيْسَ الْغِنَىٰ مِنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلَكِنْ الْغِنَىٰ غِنَى النَّفْسِ﴾ ۱

تو نگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ مال کی بے نیازی کا نام ہے۔

اس حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے تو نگری بدل ست نہ بمال دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں بلکہ صبر و قناعت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس بناء پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہر مزی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہ ہو سکتا ہے؟

سود خور کو دوسروں کو لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے وہ تو ہمیشہ اس

تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے ان کے زخم دل پر مرہم رکھ سکیں۔

باہمی اعانت کی عملی تدبیر:

زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد ہے۔ انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے اور اس کی تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آئند الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذاہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہو سکتی۔ محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی۔ خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ خداوند! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر۔ آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباڑ تھے۔ آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگ دستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی۔ نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مرادف تھی بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیوں کہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا۔

﴿ان المکثرین ہم المقلون﴾ ۱

جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔ پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ ۲

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔ اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں۔ ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی کہ جس سے جتن ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے۔ یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیسی پر مجبور نہیں کرتی اس لئے ایک مقدار معین کی، تاکہ ہر ایک ایسا قانونی محصول

۱۔ ممتی ۵-۳۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثر و ہم المقلون۔

۳۔ جامع ترمذی کتاب التہجد باب ما جاء فیہ من الدعاء لعلہ یخرجہ من العسۃ قبل ان یموت۔

عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا۔ چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے۔ پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ:

﴿تَوَخَّذْ مِنْ أَغْيَاءِ هُمْ تَرُدُّ عَلَىٰ فُقَرَاءِهِمْ﴾ ۱

وہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے

صحیح ہے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی فرمایا ”اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات کرنا ہی اس کا صدقہ ہے“ اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی۔

﴿وَأَمَّا أَنْتُمْ فَلَا تَقْهَرُوا، وَأَمَّا السَّائِلُ فَلَا تَنْهَرُوا﴾ (نہی۔)

تو تم کو دبا یا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک۔

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجت مند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو کہ وہ شرمندہ ہو بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی۔ احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیرہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا فرمایا۔

﴿لَا تُبْطِلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ﴾ (بقرہ۔ ۲۶)

تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر بر باد نہ کرو۔

اس لطف، اس مدارات اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا۔ اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہیں جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں تاہم افسوس ہے کہ یک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت بڑھتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولت مندی کی بیماریوں کا علاج:

دولت مندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکہ الارباحث کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے

یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہیں جن میں نہ تو دولت مندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفہمی و غربت کو سراہا گیا ہے بلکہ گویا اس بحث کو نا مفصل چھوڑ دیا گیا ہے لیکن عیسائیت اور بودھ مت دو ایسے مذہب ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے۔ عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تمول نجات کی راہ کا کاٹنا ہے بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پاسکتا جب وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ میں لٹا نہ دے، انجیل میں ہے کہ ایک نیکو کار دولت مند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا۔

”اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آ کے میرے پیچھے ہو لے۔“

وہ دولت مند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

”میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے تاکہ سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔“ (متی ۱۹-۲۱-۲۳)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی دشمنی ہوئی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانشمندی اور اصلاح ہے اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے۔ نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کو بچانا ایک نبوت عظمیٰ کا فرض تھا۔ دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت، نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے۔ بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکو کار دولت مند ایک نیکو کار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے لعنت نہیں ہنر ہے عیب نہیں خیر ہے شر نہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ آپ کے حلقہ بگوشوں میں دولت مند بھی تھے اور غریب بھی اور دونوں آپ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ غریبوں نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولت مند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں جو ہم نہیں کر پاتے۔ آپ نے

ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ دولت مند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے۔ غریبوں نے پھر جا کر عرض کی تو آپ نے فرمایا یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔ ۱۔

آنحضرت ﷺ نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور نا طے شدہ چلا آ رہا تھا اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔ ایک دفعہ آپ نے تقریر میں فرمایا کہ ”لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے۔“ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے۔ فرمایا ”دنیا کا باغ و بہار“ (میش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشاء یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔ آپ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے پھر فرمایا ”بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حص و طمع میں آ کر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر چرنے لگتا ہے۔ دولت ایک خوشگوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھانا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ ۲۔

اس تقریر میں آنحضرت ﷺ نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرمادیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے۔ اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے اگر اس کے حصول و مصرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری اور شر انگیز ہے۔ اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ ایک نخی و فیاض و متواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں اسی طرح ایک متکبر، بخیل، امیر اور خوشامدی اور انا پرستی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دیکھیری کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان دو طرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں دھوکا، فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی۔ سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کا سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ سود کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا۔ جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے اسی کی ملکیت قرار دی۔ چنانچہ فرمایا ”زمین خدا کی ہے اور سب بندے خدا کے بندے ہیں جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے۔“ (طیالسی صفحہ ۲۰۴)

۱۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استنجاہ الذکر بعد الصلوۃ۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ و کتاب الزہد و الرقاق باب ما یحذر من رھرة الدنیا۔

متروکہ جائیداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنادیا۔ ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا۔ فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولت مندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بیگسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی۔

﴿ مَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ﴾ (حشر - ۱)

بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگا دے وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ اسٹ پھر کر تم میں سے دولت مندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشارت دی فرمایا۔

﴿ وَمَنْ يُؤْكَلْ شُحُّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ (حشر - ۱)

اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

بخل کا جتنا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے فرمایا

﴿ وَمَنْ يَخْلُ فَإِنَّمَا يَخْلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ﴾ (محمد - ۳)

اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس آیت پاک میں در پردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمہاری نہیں اصل مالک خدا ہے اور تم خود اس کے محتاج ہو پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو بلکہ محض امین ہو وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انسانیت کی طرف اس کی نسبت ہے دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے۔ اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بنخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتادیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا۔

﴿ ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ﴾ (نکاثر - ۱)

پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا۔

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو جو

اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہ کی۔

﴿وَنَبِّلْ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةً﴾۔ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ، يُحْسِبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا ﴿١٥٠﴾
برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا اور عیب چناتا ہو جو مال کو ہیئت کر رکھتا ہو اور اس کو گن گن کر وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہے گا، ہرگز نہیں۔

فرمایا رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں اور کار خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا۔

﴿وَالَّذِينَ يَكْمِزُونَ الذَّهَبَ وَالنَّصَافَةَ وَلَا يُفْقِدُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾
(آیت ۵۰)

وہ لوگ جو سونا، دریا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیئے ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا۔ دوسرا کہتا تھا خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں۔ لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی۔ حضرت موسیٰ کی توراۃ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں اور حضرت عیسیٰ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں، جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ یہ دونوں تعلیمات اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بندہ روحانی تنخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے۔ اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقد میں اور عشر پیداوار میں یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے اس کو حضرت عیسیٰ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تنخیل کے مطابق قرار دیا اور بندہ ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہ عیسٰی دونوں قسم کے لوگ تھے۔ وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے جیسے حضرت ابوذرؓ اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام

دولت اسلام کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابو بکرؓ اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے جیسے حضرت عبدالرحمنؓ بن عوفؓ اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اٹھ کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے جیسے حضرت علیؓ مرتضیٰ اور بعض انصار کرامؓ خدا نے ان کی مدح فرمائی۔

﴿وَيُطْعَمُونَ الصَّغَامَ عَلَى حَتَبِ مَسْكِينٍ وَيَتِيمًا وَاسِيرًا﴾ (۱۰۰)

اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

﴿وَيُؤْتُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَبِوَكَلٍ بِهِمْ حَصَصَةٌ﴾ (۱۰۱)

اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود حاجت مند ہوں۔

غرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لئے عمل ہر وقت امداد مل سکے اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور بڑائیاں بھی بیان کر دی ہیں تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شمعوں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی تشریح

ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

﴿وَأَيُّ طَائِفَةٍ جَانٍ وَمَالٍ دَرَبَ خَتِّهِ وَبِأَيِّ كَسٍّ سَوَّاهُ اللَّهُ نَهْ بِرِدَاخَتِهِ أَنْدَ كَفْتِهِ أَشْيَا اسْتَ الْفَقِيرَ مَا لَكُمْ مَبَاحٍ وَدَمَهُ هَدْرٌ لِعَنَى دُرُوشٍ صَادِقٍ آسَ بُوْدُ كَهْ بَخُونٍ وَمَالٍ أَوْرَادُ عَوَى نَبُوْدُ... اْاْگَرَّ مَالُشْ بَرَنْدُ خَوْشْ گُرُوْدُ گُوْدِ الْهَمْدُ لَنْدَ كَهْ حَجَابِے اَزْ پِشْ مَن بَرْدَ اشْتَمَدُ نَا كَفْتِهِ اَنْدَ زَكُوَّةِ نَعْمَتٍ دُنْيَا زَدِيْكَ اَيُّ طَائِفَةٍ مَحْمُوْدٌ نَبَا شَدُ اَزْ اَنْكَهْ بَخْلٌ نَا سْتُوْدَه اسْت وَنَخْلَى تَمَامٌ بَا يَدُ تَا وَ دِيْسْت وَ رَم رَا وَ رَنْدُ كَنْدُ وِيْكَ سَالِ مَحْبُوْسٍ دَا رَدُ آ نَگَا هِنْجِ وَ رَم اَزْ اَلْ بَدْ هَدْ﴾

اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا۔ اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو۔ اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو۔ اگر لوگ اس کا مال اٹھائے جائیں تو خوش ہو کہ الحمد للہ اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہیں ہے کیوں کہ بخلت تعریف کے قابل نہیں اور اس کے لئے کہ سال میں دو سو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم ان میں سے خدا کی راہ میں دے بڑی بخلت کی حالت ہے۔

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے۔

ایک از فقہاء برسمیل آزمائش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید گفت جواب بر مذہب فقیہاں خواہی یا بر مذہب فقیراں؟ گفت بر ہر دو جواب فرما شبلی گفت بر مذہب فقیہاں از دو یست درم بعد از حوالان حول و نجد رم باید داد اور بر مذہب فقیراں در حال ہر دو یست درم باید داد و جان بشکرانہ بر سر باید نہا و فقیہ گفت ما ایں مذہب از آئمہ دین گرفتیم شبلی گفت ما ایں مذہب از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ او ہر چہ داشت پیش سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہاد و جگر گوشہ خوشن بشکرانہ داد (مذہب ۳۳۰ - ص ۵۵)

اسی نے حضرت شبلی سے امتحان پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے فرمایا فقہاء کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے؟ کہا دونوں کے فرمایا فقہاء کے مذہب کے مطابق ایک سال گزرنے پر دو سو درم میں سے پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دو سو اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہئے۔ فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب آئمہ دین سے حاصل کیا ہے فرمایا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبرؓ سے حاصل کیا ہے کہ جو کچھ تھا دوسب سرور عالم ﷺ کے سامنے رکھ دیا اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ صدیقہ) کو شکرانہ میں دیا

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی۔ آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے جو بچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا۔ اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزانے بھی پڑے رہتے تو گھر میں آرام نہ فرماتے۔ مگر امامت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا بلکہ اتنی ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت استطاعت اور ہمت کے مطابق ہوتا کہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولت مندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے اور اس لئے تاکہ بے قیدی و عدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو۔ مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دیکھری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا علاج:

دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے سے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سو کھانڈا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی اور دولت مند طبقوں کی خود غرضی خود پسندی اور عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہیں ہوتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر سعی و کوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اس

نے جواب میں یہی کہا۔

﴿إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي﴾ (نقص۔ ۸)

مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے۔

چنانچہ ہر زمانہ کے قارئینوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی۔ ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی۔ یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب و ہوا اقتصادی مشکلات کی ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے۔ مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالٹوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت و تربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے۔ سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائیداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا، نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملکیت قرار دیں، قیصریت اور شہنشاہیت کی بجائے جماعت کی حکومت قائم کی۔ زمینداری کا پرانا اصول جن میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا بدل دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی۔ انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تاکہ دنیا میں کوئی بنگا اور بھوکا باقی نہ رہے بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دیکھری کرے۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ میں جتنے میں محمد رسول اللہ ﷺ کی روحانی حکومت ہے پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ ”جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے“ یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے۔ اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے دے اور شام کے دولت مند صحابہؓ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی کیوں کہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔ ۲

۱۔ مستد ابن خبیل جلد ۵ صفحہ ۱۷۶۔

۲۔ فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ صفحہ ۳۵۱ و طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز صفحہ ۲۵۶۔

اقتصادی اور تجارتی فائدے۔

زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں اور گنہگار چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقا اور نمو۔ بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں کیوں کہ ہر چیز ایسی نہ ہوگی۔ اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے اور نہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے اسی لئے مہزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا توجید اور یا تنازل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزرعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں بلکہ محنت و کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کر سکتا اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے کیوں کہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے۔ صیہ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو قیمیوں کے سرمایوں کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیاء کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ يَكْسِبُونَ أَثْمًا وَالْأَمْصَةَ وَلَا يَنْفَقُوا بِهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ
بِئْسَ أَجْرُكَ (۲۰ - ۲۱)

اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گائے زر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے ان کو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔

یہ دردناک عذاب قیامت میں تو جو کچھ ہو گا وہ ہو گا اس دنیا میں بھی ان کے لئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو غم و محتاجی کے عذاب الیم میں مبتلا کرتے ہیں اور بالآخر خود جہنم ہوتے ہیں اس سے امر بہن اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی دولت کو مناسبت طور سے صرف کریں۔

فقراء کی اصلاح:

اب دوسری طرف فقراء کا گردہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شر میں مذاہب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور رحم کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور ٹوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے ان کو تکلیف ہوگی، کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا۔

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے اور مرہم کا کوئی پھاہا نہیں رکھا۔ چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے بالقابل بودھ مذہب میں اس زخم کو سرتاپا مادہ فاسد بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں۔ اس نے اس غمگین اور درد مند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے۔ یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد و اعانت کی تدبیریں ہیں جو اس کے دل کی ڈھارس اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں۔ اس نے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی۔ لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو چھ بے لٹا دو اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم و محبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولت مندوں کو سب چھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایثار اور ان کے جو دو سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی، اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں، اور بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ اس طرح ان کے لئے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی اور تمام رذیل پست اخلاق کا گڑھا تیار کر رہے ہیں جہاں یہ تمام نجاستیں آکر جمع ہوں گی۔ کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

غیر اسلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ غریب و امیر اور مسکین و دولت مند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ

کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر بات سے ناپا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلوں کو برابر رکھ سکا۔ اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسروں کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی بحیثیت سے تمام مرتبہ مایہ ہو جائے گا اور اگر غرباء اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دے دی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اسی لئے داعی اسلام نے انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش کرنے اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی۔ ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا۔

﴿أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (یعنی ۱)

مانگنے والے کو جھڑک نہ دے۔

دوسری طرف خود دارو بے نیاز فقراء اور غریبوں کے طبقہ کی مدد فرمائی۔

﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَعْمَاءَ ۖ مِمَّنْ شَعَفُفَ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْتَنْوُونَ النَّاسَ الْحَافَا﴾ (بقہ ۲)

تو قف ان کی خود داری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہیں۔ تو ان کو ان کی پیشانی سے پہچانتا ہے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

اور بھیک مانگنے کو خلاف تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے ان کو خطاب کر کے کہا

﴿وَنُرَوِّدُ أَوَاثِلَ حَبِيرِ الرَّادِ التَّقْوَى﴾ (بقہ ۳)

اور ز اور اہل لے کر چلو کہ بہترین زاو راہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت

لو، وہ بے شوق نمرہ! اگرچہ چھو ہارے کی ایک پھٹک ہی کیوں نہ ہو، دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خود داری

یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ ﴿يَسْتَسْمِعُ حَبِيرٌ مِّنْ أَسْفَلَى﴾ اور پرکا ہاتھ نیچے کے

ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی سینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو

سینے فیش سے معمور یا اور دونوں کے سے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ خیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان

کو پاک و صاف بنادیتا ہے۔ لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿ان هذه الصدقات انما هي او مساخ الناس﴾
یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آجائے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں ان میں سے کوئی چیز ہے جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقراء اور مہذب گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگروں کے دامن دل کو نجس بنادیتا ہے۔ تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرتا ایسی مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں جب نفیس الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے۔ شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہیں ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ الایا جائے یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے کیوں کہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دنائت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بجائے اس کے کہ لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے یا ان میں بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہوں وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءٌ وَلَا شُكْرًا﴾ (۳۰)

ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکر یہ نہیں چاہتے۔

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم تو تمہاری احسان مندی، شکر منداری بھی نہیں چاہتے۔ پھر صدقہ دینے

• دوس کو بہ تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم شان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب حرفِ غلط کی طرح تمہارے نامر اعمال سے مٹ جائے گا فرمایا ﴿تَدْبِرُ يُفْقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يَتَعُونَ مَا أَفْقَوْا مَالًا وَلَا أَدَىٰ لَهُمْ آخِرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا حُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ.. قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذَى ۚ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ﴾ (بقہ ۳۶-۳۷)

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں نہ طعنہ دیتے ہیں ان کا اجر ان سے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہوگا اور نہ دو قسمین ہوں گے، پچھتری کی بات بہرہ ور و پشیمانی کے سائل و نال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ یا جاے یا احسان جتایا جائے خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے درگزر کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْطُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَالٍ عَلَيْهِ ثَرْثَاتٌ فَاصِلَةٌ وَأَمْلٌ فَتَرَكُهُ صَدًا ۚ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ (بقہ ۳۶-۳۷)

مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتانا اور طعنہ دے کر برباد نہ کر دیجیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے جو محض لوگوں کے اٹھانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں، تا اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر پتھر پڑ پڑی ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چھیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے نہ لوگوں نے جو کام کیا اس سے چھ فائدہ نہیں اٹھائے خدا کافروں کو ہدایت یا ب نہیں کرتا۔

تنبیہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے رزقہ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے کو کسی کو نہ ایں بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں ورنہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے گا۔ اس طرح غریب لینے والا مکر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بندی پر قائم رہے ساتھ ہی یہ کہ فقراء اور معذوروں کو در بدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

۲۔ اسی نے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے کہ علانیہ دینے میں بھی مائل ہے یہی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی کی ذلت اور فقر وفاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پرستینہ فعل سے اس کو غیبت اور شتم نہیں آتی اور اس سے اس کا ہاتھ کہہ کر اس کا اسداوند نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں بدنامی اور یوز وری اور بحیثیت مانفے کے پیشی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ انفرادی پھپھار دینے کی رسم است اس سے بھی اچھی ہے کہ یہ امانت اور شہرت طہی کی آبرو شاں سے اپنے خلاق کو محفوظ رکھ سکے گا۔ ان

لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔ لے
لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ
دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض
شامل ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَيَعْتَمِهِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ حَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (بقرہ۔ ۲۷۱)
اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ بہت ہی بہتر ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ مگر فرض زکوٰۃ کے
لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحق قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس
کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں
لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبویؐ میں تھا
یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاقلوں کے سپرد کی جائے، اس لئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں
ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقروں کو دو تو چھپا کر دینا
بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے اسی لئے جن آیت میں اعلان کی اجازت ہے اس میں فقراء کو براہ راست
دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفاء کے ساتھ دینے کا ذکر ہے وہاں فقراء کو دینے کی تصریح ہے۔ اس لئے اعلان اور اخفاء کا
اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے کہ اگر بیت المال اور ناہمین بیت
المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے اور تہمت
اور بدگمانی کا موقع نہ ملے۔ لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی
ضرورت نہیں اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ بچ میں نہیں ہے اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے
کہ چھپا کر دو تا کہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے۔ پھر ترغیب اعلان اور اظہار کی
ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوق اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی
فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو ورنہ صحابہ کرامؓ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا۔ مگر آج تو یہ حالت
ہے کہ معمولی سے معمولی رقم کے لئے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیئے جائیں دینے والوں کے نزدیک
خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳۔ تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے۔ بلند ہمتی کا اقتضاء یہ ہے کہ
مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں اس بنا پر اسلام نے یہ
اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے
سے دینے والے اور لینے والے کے اندر ہستی اور دنائت نہ پیدا ہو۔ کیوں کہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کالاجی اور

چھپھور پن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخلت حرص اور کینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی کیوں کہ کوئی بری چیز کسی کو دے دینے کا غشادوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور محن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کی بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ اسی بصفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا اس لئے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو جاتا تھا تو مجبوران میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھالیتا تھا چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مَا كَسَبْتُمْ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْتُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ وَأَنْتُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ وَأَنْتُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ وَأَنْتُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ﴾ (بقہ۔ ۳۷)

مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے بہتر حصہ خیرات کرو اور ان میں سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو۔ حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لو گے لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے (خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)

۳۔ فقراء اور مساکین کی دناست اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگ دستی اور بے بضاعتی کے خود داری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیوں کہ جب قوم کی تو جہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا۔ صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے۔ لیکن ان کی خود داری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی۔ اس بناء پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصَرُوا هِيَ سَبِيلُ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَعْيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ (بقہ۔ ۳۷)

صدقہ ان فقراء کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں (بغرض معاش و تجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے۔ جو لوگ ان سے ناواقف ہیں خود داری اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے۔

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

۵۔ لیکن بایں ہمہ حزم و احتیاط گدائری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ

آنحضرت ﷺ نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو۔ ۱۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔ آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ ۲۔

حکیم بن حزام ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا 'آپ نے عنایت کیا' پھر مانگا' پھر دیا' پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا 'اے حکیم یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لے گا اس کو اس میں برکت دی جائے گی اور جو لالچ کے ساتھ لے گا اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھانا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے' حکیم نے کہا 'یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ مانگوں گا' اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے اور وہ انکار کرتے رہے اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے۔ ۳۔

اس کی اور متعدد مثالیں ہیں اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحب دست و بازو ہوں یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح و سالم ہوں بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی 'فرمایا کہ:

﴿ لَا تَحِلُّ الْمَسْأَلَةُ لِرَجُلٍ قَوِيٍّ وَلَا لِدَيِّ مَرَّةٍ سَوِيٍّ ﴾ (ترمذی)
طاقت اور سکت والے اور صحیح و سالم آدمی کے لئے بھیک مانگنا حلال نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا

﴿ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ حِمْلَهُ فَيَحْتَطِبُ عَلَى طَهْرِهِ حَبِيرًا لَهُ مِنْ أَنْ يَأْتِيَ رَجُلًا فَيَسْأَلَهُ أَعْطَاهُ أَوْ مَنَعَهُ ﴾ ۴۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لٹری کا بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ دوسرے سے بھیک مانگے، وہ اسے دے یا نہ دے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا۔ ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی آپ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ ہے؟ عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔ آپ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلبازی خریدی اور فرمایا کہ جنگل سے لٹری کاٹ لاؤ اور بیچو، انہوں نے اس پر عمل کیا تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ

۱۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراهية المسئلة۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراهية المسئلة۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلة۔

۴۔ کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلة۔

گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔ ۱۔

۶۔ لیکن جو لوگ بد قسمتی سے کسب معاش نہیں کر سکتے ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی آپ نے فرمایا۔

﴿لَيْسَ الْمَسْكِينُ الَّذِي تَرُدُّهُ إِلَّا كَمَةِ وَالْأَكْلَانِ وَلَكِنَّ الْمَسْكِينِ الَّذِي لَيْسَ لَهُ غَنِيٌّ وَ يَسْتَحْيِ وَلَا يَسْأَلُ النَّاسَ الْحَافَا﴾ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ عروجل لا یسألون الناس الحافا)

مسکین وہ نہیں ہے جس کو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں، مسکین وہ ہے جو گوبے نیاز نہیں ہے لیکن حیا کرتا ہے اور لوگوں سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا۔

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو وہ ہر حال میں انسان کی شرم و حیا اور غیرت و آبرو کو برباد کر دیتا ہے فرمایا۔

﴿مَا رَأَى الرَّجُلُ يَسْئَلُ النَّاسَ حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِي وَجْهِهِ مَضْغَةٌ لَحْمٍ﴾ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب من سأل الناس تكثر)

آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت و آبرو کی رونق خود دھو دی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور بد اخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا۔ پست و بلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیئے اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیا تک شکلوں سے اس کو ذرا یا کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہؓ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہو گئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ ﷺ کے لئے بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرت ﷺ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرعہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا ۲۔ اس طرح یہ ایک ایسا مالی و

۱۔ ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ۔

۲۔ تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۶۸۱۔

اقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر داد و ستد کا راستہ کھلا ہوا تھا۔



روزہ

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم:

روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں جس کے لفظی معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں صبر بھی کہا گیا ہے جس کے معنی ضبط نفس ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بیکسی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابطہ اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔ روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں یعنی کھانا پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انہیں سے ایک مدت متعینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے۔ لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ:

روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں۔ انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنر اپنی تصنیف پر سپلز آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقراء کی بناء پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتداء اصل میں اسی طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردوزن کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ میں سند قبول حاصل نہ کر سکا۔ لہذا بہر حال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتداء اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتداء اور غایت کی تشریح میں اپنے پیروؤں کی وکالت کا محتاج نہیں وہ بہ آواز بلند مدعی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (بقرہ ۲۳)

مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تاکہ تم پر ہیزگار بنو۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مَكُمُ الشَّهْرَ فَصِيْمُهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (بقرہ ۲۳)

ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے سرتاپا ہدایت و ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو وہ دوسرے دنوں

میں رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے سختی نہیں تا کہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور (یہ روزہ اس لئے فرض ہوا) تا کہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو اور تا کہ تم شکر بجالاؤ

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ 'روزہ کی حقیقت' رمضان کی ہیئت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں

روزہ کی مذہبی تاریخ:

قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے۔ جاہل عرب کا پیغمبر امی جو بقول مئی لفظین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے۔ اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے۔

”روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا قومیت و تہذیب اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں لیکن یہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔“

آگے چل کر لکھتا ہے۔

”گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے“

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکاوشی کا روزہ ہے۔ اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے۔ بعض برہمن کا تک کے مہینہ میں ہر دو شنبہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں۔ چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے۔ یونان میں صرف عورتیں تمغوفیر یا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں پاری مذہب میں گو عام ہیروؤں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لئے تو بیچ سال روزہ ضروری تھا۔ ۱

یہودیوں میں بھی روزہ فریضہ الہی ہے۔ حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزارے (خروج ۳۴-۳۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لئے اس کو عاشورا (دسواں) کہتے ہیں یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰ کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے۔ اسی لئے

تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔^۱ اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں۔^۲

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔^۳ حضرت یحییٰؑ جو حضرت عیسیٰؑ کے گویا پیشرو تھے وہ بھی روزے رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔^۴ یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھائے تھے اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے۔^۵ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا۔ غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰؑ پر اعتراض کیا کہ بڑے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

”کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں جب تک دولہا ان کے پاس ہے روزہ نہیں رکھ سکتے

پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے۔“ (مرقس ۲-۱۸)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰؑ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبرؐ اپنی امت میں موجود ہے امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں۔ انہیں فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں بلکہ غم کے مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا۔ انہوں نے خود اپنے پیروؤں کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں۔

”پھر جب تم روزہ رکھو یا کاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک

روزہ دار ٹھہریں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ

تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا

بدل دے۔“ (متی ۶-۶، ۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

”یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی“ (متی ۱۷-۲۱)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے۔ مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ (یعنی دسویں محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔ مدینہ میں یہود اپنا

۱۔ تورات، سفر الاخبار ۱۶-۲۹، ۲۳، ۳۳-۲۷۔

۲۔ اول سموئل ۷-۶ و دومیا ۳۶-۶۔

۳۔ متی ۲۳-۲۔

۴۔ مرقس ۲-۱۸۔

۵۔ قضاۃ ۲۰-۲۶ سموئل اول ۷-۶ و ۱۳ الوقا ۶-۱۶ وغیرہ۔

۶۔ مسند ابن خلیل جلد ۶ صفحہ ۲۳۳۔

عاشورہ الگ مناتے تھے۔ یعنی وہی اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (بقرہ ۱۸۳)

مسلمانوں اتم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت:

انسان کی ہر قسم کی روحانی بد بختیوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلتے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے۔ وہ مختلف اغراض کا پابند ہے اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں۔ اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی اس لئے ہماری ہر قسم کی بد بختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں ضرورت اور غرض اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوں کا ایک ڈھیر ہے۔ تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے۔ لیکن کیا خوشنما کپڑوں عالی شان عمارتوں لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سوار یوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند و عیال زرو مال اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی اور زندہ رہے ہیں بروایت عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پر مسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ مایہ قوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سد رمق پر موقوف ہے اور سد رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور حج یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط و سعت، تنہن اور تعیش کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی چیز تمام فروق و امتیاز کو محیط ہوگی۔ انسان کے تمام جرائم اور گنہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی۔

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل و شرب سے ایک

حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کمزور دے اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعتاً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے۔ اسی پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغناء کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے۔ مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ماء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہئے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے۔

﴿كُنْتُ عَلَيْكُمْ الصِّيَامُ كَمَا كُنْتُ عَلَى الْبُيُوتِ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (بقرہ-۱۸۳)

مسلم نو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچالینا اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا۔ لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔

﴿لِتُكْثِرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (آلہ-۲۳)

تاکہ خدائے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت:

یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ جس طرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے۔ معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیوں کر دعوت کے منکرنا کام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنت اللہ کا لفظ آیا ہے لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک

عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصول قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے انہیں اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضان نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالم انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پر جل پیغمبر (حضرت موسیٰ) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا۔ اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (آنحضرت ﷺ) نزول قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حراء نامہ مکہ کے ایک غار میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثناء میں ناموس اکبر ﴿افْرَأْسَامُهُ رَتَّ الدی حَلَقُ﴾ کا مژدہ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔ ۱

یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (بقہ ۲۳)

رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا۔

یہ کس شب اقدس کی داستان ہے؟

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَارَكَةٍ﴾ (دخان ۱)

ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر ۱)

ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دھیکری کے لئے دستور نامہ الہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حامل اور اس وحی الہی کا مہبط، ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا لے کر سرب

۱۔ خروج ۳۳-۳۸۔

۲۔ متی ۲۴-۲۵۔

۳۔ صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب بدء نزول وحی میں اور سیرۃ ابن ہشام بدء بعثت میں ہے

۴۔ روایات سے اگرچہ بتقریح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غار میں روزے رکھتے تھے تاہم قرآن و اشارت سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ روز

عبادت کے ساتھ غار حرا میں روزے بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تہنہ و

تکاف کرتے تھے جس کا ایک جزء روزہ ہے۔ سچ کل کے بعض علماء مفسرین نے بھی ان قرآن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ان دنوں روزہ سے

رہتے تھے دیکھو حفصی معری کی التشریح الاسلامی صفحہ ۳ و صفحہ ۴۔

زاتو تھا۔ اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ و تنہا رہنا (اعتکاف) نزول وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سر بھجور رہنا تمام پیروان محمدی کے لئے ضروری تھا کہ ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران - ۳) اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمہیں پیار کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہ اقدس میں بقدر امکان انہیں حالات و جذبات میں متکلیف ہونا چاہئے جس میں وہ حامل قرآن متکلیف تھا تا کہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو۔ یہ جذبات و حالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲ھ:

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا۔ روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسب معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لئے تھے اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔ نماز و حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے عبادات کو امراض روحانی کی دوا قرار دیا ہے جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراض روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفنگی اور لذاتِ حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے مکہ میں یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے۔ بلکہ خود کفار کے جو دستور تم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا۔ اس لئے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی۔ انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو بوجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا۔ فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی اب وہ وقت آ گیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آ کر ان کو اپنا فریضہ بنائے اس لئے درحقیقت یہ مداخل کا موسم تھا جس میں مرض کے پیدا ہونے سے جو شتر پر ہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا۔ اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض نادانوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آغاز اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس لئے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا حالانکہ اصول اسلام کی رو سے فاقہ مستوں

کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے شکم سیروں کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا اس لئے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ تو حید نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لئے موزوں تھا۔

ایام روزہ کی تحدید:

روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور ان کی کفایتی مزاج مٹ جاتی، جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا۔ اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افراد امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہر کریں اور اس کے لئے وہی زمانہ موزوں تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گزارا، اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے۔ چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے اس لئے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو۔ پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (بقرہ-۲۳)

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا بلکہ

﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (بقرہ-۲۳)

جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی اس کے بعد فرمایا گیا۔

﴿أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ﴾ (بقرہ-۲۳)

چند گنے ہوئے دن۔

مدت کی تعیین اب بھی نہیں البتہ اس بلوغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا چند گنے ہوئے دن۔ اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانوں کا ذکر شروع کر دیا گیا تاکہ طبیعت متوجہ رہے۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (بقرہ-۲۳)

تو جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی۔

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا تو

یہ کہنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گئے ہوئے مقرر ہوں گے ورنہ ﴿مَعْذُورٌ دَابَّ﴾ (گئے ہوئے) ﴿عِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر ﴿وَلْتَكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (تا کہ تم شمار کو پورا کر لو) نہ کہا جاتا پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِذْيَةَ طَعَامٍ مُسْكِينَ﴾ (بقہ ۲۳-۲۴)

اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔

اب کہا جاتا ہے کہ ”مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے۔“

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ حَيْرًا فَهُوَ حَيْرٌ لَهُ وَإِنْ تَصُومُوا حَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (بقہ ۲۳-۲۴)

تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اس کے لئے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔

ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی۔

اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گئے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کر کے

دھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ ﴿إِيَّامًا مَعْدُودَاتٍ﴾ چند گئے ہوئے دن۔ ظاہر ہے کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں اتنیس

اور تیس دنوں کے روزے چند گنتی کے دن ہی تو ہیں۔ لہٰذا بہر حال رمضان کو ماہ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت

اور اہمیت بتائی گئی فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ﴾ (بقہ ۲۳-۲۴)

وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت اور حق و باطل کی

تیمیز کی دلیلیں ہیں۔

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں جس کی یہ عظمت

بے تم پر فرض کئے گئے ارشاد ہوا۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (بقہ ۲۳-۲۴)

تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔

۱۔ عربی زبان سے ولی ما واقف کر یہ ہے کہ یہ متبع قلت ہے جس کا اطلاق اس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہئے کہ یا نہ

مربہ نہ قد میں بخیر میں زیادہ زیادہ ہو ایوں میں محدود کر دے اسی طرح قرآن میں تعدد حلی نے جہاں دنیا کے در ہزار ہا نقابات

و یا مہدات (ابریک) ان مہدات عالم میں محدود کر دے جس سے شام تک کے سر ہزار ست و جو مہینوں میں طے ہوتے تھے بعد

قرآن سے اس موقع پر چند ان اور چند را تمیں فرمایا سُبْرُوْا فِیْهَا لَیَالِیْ وَ اَیَّامًا اَمْنِیْنَ (سبا-۲) اور فِیْ لَیْلٍ مَّحْجَرٍ (مذہب-۱) ہو

۱) ان مہدات قرآن نے پوری سانی عمر پر اور سخت لاء محدود نہ جس سے اس ورمات سے برسوں اور صدیوں پر یا ہے وہ دن ان سے زیادہ دن

جس میں مت قلت و شتہ کا یہ محدود بھی کلی نہیں بعد عمومی ان الفاظ کے ہے جس کی مت قلت و شتہ دنوں مستقل ہیں ایام کا غفلت میں نہیں

۲) ان مہدات متقی ہے اور وہ یوم ہے وہ تحصیل کے بعد یا مہدات ہے ایسا ہے کہ یہ مہدات شتہ کا فیہ بعد وہ بہت متبع مہدات

۳۔ مہدات یوم

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعیین و تحدید اور ایسا مٹفہذہب کی تشریح ہوگئی عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمانہ ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے وہ فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے ﴿صیام شہراً﴾ اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے ﴿صیام سنۃ﴾ (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ شہر یعنی مہینہ کہا گیا ہے اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا۔ قمری مہینہ جس کا عرب میں رواج تھا اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوتے ہیں جیسی روایت ہو وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئے گا جیسا کہ سرور کائنات ﷺ تمام صحابہ کرام خلفائے راشدین اور جمیع فرق اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے۔

ایک نکتہ:

قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے۔

﴿مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (بقرہ-۲۳)

تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

لفظ شہد کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں جو اس ماہ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ماہ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو جس میں وہ ماہ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے کہ شخص اپنی جگہ پر موجود ہو مگر ماہ صیام کا وہاں گزرنہ ہو یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہیں جو باقی متمدن دنیا میں ہے۔ مثلاً جن مقامات میں کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں۔ ہاں اُردوہاں کے مسلمان چاہیں تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے) لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارو بنایا ہے تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ۱

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھو رضی جداول بحث مفعول فیہ و ظرف زمانہ صفحہ ۱۶۲ مطبع نولشہر ۱۸۶۸ء جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے نَسْتَسْلُوْكَ غَيْرِ الْاَهْلِ فَلَمْ يَمْوَافِقْ لِسَانُ (بقرہ ۳۲) بولگ آپ سے پوچھتے ہیں پہلی رات کے چاندوں (ہلال) کے بارے میں، کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کے لیے ہے "س"۔

۲۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں س موقع پر ان لوگوں کے لیے جو اتنی مدت دن میں روزہ رکھتے تھے جتنی چاہتے تھے۔ جہاں غاروں، تجارت، بھیڑی غلطی تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں "س"۔

معذورین:

جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اسی لئے ارشاد ہے:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (بقرہ-۲۳)

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بناء پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کر لے۔

بیمار کے دو معنی ہیں یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا یا بار بار کے تجربوں کے بعد اس شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لئے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اسکے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے فرمایا۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (بقرہ-۲۳)

تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ کے عہد سے اختلاف ہے وہ آیت یہ ہے۔

﴿وَعَنِ الدِّينِ يُطَيِّفُونَهُ هَدِيَّةً طَعَامَ مُسْكِينٍ﴾ (بقرہ-۲۳)

اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ ادا کریں ایک مسکین کا کھانا۔

۱۔ بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے۔ ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ بصفوہ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے۔ اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیہ ادا کریں بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے (الغزالی کبیر باب ناخ و منسوخ)

۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے اور یہ اجازت ان لوگوں کے لئے ہے جو روزوں سے معذور ہوں جیسے بڑھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ بصفوہ کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے اطاعت کو وسیع کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور بصفوہ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں وہ ایک مسکین کا کھانا دیں تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا

پڑے گا اور یا آجکل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ غریباً روزے رکھیں اور امراء فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں۔ ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تو اثر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد کہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاعت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں اس لئے بطریقوں کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔^۱

۱۔ اطاعت کا باب افعال سے مصدر اس کے ملامتی مصدر سے فعل نہیں بنتا، فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے اور طاعت کے معنی سان اعراب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں و الصلوة الصلوة ای اقصی عابثہ و هو اسم حقدار ما یحکم ان یضعہ بمعنی طوع کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے اطاعت کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے، قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحِثْ عَلَيْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ (بقرہ-۴۰)

اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے

”جس کی ہم کو طاقت نہیں“ کے یہ معنی ہیں جس کی ہم کو وسعت نہیں یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا فرمایا

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (بقرہ-۴۰)

اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالے جس کو ہم اٹھ ہی نہیں سکتے ہوں صحیح نہ ہوگا بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بمشکل اٹھ سکتے ہوں، اسی طرح طاقت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ

﴿لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ﴾ (بقرہ-۲۵۳)

آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حدیثوں سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، ابو داؤد میں ہے۔

عن ابن جبرین عن ابن عباس وعلی الدین بطریقہ فدیة طعام مسکین قال کانت رخصة للشیخ

الکبیر والمرأة الکبيرة وهما یطیفان الصیام ان یفصرا و یضعما مکان کن یوم مسکینا۔

ابن جبرین حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کا کھانا فدیہ یہ ہے

فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں اور وہ روزہ نہ رکھیں اور

ہردن کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

اب روزہ کے سلسلے میں معذوروں کی دو صورتیں ہوں گی ایک یہ کہ یہ عذر جنگی اور عارضی ہو جیسے مرض یا خوف یا سفر تو ان کے لئے یہ آیت ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (بقرہ)

تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی ہے۔

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کر لے اس میں عائد اور مرضہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہو گئی۔ اگر حاملہ یا مرضہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے اور اس عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابل ازالہ ہو جیسے کوئی دائم المرض ہو بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھتا ہو تو وہ روزہ قضا کرے اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے، اس کے لئے یہ آیت ہے۔

﴿وَعَلَىٰ الَّذِينَ يُطِيقُونَ فَذِيَّةً مُّسْكِينٍ﴾

اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کا کھانا دینا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب بہ مشکل روزہ پر قادر ہو اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بارگاہی فدیہ کی اجازت ہوگی ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب:

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تکمیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گولغزش گا ہیں موجود ہیں۔ چنانچہ جو گیوں اور جنیوں میں روزہ غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لئے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے۔ چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے۔ سفر الاحبار (۱۶-۲۲۹) میں ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ بسطسفاں الصبام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ، جازت جمع نہیں ہو سکتی، اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے نہیں مل سکی اب الحمد للہ یہ تائید بھی ہاتھ آ گئی ہے۔ سر آملہ ملائی اہل حدیث شارح عون العبود شرح ابی داؤد میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں

لکن مع شدة التعب و مشقة عصيته اسی طرح محدثین حنفیہ کے سب سے وسیع النظم شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد ملاحظہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی، فالحمد للہ۔

انہ جوہ سے و علی الذین یطیقون فذیۃ ینہوہا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں فدیہ نہ ہوگا۔ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

”اور یہ تمہارے لئے قانون دائی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دلیس کا ہو، خواہ پردیسی، جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے“
تورات کے سفر العدد (۲۹-۷) میں ہے:

”اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو“
یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ صوم ہے۔ صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جہاں روزہ کا حکم دیا ہے وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرمادیئے ہیں ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (بقرہ-۲۳)
خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

اسلام کا عام قانون ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (بقرہ-۲۸۰)
خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے

﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (عراف-۱۹)

وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں ان سے اتارتا ہے۔

ان امور کا منشاء یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے۔ روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھارکھی تھیں بتدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات:

اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان میں اکثر روزہ صرف پیروں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا۔ مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروان مذہب کے لئے برابر طور سے ضروری ہے۔

اسلام میں پیشوا غیر پیشوا، عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس نے تمام پیروؤں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (بقرہ-۲۲)

اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شش سال معتبر ہے۔ شش سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے۔ اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہیں۔ اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہے۔

۳۔ جہاں تک دیگر مذاہب کی اہم کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص و استثناء نظر سے نہیں گزری، تو راقۃ میں تو یقیناً مذکور نہیں بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پر دیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہیں مگر یہودیوں کے پاس آ کر رہا ہو۔ ۱۔ لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں۔ بڑھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرتاً قادر نہیں، مستثنیٰ ہیں۔ بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں اور جو دائمی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۖ وَعَلَىٰ الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ

طَعَامُ مَسْكِينٍ ﴿٢٣﴾ (بقرہ-۲۳)

اُتر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

ترندی میں ہے

﴿ عن انس قال السبي ﷺ ان الله وضع عن الحامل والمرضع الصوم ﴾

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی ﷺ نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا۔

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے ان کو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضا کر کے رفع عذر کے بعد قضا رکھیں۔

۴۔ اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدل نہ تھے۔ یا تو چالیس چالیس روزہ کا فاقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غنہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی۔ اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا یعنی روزہ کے اوقات میں گوہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

۵۔ جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا۔ عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے

تھے۔ یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا۔ اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا۔

﴿ثُمَّ آتَمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ (٢٣-٥)

پھر روزہ کورات تک ختم کرو۔

۶۔ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے سو کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا۔ ابتداء میں اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا۔ ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صبح بی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئی وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آ گیا، اس پر یہ آیت اتری ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (بقہ ۲۳) اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔

۷۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ اس لئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لئے یہ ممانعت محمد وود کردی، اور رات کو اجازت دے دی۔

﴿أَحِلُّ لَكُمْ ثِيَابُ الرِّفْثِ الَّتِي سَأَلْتُمْ عَنْهَا رَسُولَ اللَّهِ وَاتَّمَّ نِسَاءَهُنَّ عَمِلَ اللَّهُ
إِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَحْتَائُونَ إِنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَانْسُوا بِشْرَهُنَّ وَأَنْتَعُوا
مِنْهُنَّ﴾ (بقره-۲۳)

روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لئے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی خدا جانتا ہے کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا اب بیوی سے ملو جلو اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔

۸۔ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھاپی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَنِ أَكَلَ أَوْ شَرِبَ نَاسِيًا فَلَا يَعْطُرُ فَلَا مَآءَ هُوَ رَقِ اللَّهِ﴾ (ترمذی)
ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ جو بھول کر کھائے یا پیئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی۔

۹۔ اسی طرح ان افعال سے جو گوروزہ کے منافی ہیں لیکن وہ قصد اسرزد نہیں ہوئے بلکہ بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا۔

﴿ قال النبي ﷺ الا لا يعطر من قاء ولا من احتسم ﴾ (البه ١٥)

پیغمبر خدا نے فرمایا جس کو قے ہو گئی۔ یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۷۔ قے ہونے کی فائدہ منگی میں نئی صورتیں ہیں، اس میں سے بعض میں رد و ہوا ہوتا ہے اور بعض میں نہیں۔

۱۰۔ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے اس لئے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔

”پھر جب تم روزہ رکھو یا کاروں کے مانند اپنا چہرہ اداں نہ بناؤ، کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا اور منہ دھوتا کہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدل دے۔“ (متی ۶-۱۶)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے۔ اس لئے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملانا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے۔ اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریاض میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے بلکہ ہلکی خوشی رضا مندی اور مسرت ظاہر ہو۔

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعق سے باز رکھا جائے۔ خود آنحضرت ﷺ اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے۔ مہینوں میں چند دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزوں کو صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی۔ بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا۔

﴿ایکم مثلی انی ایت یطعمنی ربی ویسقینی﴾

تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)۔

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے۔ جب مہینہ گزر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔

روزہ کے مقاصد:

اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرتا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں؟ گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر قائم ہے اور ان مصلحتوں اور ان منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے۔ چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے تین مختصر فقروں میں بیان کر دیئے ہیں۔

﴿لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَذَاكُمْ﴾ (بقرہ-۲۳)

تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔

﴿وَنَعْلَمُكُمْ نَشْكُرُونَ﴾ (بقرہ-۲۳)

تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (بقرہ-۲۳)

تاکہ تم پر ہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)

اوپر گزر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا۔ یہاں تک کہ وہ مکالمہ الہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربانی نے ان پر نزول کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے تب توراۃ کی لوحیں ان کے سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلنا محمد رسول اللہ ﷺ غار حرا میں ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروف عبادت رہے اس کے بعد فیضان الہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حامل قرآن کی پیروی:

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان تبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے۔ یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسبت اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں، عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہئے تھا مگر انہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گزاریں چنانچہ فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾ (بقرہ-۲۳)

اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکر یہ میں) روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔

دین الہی کی تکمیل نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گزشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا محمد رسول اللہ ﷺ کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسرے نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ:

یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان

کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکر یہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتاب الہی، وہ تعیم ربانی، وہ ہدایت روحانی، جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلمتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا جس نے ان کی قسمتوں کے پائے الٹ دیئے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشیت خاک کو ہمدوش ثریا بنادیا۔ قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

﴿وَلَنُكَفِّرَنَّ عَنْكَ سَيِّئَاتِكَ وَلَنَجْزِيَنَّكَ أَجْرَكَ وَلَنُعْطِيَنَّكَ بِمَا سَأَلْتَ وَلَنَجْزِيَنَّكَ أَجْرَكَ وَلَنُعْطِيَنَّكَ بِمَا سَأَلْتَ﴾ (بقرہ ۲۳)

اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکر یہ ادا کرو۔

اس ہدایت ربانی اور کتاب الہی کے عطیہ پر شکر گزاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نہ زوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر، اللہ اکبر کا ترانہ بند کرتے ہوئے عید گاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے دلولوں کے ساتھ عید کا دو گانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ:

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ فرمایا گیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (بقرہ ۲۳)

اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

۱۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معصوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بھی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الصوم)

۲۔ اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات میں ایک

وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے۔ ان تمام احکام پر نظر ڈالے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں۔ ایسے لوگ جو نہرنا کمزور یا دائم المرض یا بہت بڑھے ہیں اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِذْيَةَ طَعَامٍ مُسْكِينٍ﴾ (بقرہ-۲۳)

اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے

﴿فِذْيَةَ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةَ أَوْ نُسْلٍ﴾ (بقرہ-۲۳)

روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے۔

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں جس کو تمتع کہتے ہیں ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم

کی جاتی ہے اگر یہ نہ ہو سکے

﴿فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسُعْيَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾ (بقرہ-۱۹۷)

تو دس روزے رکھیں تین حج میں اور سات گھرا کر۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے جو

منی لے جا کر ذبح کی جائے اگر یہ نہ ہو سکے تو:

﴿أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ أَوْ عَذْلٌ ذَلَّتْ صِيَامًا﴾ (مائدہ-۱۱۳)

یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے یا ایک غلام کو آزاد کرنا اگر یہ نہ ہو سکے

﴿فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ﴾ (مائدہ-۱۱۴)

تو تین دن کے روزے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو

اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو

﴿فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ﴾ (مجادلہ-۱)

تو دو مہینے متواتر روزہ رکھے۔

اور یہ بھی ممکن نہ ہو

﴿فَإِطْعَامُ مِائَتَيْنِ مِسْكِينًا﴾ (مجادلہ-۱)

تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد

کرنے کا قائم مقام ہے۔

۳۔ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنے بڑا ثواب ہے۔ جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیوں کر ہوگا۔ بقول حافظ ابن قیمؒ سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے۔ روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت بادرواں کی طرح لے ہوتی تھی اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

۴۔ انسان کو کتنا ہی نعمت و تاز کے گودوں میں پلا ہو اور مال و دولت سے مالا مال ہوتا، ہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر موقع میدان کے لئے بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر و ضبط سے اپنے آپ کو آسار کھنے کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش، جدوجہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

۵۔ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنادیتا ہے۔ طب کے تجربے اور مشاہدے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے۔ طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا کا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے۔ جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

۶۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا بند کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے من سب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی ردل و دماغ بخیر معدہ کی مصیبت سے پاک ہو چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ

صادق ہے۔

۸۔ روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسوئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ بلکہ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے۔ ۱۔ اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اگر اس کی سکت نہ ہو:

﴿فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ﴾ (مائدہ-۱۲)

تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جاسکے تو:

﴿أَوْ غَدَلُ ذَلِكَ صِيَامٌ لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهُ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ﴾ (مائدہ-۱۳)

یا اس کے برابر روزہ تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے۔ اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان

غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے۔ اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو

﴿فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ﴾ (نساء-۱۳)

تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لئے دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹۔ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی۔ روزہ کی بھوک

اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے۔ کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں

دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں۔ دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے

محفوظ ہوتے ہیں۔ ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے۔ یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی

کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیت خاطر، یہ جذبات کا سکون ہونا، ہمارے غور و فکر اپنے اعمال کے محاسبہ اپنے کاموں کے

انجام پر نظر اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لئے بالکل موزوں ہے اور گناہوں

سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے

وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

اس میں تراویح ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے

بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔^۱

۱۰۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے۔ اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا یا یوں کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا لیکن روح کا روزہ نہ ہوا۔ اسی کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔^۲ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہئے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کہے اور نہ جہالت (غصہ) کرے یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو اور گالی بھی دے تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔^۳ بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کرو۔^۴ صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے؟ فرمایا جھوٹ اور خیبت سے۔^۵ چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔^۶

۱۱۔ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے جو ریا اور نمائش سے بری ہے۔ جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جز اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۲۔ اسی اخلاص اور بے ریاائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لئے اپنا کھانا پینا اور لذات کو چھوڑتا ہے اس لئے:

﴿الصوم لی وانا اجزی بہ﴾^۷

روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے

۱۔ صحیح بخاری باب بدء الوحی جلد اول صفحہ ۳۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول صفحہ ۲۵۵ و ترمذی باب الصوم صفحہ ۶۳ و ۱۰۱ و ۱۰۲، صوم صفحہ ۲۳۶، ابن ماجہ صوم صفحہ ۱۲۲۔

۳۔ صحیح بخاری صوم جلد اول صفحہ ۲۵۲ صحیح مسلم صوم جلد اول صفحہ ۴۲ مصرعہ صوط مام، مک صوم ص ۹ و نسائی ص ۳۵۵۔

۴۔ سنن دارمی صفحہ ۲۱۸ مجمع الفوائد بحوالہ نسائی صفحہ ۱۵۲ میرٹھ۔

۵۔ مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط صفحہ ۱۵۲ میرٹھ۔

۶۔ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۸۸۔

۷۔ صحیح بخاری صوم وغیرہ کتاب الصوم۔

﴿ إِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ (زمر ۱)

صبر کرنے والوں کی مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے اس لئے روزہ دار بھی ”صابرین“ کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

۱۳۔ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے

﴿ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ﴾ (بقرہ-۵)

اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں کیوں کہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں اس لئے اس کی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے اسی لئے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے رکھے ہیں۔ ۱۔

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمالِ حسد میں سے ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی، گناہوں کی معافی اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿ الصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَمِضِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَمِضُ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا

وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴾ (احزاب-۵)

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا

کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان کے لئے اللہ نے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا

بھی کفارہ ہے۔



ج

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ (آل عمران-۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن، اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس کے لفظی معنی قصد اور ارادہ کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد اور ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی۔ اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختلف سی آبادی بنی۔ پھر وہ شہر کی صورت میں شکل ہوئی اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے وہ حضرت ابراہیمؑ خلیلؑ کے عہد میں ایک خاندان کا تبلیغی مستقر بنا۔ پھر حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی، اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا۔

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصورانہ احاطہ میں دو خاص با عظمت مکان بنائے جاتے تھے۔ ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی اور اسی محافظہ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی۔ اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا۔ نذرانہ کی تمام رئیس اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔^۱

حضرت ابراہیمؑ کا آبائی وطن عراق تھا جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی۔ یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی۔ ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لئے تکلیفیں دیں اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ یہ تمام وہ مقامات تھے جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ آثار قومیات لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہیکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں۔^۲

۱۔ توراة اور بائبل کلدان، یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے، میری تصنیف ارض اقرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں۔

۲۔ میری تصنیف ارض اقرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو آباد کیا۔ اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت مقرر کی۔ یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی جس پر سے مصر و شام، جیڑ و یمن اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیمؑ کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غنہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لئے قوموں کے گزرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے۔ یہاں وہ عراق و شام کی جبر و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں علیحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی۔

بیت اللہ:

حضرت ابراہیمؑ کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے۔ چنانچہ تورات کتاب پیدائش میں ان کی تین قربان گاہوں یا خدا کا گھر بنانے کے واقعات مذکور ہیں:

”تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا بیت ایل اس کے چچم اور عیٰی اس کے پورب تھا اور وہاں اس نے خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا (۱۲-۱۷-۸)

اس کے بعد ہے:

”اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکن سے بیت ایل میں اس مقام تک پہنچا جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا۔“ (۱۳-۱۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا اور حکم ہوا

”انھ اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر کہ میں اسے تجھ کو دوں گا اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بوٹوں میں جو صہرون میں جا رہا اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی۔“ (۱۷-۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا۔ حضرت اسحاقؑ کے محل میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی۔

”اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خداوند کا نام لیا اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا اور وہاں اسحاقؑ کے نوکروں نے کنواں

کھود۔“ (بیہ تن ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہاں مقدس رویا ہوئی، وہاں:

”اور یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا ٹکیہ کیا تھا کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا“ (۲۸-۱۸-۲۳)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے:

”اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائو کیونکہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا اور تو میری قربان گاہ پر نیزگی سے ہرزمت چڑھو تا کہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو“ (۲۶-۲۵-۲۰)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب:

”اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لئے بارہ ستون بنائے اور سلامتی کے ذبیحے بیوں سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے بانسوں میں رکھا اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا“ (خروج ۲۳-۳-۶)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح) قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں کعبہ مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کی شرائط:

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسماعیلؑ تھے اور یہ بحث بھی وہیں گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کر دیا جائے وہ نذر کردہ جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور وہ جانور اس کی طرف قربانی کئے جاتے تھے جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے:

توراۃ اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ

اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے۔

”خداوند فرماتا ہے اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کی ریت کے مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر قابض ہو جائے گی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔“ (۱۸-۱۷-۱۶-۲۲)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ﴾ (بقرہ-۱۵)

اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی پھر اس نے ان کو پورا کیا تو خدا نے اس سے کہا کہ میں تجھ کو لوگوں کے لئے پیشوا بنانے والا ہوں۔

﴿وَلَقَدْ اضْطَمَيْتُمْ فِي الدُّنْيَا وَآئِهِ فِي الْآخِرَةِ لَنُمِّنَ الصَّالِحِينَ ۖ﴾ اذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلَمُ قَالَ

أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿ (بقرہ-۱۲)

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کر دے اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کر دیا۔

﴿يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا إِنَّا كَذَبْنَاكَ بِحُزْنِ الْمُحْسِنِينَ﴾ (صافات-۳)

اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں

﴿اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ﴾

خدا یا تو محمد اور محمد کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کر جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کی۔

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی

محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی ”پیشوائی“ اور آخرت کی ”نیکی“ نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظل مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے:

اسلام کے لفظی معنی ”اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا ہے“

اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ

ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفہ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے فرمایا

﴿ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّہُ لِلْحَبِیْنِ ﴾ (صافات-۳)

جب ابراہیم اور اسماعیل اسلام لائے (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔

﴿ وَمَنْ یُرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰہِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدْ اصْطَفٰیْہِ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنْ الصّٰلِحِیْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (بقرہ-۱۲۵)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا، لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)۔

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے اور یہی ابراہیمی ملت ہے اور اسی بارمانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں اور بالآخر ان کی نسل میں وہ امین پیدا ہو جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا میں وقف عام کر دے چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی۔

﴿ رَّبَّنَا وَاٰجِعْنَا مُسْمِعِیْنَ لَدُنْکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ ۚ وَارِنَا مَسَکِیْنَ ۚ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ رَّبَّنَا وَاَبْعَثْ فِیْہُمْ رَسُوْلًا مِّنْہُمْ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالحِکْمَۃَ ۚ وَیُزَکِّیْہُمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴾ (بقرہ-۱۲۵)

ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرماں بردار) بنا اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبرداری) جماعت بنا اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بنا اور ہم کو معاف کر بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ہمارے پروردگار اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک اور صاف کرے تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ رسول محمد رسول اللہ ﷺ تھے یہ کتاب قرآن پاک تھی یہ حکمت سینہ محمدی کا خزانہ علمی و عملی تھا اور یہ مناسک

اسلام کے ارکان حج تھے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی؟

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی؟ توراۃ میں اس مقام کا نام مورہ یا مور یہ بتایا گیا ہے بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور بلوطون کے جھنڈ یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے جو عبرانی کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ میں ۱۸۹۰ء میں اوکسفرڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے اس میں اس مقام کا نام ”مُریا“ لکھا ہے اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو انہی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء میں لندن میں چھپا

ہے اس کا تلفظ ”موریا“ کیا ہے اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

”خدا ابراہیم را امتحان کرده بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک گفت کہ اکنون پس خود را کہ یگانہ تست و اورا دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمن مور یا بر ذوال اورا در آن جا برکے از کوہ ہائے تیونسان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران باہ اداں (صبح) ابراہیم برخاستہ الیغ (گدھا) خود را بیا راست و دو نفر از نوکران خود را با سپر خویش ”اسحاق“ برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد و بسوے آن مکانیکہ خدا اورا فرمودہ بود رفت و در روز سوم ابراہیم چشماں خود را بلند کردہ آن مکان را از دور دید آنگاہ ابراہیم بخدا ہن گفت شما ایں جا بمانید تا من با سپر بدانجا رویم و عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد شما باز آئیم“ (پیدائش ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہودی تحریف اور اضافہ ہے اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے اور ہماری جماعت میں سے جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے ”الرای الصحیح فی من ہو الذبح“ نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے اس لئے یہاں بحث بے محل ہے بہر حال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے چند روز کی مسافت پر تھی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گزاری جائے وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو خاص کر اس لئے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جاسکے کہ ”میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں“۔ یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں اور نہ یہودی و نصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکتے اور نہ عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس یا مسیحؑ کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربوں میں اس قربانی اور اس کی خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی یا بعد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہو گئی تھی تاہم اصل شے باقی تھی عرب میں بت پرست بھی تھے ستارہ پرست بھی تھے کافر بھی تھے مشرک بھی تھے بلکہ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی تھے مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف تھا یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی قسمیں کھاتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی مصفیٰ تھیں حضرت ابراہیمؑ حضرت یحییٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں۔ ۱۔

مکہ اور کعبہ:

کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا "سمت القدم" ہے وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا 'سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ:

﴿أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران-۱۰)

سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا۔

وہ وہی تھا 'لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا ' حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا 'تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چار دیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے 'چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۳-۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی ﴿الْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ (پرانا گھر) تھا 'کوئی نیا گھر نہ تھا ' حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر پھر نئے سرے سے ان پر چار دیواری کھڑی کی 'فرمایا ﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی ' حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے اس اقدارہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا ' حضرت ابراہیمؑ نے عراق 'شام' مصر 'ہر جگہ پھر کر آخر اسی گننام گوشہ کو منتخب کیا جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا 'اس لئے قرآن پاک نے کہا:

﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِهِ شَيْئًا﴾ (حج-۳)

اور ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانہ بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتادی اور اس کو ان کی جائے پناہ اور ٹھکانہ بنادیا کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں۔ توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا کیوں کہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذریا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لئے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجا نہیں بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے ﴿وَطَهِّرْ بَيْتِيَ﴾ (اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لئے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ لفظ تو مجموعہ توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا اور کبھی اس کا نام بیابان تھا اور آخر یہی

بیابان اس کا نام پڑ گیا۔ لفظ عرب (عرب) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہیں۔ ۱۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

﴿رَبَّنَا آتِنَا اسْكَنَتْ مِنْ ذُرِّيَّتِي مُوَادِّ عَيْبَرُ ذِي زَرْعٍ﴾ (ابراہیم - ۶)

خداوند! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن بھیتی کی ترائی میں لاکر بسایا ہے۔

تو حقیقت میں یہ بن بھیتی کی ترائی اور بے آب و گیہ میدان اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسماعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی تھی:

﴿وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الشَّعْرَاتِ﴾ (بقرہ - ۱۵)

اور خداوند! یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔

مکہ قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابل یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنی ”گھر“ کے ہیں۔ ۲۔ اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گذرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے۔ دوسرے یہ معصوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا مکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ ۳۔ پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گذر چکا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں بک کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ﴾ (آل عمران - ۱۰)

پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

کعبہ کے لغوی معنی ”چوکھونے“ کے ہیں چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے۔ یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

”شمودیوں اور سبادالوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔“ ۴۔

۱۔ اخبار مکہ للازرقی وفتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ وسیرۃ ابن ہشام۔

۲۔ تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف رض اقران کی پہلی جلد میں ہے صفحہ ۵ تا صفحہ ۶ طبع آل۔

۳۔ تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۳۴ مصر۔

۴۔ مکین کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰۔

شمود کا مقام شام و حجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں گے خانہ کعبہ ہے۔ رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار یلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے کیوں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا اس پر سپہ سالار نے کہا:

”تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔“^۱

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے۔ جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔^۲ یہاں تک کہ عیسائی عرب شعراء بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا۔^۳ اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی کیوں کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلہ مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے:

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر لبیک کہا تھا اور جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور عین اس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہتا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی تو آواز آئی تھی۔

﴿اِنَّ يٰۤاٰسْرٰهٖمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْىَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْرِى الْمُحْسِنِیْنَ وَفَدٰیْہٖٓ بِذَبْحٍ عَظِیْمٍ﴾ (سفت - ۳)

یہ کہ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں.... اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا۔

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لئے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے۔

۱۔ نتائج افہام فی تقویم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا قسطنطنیہ، یہ بلاق مصر صفحہ ۳۵ بحج۔ (فنیج) ایشیانک جرنل، اپریل ۱۸۸۳ء۔

۲۔ مولانا امجد الدین صاحب نے اپنے تصنیف المعانی فی اقوال القرآن میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیے ہیں۔

۳۔ کتاب الامکنہ والازمنہ امام مرزوقی طبع حیدرآباد (جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴)۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَاجِةً لِلنَّاسِ وَأَمَّا ۖ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّی ۖ وَوَعِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ صَهْرَا بَنَتَا لِبَطْثَانِیْنِ وَالْعَکْفِیْنِ وَالرُّکْعِ السُّجُودِ ۖ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا ۖ وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مِنْ أَمْنٍ مِّنْهُم بِاللّٰهِ وَالْیَوْمَ الْآخِرَ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۖ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِیعُ الْعَلِیْمُ ۖ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَسَکِنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۖ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ یَتْلُو عَلَیْهِمَ آیَاتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۖ وَمَنْ یَّرْغَبْ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مِنْ سَفَاةٍ نَّفْسٍ وَلَقَدْ ضَطَبَّیْنَاهُ فِی الدُّنْیَا وَإِنَّهُ فِی الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِیْنِ ۖ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اسْمِعْ قَالَ اسْمِعْتُ لَرَبِّ الْعَلِیْمِیْنِ﴾ (بقہ ۱۶، ۱۵)

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا اور (کہا کہ) ابراہیم کے گھرے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنادو اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کرو اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اس کو امن وار شہر بنا اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی دے جو ان میں سے خدا اور پیچھے دن پر ایمان لائے خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤ گا پھر اس کو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کروں گا اور وہ کتنی بری بازگشت ہے اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) اے ہمارے رب (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب اور ہم کو اپنا ایک تابعدار (مسلم) فرقہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بنا اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کر (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے اے ہمارے رب ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک و صاف بنائے، بے شک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے گا بجز اس کے جو اپنے آپ کو نادان بنائے حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ یاد کرو جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلم) بن جا۔ اس نے کہا کہ عالم کے پروردگار کا میں تابعدار (مسلم) بن گیا۔

﴿وَإِذْ سَوَّيْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهَّرَ بَنَتَا لِبَطْثَانِیْنِ وَالْقَاتِمِیْنِ وَالرُّکْعِ السُّجُودِ ۖ وَآدِلٌ فِی السَّاسِ بِالْحَقِّ یَأْتُوکَ رِجَالًا وَغُلًّی کُلِّ ضَامِرٍ یَّأْتِیْنَ مِنْ کُلِّ مَحْ عَمِیقٍ ۖ لَیْسَ هَٰذَا مَسَاجِدُ لَهُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْ أَیَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَی مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِیمَةِ الْأَنْعَامِ فَکُلُوا مِنْهَا وَاطْعَمُوا الْبَائِسَ الْفَقِیْرَ ۖ ثُمَّ یَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلَیُؤْفُوا نَذْوَرَهُمْ وَالْبِطُوفُوا بِالْبَیْتِ الْعَتِیقِ ۖ ذَٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمُ حُرْمَتَ اللّٰهِ فَهُوَ خَیْرٌ لَهُۥ عِنْدَ رَبِّهِ ۖ﴾ (ج ۳)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی کو میرا سبھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف

قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دئے وہ تیرے پاس پیدا ہوئے اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دہلی سوار یوں پر ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چاہئے جانور روزی دیئے ہیں ان پر ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام نہیں تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بد حال فقیر کو کھلاؤ اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی سختیں پوری کریں اور اس قدر گھر کا چکر لگائیں یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَيْتًا آمِنًا وَاجْعَلْنِي وَبَنِيَّ ابْنَ دِينٍ مُّقْتَدِرٍ ۖ رَبَّنَا أَنْتَ تُدْخِلُ النَّاسَ فِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۖ رَبَّنَا إِنِّي أَتُكِنُّ فِيكَ مِنَ النَّاسِ الَّذِينَ لَا يُفْقَهُونَ كَلِمَاتِكَ وَلَئِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ لَا يَمِزُ الْجَاهِلِيَّةَ مِنْ دِينِهِ ۚ وَكَانَ تَحْتَهُ الْكُرْسِيُّ الْمَقَامُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُ بَاصِفًا ۖ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُ بَاصِفًا ۖ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُ بَاصِفًا ۖ﴾ (ابراہیم - ۶)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو میری پیروی کرے گا وہ مجھ سے ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو تو بخشنے والا مہربان ہے اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے اے ہمارے پروردگار یہ اس لئے تاکہ یہ تیری نماز گھڑی کریں تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ یہ تیرے شکر گزار ہیں اے ہمارے پروردگار تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور جو ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔ ﴿قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مَنَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ۚ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمِنْ دَحْلَةٍ كَانَ آمِنًا ۚ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (آل عمران - ۱۰)

کہہ کہ خدا نے حج فرمایا تو ابراہیم کے دین کی پیروی کر شرک سے منہ موڑ کر اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بتایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے بابرکت اور دنیا کے لئے راہ نما اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں ابراہیم کے گھر سے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے جس کو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو اور جو اس قدرت کے باوجود اس سے باز رہے تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائیں یہ ٹھکانہ عنایت کیا جواز ل سے اس

کام کے لئے منتخب تھا تا کہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کریں اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوند! یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں اور ان کو اس لئے یہاں بساتا ہوں تا کہ وہ آس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی سے بچے رہیں اور تیری خالص عبادت بجا لائیں۔ ان میں جو نیکو کار ہوں وہ میرے ہیں، اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہے۔ تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے اور خداوند! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی و دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں اور یہاں اسماعیلؑ کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں، اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہوں، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہوں نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہوں، اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں، اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

اوپر توراۃ کے حوالوں سے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی قربانی کرشمہ دیکھتے تھے تمدن کے اس ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھرے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے وہاں قربانی کرتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے۔ جو شخص نذر کیا جاتا تھا وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا۔ نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرہ لگاتا تھا پھر جہاں یہ مذکور ہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو۔ (خروج ۲۰-۲۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے اور کمر میں تہ بند باندھتے تھے۔ توراۃ کے فارسی اقتباس میں جو اوپر نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں ”لبیک“ کہا اور اردو میں ہے کہ ”میں حاضر ہوں“ کہا۔ یہی صدا لبیک اللہم لبیک اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے۔ یہ بھی گذر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا غار کرتے تھے، حج میں یہ طواف کہلاتا ہے۔ غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں حج ہے۔

حج کی حقیقت:

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس

معاندہ کو عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجائے اور خدا کی نوازشوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلع اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں اس لئے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیمؑ و اسماعیلؑ علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور دوڑتے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے:

لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالْمُعْمَدَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ ﴿صحیح مسلم، کتاب حج﴾

میں حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں! سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے! تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں اس لئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدق کرتے ہیں پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے پھر مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گزشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گڑ گڑاتے ہیں روتے ہیں! تصور معاف کراتے ہیں اور آئندہ زندگی کے لئے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے! یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے منظر دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آ سکنے کا موقع اور اکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں ایک ہی لباس اور شکل و صورت ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک ہے! اب دیکھو اور خشک میدان اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا و مغفرت کی پکار! گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم! اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیمؑ خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہو کر یہ روحانی منظر ایسا کیف! ایسا اثر! ایسا گداز! ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی پھر اپنی نذر کے دن پورے کر

کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت اسی فدویت اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الحج)

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلدِّينِ فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾
(انعام-۹)

میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔

﴿إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَنْحِيَايَ وَمِمَّا تَنِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبَدَلْتُ أَمْرَتُ
وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ (انعام-۲۰)

میری نماز اور میری قربانی اور میرا بھینا اور میرا مناسب اللہ کے لئے ہے جو تمام دنیا کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام کا) اقرار کرتا ہوں۔
یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات:

حج کی فرضیت دوسری عبادات سے بالکل مختلف تھی۔ عام اہل عرب نماز کے اوقات ارکان اور خصوصیات سے عملاً نااہل تھے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں۔ روزے نے بھی یوم عاشوراء سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئی تھیں اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الہی، طلب مغفرت اور علائے کلمۃ اللہ ہے لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکے تھے تو تمام قبل منیٰ میں آ کر قیام کرتے تھے۔ منہ خرت عرب کا ایک قومی خاصا تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الہی کی جگہ اپنے اپنے آبا و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشْدَّ ذِكْرًا﴾ (بقہ-۲۵)

جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔

۲۔ قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے۔ یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلادیتے تھے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹادی گئیں اور یہ آیت اتری:

﴿لَنْ يَسَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلَكِنْ بِمَا تَتَّقُونَ﴾ (نہ-۵)

خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

۳۔ اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زادراہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى﴾ (بقرہ-۲۵)

زادراہ ساتھ لے کر چلو کیوں کہ بہترین زادراہ پرہیزگاری ہے۔ ۱

۴۔ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لئے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ ۲ اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے۔ ۳ ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبہ اللہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لئے کپڑا مستعد رکھتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا۔ ۴ اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اتری:

﴿حُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (حرف-۳)

ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگا ہو کر طواف نہ کرنے پائے۔ چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی۔ ۱

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنے اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اسلام نے قریش کے اس

۱۔ بخاری جلد ۱ ص ۲۰۶ کتاب الحج۔

۲۔ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہ سید الشہداء۔

۳۔ بخاری جلد ۱ ص ۲۲۶ کتاب الحج۔

۴۔ بخاری جلد ۱ ص ۳۰۶ کتاب الحج۔

۵۔ بخاری کتاب الحج جلد اول ص ۲۲۶۔

۶۔ صحیح بخاری کتاب الحج باب لا طواف عربا۔

امتیاز کا خاتمہ کر دیا چنانچہ یہ آیت اتری:

﴿ثُمَّ ابْیَضُوا مِنْ حَبِثِ اَفْاضِ النَّاسِ﴾ (بقرہ-۲۵)
کوچ و ہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔

۶۔ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پائی تھی لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا۔^۱ یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

۷۔ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے۔ شور و غل ہوتا تھا دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھینرخانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشا وہاں ہوتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے ایک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس 'توزع' نیکی اور ذکر الہی کا سر تا پا موقع بنا دیا 'حکم آیا:

﴿مَنْ مَرَّ مِنْهُمْ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ حَبِیرٍ یَعْلَمُهُ اللّٰهُ﴾ (بقرہ-۲۵)

پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں عورت سے نہ چھینر چھاڑ ہے نہ نفاشی ہے نہ لڑائی دنگا ہے اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہوگی۔

۸۔ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے ان میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا جو دیر میں واپس ہوتے تھے چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گناہگار نہ تھا اس لئے قرآن مجید نے دونوں کو جازز رکھا

﴿مَنْ تَعَجَّلَ مِنْ یَوْمَئِذٍ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ وَمَنْ تَخَرَّ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ لِمَنْ اَنْقَضَ﴾ (بقرہ-۲۵)
جو شخص عجلت کر کے ایام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا۔

۹۔ ایک خاموش حج ایجا کر لیا تھا یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی۔ معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے۔ انہوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔^۲

۱۰۔ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک بڑھے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ جا رہا ہے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے۔ ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے۔ چنانچہ آپ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا۔^۳ اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں۔ آپ نے ایک بار اسی قسم کی

۱۔ بخاری کتاب الحج جلد اول صفحہ ۲۲۶

۲۔ بخاری جلد ۱ ص ۵۴۳

۳۔ بخاری جلد صفحہ ۵۴۱

۴۔ ترمذی کتاب اللہ و روالایمان باب فی من یكلف بالمشی و ما یستلج۔

ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا، اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہئے۔ ۱۔ اسی سبب سے قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے سوار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لیے جا رہا ہے۔ فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے چنانچہ آپ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔ ۲۔

۱۱۔ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر میں گھس آیا تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت و ملامت کی اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: ۳۔

﴿لَيْسَ الْمُرَبِّانِ تَأْتُوا التَّبُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْمُرَّ مِنْ أَتْقَى وَأَتُوا التَّبُوتَ مِنْ

أَوْبَاهَا﴾ (بقہ۔ ۲۳)

گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے نیکی صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا اور گھروں میں دروازے کی راہ سے آؤ۔

۱۲۔ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے چھ لوگ ناک میں نیل ڈلوا لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نیل کنوا دی۔ ۴۔ اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے اور وہ اس کو طواف کر رہا ہے۔ آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔ ۵۔ ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جڑے ہوئے ہیں وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذرمانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے آپ نے فرمایا کہ اس شخص کو دور کر دینا نہیں ہے نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔ ۶۔

۱۳۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آ جائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاص ایام حج میں عمرہ کیا اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا۔ ۷۔

۱۴۔ جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ توحج کی نیت کرتے تھے وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے اور اس کو

۱۔ ترمذی کتاب اللہ والایمان۔

۲۔ بخاری جلد ۲۲ صفحہ ۲۲۹ کتاب حج۔

۳۔ ایضاً صفحہ ۲۳۲۔

۴۔ ترمذی کتاب حج صفحہ ۳۶۱ باب الکلام فی الطواف۔

۵۔ بخاری کتاب حج باب الکلام فی الطواف۔

۶۔ بخاری جلد ۳ صفحہ ۳۸۶۔

۷۔ صحیح بخاری باب ایام الجاہلیہ۔

طریقہ حج کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لئے آتے تھے وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے ان کو حج سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ عکاظ اور ذوالحجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے۔ اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے۔ اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے اور غیر حاجیوں کا جو جمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس و حرمت کے خلاف نہیں اس لئے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں فرمایا: ۱۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَسْعَوْا أَفْضُلًا مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (بقرہ-۲۵)

تمہارے لئے یہ گناہ نہیں کہ (حج کے زمانہ میں) فضل الہی (تجارت) کی تلاش کرو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔

۱۵۔ صفا و مردہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ انصار مناة کا احرام باندھتے تھے جو مشلل میں قائم کیا گیا تھا اور طواف نہیں کرتے تھے ان کے علاوہ تمام عرب صفا و مردہ کا طواف کرتے تھے۔ خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفا و مردہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۲۔

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطُوفَ بِهِمَا﴾ (بقرہ-۱۹)

صفا و مردہ خدا کا شعار ہیں پس جو شخص حج یا عمرہ کرے اس کے لئے ان دونوں کا پھیرا گناہ نہیں ہے۔

حج کے ارکان:

اب اس اصلاح، ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مفصلیتیں حسب ذیل ہیں:

احرام:

تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا

۱۔ اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے اہل عرب حج میں تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لیے یہ آیت اتری، دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے۔ اس دم جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لیے ہو گیا اس لیے اب اس میں تجارت مناسب نہیں۔ یہ آیت اس خیال کی تردید ہے۔ لیے اتری لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے (مکمل تفسیر طبری، اسباب النزول واحدی میں آیت مذکورہ)۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الحج جلد اول صفحہ ۲۲۳۔

اعلان ہے۔ احرام بھی حج کی تکبیر ہے۔ احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آ جاتا ہے۔ اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیوی پیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں۔ وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام دہن کی لذت کے لئے کسی جاندار کی جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔ بیوی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے۔ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی۔ اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے۔ ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لئے باہر رہے۔ یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تا کہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل و صورت سے بھی ظاہر ہو۔ یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ بے تکلف اور زیب و زینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف:

یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر دعائیں مانگنا اس رسم کو ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کی قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی۔ چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھتا ہے اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ خداوند ابراہیم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو گے اور حکم ہوا کہ:

﴿وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ (حج-۴)

اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔

حجر اسود کا استلام:

حجر اسود کے لفظی معنی کا لے پتھر کے ہیں۔ یہ کا لے رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا۔ کبھی سیلاب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں جل گیا۔ اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب

ہے (۱) یہ کہ ۳۱ھ میں باطنیہ اس کو پچھ دنوں کے لئے نکال کر لے گئے اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے۔ اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان کا کام دے۔ ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں۔ یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں اور یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگاری پتھر ہے۔ مگر ایک مشتاق زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ، ائمہ اعلام، اکابر اسلام اور حکماء عظماء کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور بایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادہ توحید کے ایک ہشیار متوالے نے اس کو چوم کر کہا اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان لیکن میں اس سے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا۔ الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مردہ کے درمیان دوڑنا:

صفا اور مردہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں جو گلاب برائے نام رہ گئی ہیں تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں۔ صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مردہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیلؑ کی جگہ مینڈھا قربانی کیا، بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہؑ صفا و مردہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا۔ یہ صفا و مردہ کی سعی انہیں کی اس مضطر ہانہ دوڑ کی یادگار ہے بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مردہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعائیں مانگتے ہیں پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مردہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے

۱! یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔

۲! صحیح مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب، اسلام۔

کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؑ کو نظر آئے۔

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُحَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (بقرہ-۱۹)

بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اس کا اس پر پھیرے لگانا گنہ نہیں۔

وقوف عرفہ:

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے۔ یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو کر اپنے گنہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں۔ یہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر موثر منظروں میں مغفرت اور رحمت الہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے ہر شخص کو دہانے بائیں آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ:

حج کا زمانہ بھٹ بھڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے ہیں اسی حالت میں اُرمی کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خشکی سے چور ہو جاتے۔ اسی لئے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے سنے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام ہے اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا:

﴿فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الضَّالِّينَ﴾ (بقرہ-۲۵)

تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے ہوئے تھے۔

منیٰ کا قیام:

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قربانی پیش کی تھی اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں۔ رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت ہو جائے گا تو یہاں تک کہ منیٰ کا قیام ہو جائے گا۔

سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لئے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے۔ یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فحاری کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اس یہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مغفرت کی بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف و محبت مساوات اور یک جہتی کا مقام قرار دیا جائے، فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ﴾ (بقرہ-۲۵)

خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔

قربانی:

یہ حضرت اسماعیل کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں:

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا

وَاطْعَمُوا السَّائِسَ الْفَقِيرَ﴾ (حج-۳)

اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے

﴿مَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فَبِی

الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾ (بقرہ-۱۹۳)

تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے۔ جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔

حج راس:

منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں۔ یہ اس پرانی رسم کی تقلید ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے۔ اسے ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یا، گار کا اشارہ چھپا

ہے تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

﴿مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ﴾ (فتح: ۴)

اپنے سروں کو منڈا کر یا بال تراشا کر۔

﴿وَلَا تَحْقُقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَذَىٰ مُحْتَمَةً﴾ (بقہ: ۲۳)

اور اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔

رمی جمار:

منیٰ ہی کے میدان میں پھر کے تین ستون کھڑے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا جس سے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا اور اسی لئے شیطان کو ”رجیم“ یعنی ”کنکری مارا گیا“ کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابراہیم کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا جس کا ذکر سورہ فیل کی آیت ﴿تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سَعْبٍ﴾ (الفیل) میں ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے۔ یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی ترمیمہ کی سنگ باری کی یادگار ہے۔ خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں۔ چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

﴿فَادْفَعْنِي مِّنْ مَّسْكِكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشْدَّ ذِكْرًا﴾ (بقہ: ۳۵)

جب سب ارکان ادا کر چکے تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے تھے ویسے ہی خدا کو یاد کرو بلکہ اس سے بڑھ کر۔

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ان رسوم کی غایت:

اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دور ترقی کا عہد آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات و احساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں

۱۔ ابن سعد جز ۲، ثانی قسم اول صفحہ ۳۷۲ و ابن ہشام ذکر بیرونی و ابن عمر و ابن امیہ و جز ۱ ص ۱۰۵۔

۲۔ مشکوٰۃ باب رمی جمار بحوالہ دارمی و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔

کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔^۱ اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے۔

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّغْلُوبَاتٍ﴾ (ج-۳)

اور تاکہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں اور اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر اللہ اور حرمت اللہ ہے یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکان حج ہے۔ سورہ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

﴿وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ حَبْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾ (ج-۳)

اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔

صفا و مروہ کی نسبت ہے:

﴿إِنَّ الصُّعْدَ وَالْمُرُوءَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ﴾ (بقرہ-۹)

اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں۔

اور سورہ حج میں فرمایا:

﴿ذَلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (ج-۳)

یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری ہے۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب:

حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاک بازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو۔ وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے شکار تک اس کے لئے جائز نہیں کیوں کہ وہ اس وقت ہمتن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے۔

﴿فَمَنْ مَرَضَ فِيهِمْ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ حَبِإٍ

يَعْلَمُهُ اللَّهُ﴾ (بقرہ-۲۵)

تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا

ہے اور جو بھی نیک کام کروا اللہ اس کو جانتا ہے۔

﴿عَبْرَ مُحِبِّي الصَّيْدِ وَانْتُمْ حُرْمٌ﴾ (۱۰۷-۱)

حلال نہ جانوشکار کو احرام کی حالت میں۔

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں ان کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانہ الہی کے پاس ادب کے خلاف ہے تاکہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بد معاشوں کی وجہ سے قفلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

﴿وَلَا آمِنِ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَسْتَعُونَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا﴾ (۱۰۷-۱)

اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصد اُصادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے جس کا نام کفارہ ہے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی یا چند متاع جوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَانْتُمْ حُرْمٌ ۚ وَمَنْ قَتَلَ مِنْكُمْ مَّتَعِبًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بِلِغِ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ أَوْ غَدَلٌ ذَلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهٖ﴾ (۱۰۷-۱۳)

اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو اور تم میں جو جانور مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے موشی میں سے۔ اس کا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اس کو عبت تک پہنچا کر قربانی کی جائے یا اس کے گنہ گار ہے کچھ متاع جوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی اور امن و آشتی ہے۔ اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آ جاتا ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں:

محمد رسول اللہ ﷺ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفاتروں سے معمور ہے۔ وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں۔ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیلؑ کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعائیں وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کی جامع ہے۔ آئیں ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَافًا لِلنَّاسِ وَآفَاءً وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَوَعَدْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ وَأِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهْرًا بَيْتِي لِبَطَّانَيْنِ وَالْغَافِقَيْنِ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۖ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ

- ۱۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے۔
- ۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گزاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے اور آخراں میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفیتیں ایسی ہوں۔
- ۳۔ یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں، آباد ہوئے ہیں اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں تو تو اس بے ثمر اور شورز مین میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔
- ۴۔ قسم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستے سے لوگ لبیک کہیں گے تاکہ یہاں آ کر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔
- ۵۔ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں خداوند! تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

- ۶۔ خداوند! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستے پر چلے اس لئے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔
- الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں۔

مرکزیت:

خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفیتیں اپنا عکس ڈال کر تمام برہ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب ہی کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لحد اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لئے عرصہ حج میں تمام قومیں ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں۔ یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے

اسباب ہیں اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خوریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بد امنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیم کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم 'تمدن' مذہب اور اخلاق کی وحدت کی ممبر دار ہے۔ آج دنیا کی قومیں "ہیک" (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوام عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیرہ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے یہ حج کا موسم ان کے سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر، اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پاتی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل حج کے فوراً ہی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِزُ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَىٰ قَلْبِهِ وَهُوَ
الَّذِیْ الْجَصَامُ ۚ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا
يُحِبُّ الْمُسَافِرِينَ﴾ (بقرہ-۲۵)

بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ پر لے درجہ کے جھگڑالو ہیں اور جب پیٹھ پھیریں تو ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں کہ اس میں بے امنی برپا ہو اور تاکہ کھیتیاں اور جائیں تلف ہوں اور اللہ فساد کرنے کو پسند نہیں کرتا۔

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْخُرُوا فِي السَّلَامِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِينٌ﴾ (بقرہ-۲۵)

اے ایمان والو! تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بہ سال دور دراز اقصیوں ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکتے جب سفر اور آمد و رفت کا مسد آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے اسی اصول پر کیا وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا اور سب نے سمعاً و طاعتاً کہا 'آپ کے بعد خلفائے راشدین'، اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرام، آئمہ اعلام نے اسی طرح سال بہ سال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی اسی کا نتیجہ تھا کہ نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہ 'اور عالم محدث' مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بہ سال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور تمام دنیا کے گوشوں سے آ کر حرم ابراہیم میں جمع ہو جاتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے۔ یہیں آ کر بخارا کا باشندہ اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوئی سے، کوئی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی سندھی (ہندوستان) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی۔ مصر کی تصنیف و روایت ترستان میں اور ترکستان کا فیصد مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا۔ ابن مسعودؓ کے شاگرد ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے، ورا بن عباسؓ کے مستر شد ابو ہریرہؓ کے مستفیدوں سے اور انسؓ کے حلقہ کے فیض یاب علیؓ کے شاگردوں سے مستفید و میراب ہوتے تھے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں آئمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیض یاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابہ کرام و ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرائین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا اور آپ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں اور موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور آئمہ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ مسائل کے متعلق دوسرے ممالک کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجتماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدون ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکیں و زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے۔

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں رفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر دریا پہاڑ جنگل آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد و رتق و دن کی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہیں آ کر چینی مراکش سے، تونسہ ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائر سے، افریقی یورپین سے اور جاوی بلغاری

سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم ایک نسل ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، زمانہ کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لئے بے چین نظر آتا ہے پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی۔ دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے۔ مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گذرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی۔ یا قوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافیائی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے۔

رزق ثمرات:

اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بسنے والوں کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی کہ خداوند امیں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے۔ تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لئے زکوٰۃ خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتے جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنا دیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے بنی اسماعیلؑ کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ (عکین ۲۷-۲۸-۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔ خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے جس کا ذکر سورہ لایلاب قریش میں ہے۔ وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر و روم تک جاتے تھے۔

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین

کے بسنے والوں کے لئے روزی کا سامان تھا۔ اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر مال کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھاپی سکیں۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو پورے راستہ اور منزلوں کے بدوائے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں۔ کھانا پینا، مکان، سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور آخر یہی زر معاوضہ اہل مکہ کے قوت لایموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت:

اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے۔ اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لئے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں۔ اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپے^۱ اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت:

حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا:

﴿وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الشَّمَرَاتِ﴾ (بقرہ-۱۵)

اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل میوے سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے

تجارت:

قرآن پاک کے محوریہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے:

﴿وَلَا آمِنُ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَتَشْعَوْنَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا﴾ (۱-۵۷)

اور نہ ان کو (ستاد) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش

۱۔ تخمینہ میں نے اپنے پہلے سفر حج سے تجویز بنا پر ۱۳۴۳ھ میں یا تھا کمرس کے ۲۳ برس بعد ۱۳۶۹ھ میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانہ کے اقتصادی تغیرات نے مجھے تخمینہ کو یہ قلم بدل دیا۔ اب ہر چیز کی قیمت سرائی کی طرف مائل ہے۔ جانوروں کی قیمت بھی چوٹی نظر آتی۔ بکری کی قیمت ۳۰-۳۵ روپے، گائے بیل کی قیمت اسی سے ۵۰ روپے تک اور اونٹ کی ڈیڑھ سو تک نظر آتی۔ اب اس تخمینہ کو باوجود ہر چیز کی قیمت چوٹی ہونے کے ۳۰-۳۵ روپے، ۳۰-۳۵ روپے اب ۱۳۶۹ھ میں تو قیمت کا پتہ ٹھکانہ ہی نہیں ہے (ناشر)

کرتے ہوئے۔

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔ تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے اس لئے اسلام کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ جیسی کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ، تنگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے اور فرمایا:

﴿وَتَرَوْهُوَ فَإِنْ خَيْرَ الرَّادِ التَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا لِلَّهِ الْإِنْسَابَ ۖ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (بقرہ: ۲۵)

اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)۔

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں، درست نہ تھا کہ اول تو طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ یہ مقام گویا مسلمانوں کے عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالک اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے۔ وہ کون سا اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آ سکتا لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا یورپ کی مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت:

روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکان حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی ایک حیثیت تو وطنی دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے۔ وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے۔ وہی ملت ابراہیمی کا مقام اسلام کا مولد اور قرآن کی مہبط ہے اس لئے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازاروں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ اٹھنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان جس ملک میں بھی ہے اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں۔ اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے

خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے۔ گرد و پیش آگے پیچھے داہنے بائیں ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے اور اس وقت سر زمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوا باد یوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت۔ آج انگریز ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، فرانسوال، زنجبار اور افریقہ اور کینیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانوی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا مرکز ہے۔ وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے۔ وہ تمدن معاشرت اخلاق تعلیم لٹریچر ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہیں جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب، اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کے ایک ایک درود یوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پڑمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آ کر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمہ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں۔ ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کی نگریم کر شمد دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آ کر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روح ایمانی کو تازہ کر سکیں۔ قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو اُمّ القریٰ یعنی آبادیوں کی ماں کہا ہے۔ اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل و مرجع اور مادّی تو ضرور ہے۔

تاریخیت:

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے۔ آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ و صحرا اور درود یوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدمؑ نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا۔ یہیں حواؑ نے آ کر ان سے ملاقات کی۔ یہیں نوحؑ کی کشتی نے آ کر دم بیا۔ حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہاں پناہ لی۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہاں ہجرت کی حضرت اسماعیلؑ نے یہیں سکونت اختیار کی۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے یہاں ولادت پائی۔ یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے۔ ہیں وہ دوسری پہاڑی

ہے (مردہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی، یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ توپیاں کے عالم میں نظر آیا۔ یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ علیہما السلام نے بند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ مشعر حرام اور عرفات ہیں جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں منت ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ یہیں وہ گلیاں اور راستے ہیں جو جبریل امین کی گذرگاہ تھے، یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ محکم حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ ﷺ نے تہین سال بسر کئے اور یہی وہ مقام ہے جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا۔

﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ﴾ (آل عمران-۱)

اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں، ابراہیم کے قیام کی جگہ۔

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں ترپنے لگتی ہے۔ جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُعْظَمْ شُعَائِرَ اللَّهِ فَاتَّخَذَ مِنْ تَقْوَى الْقُتُوبِ﴾ (ع-۴)

اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ کے سبب سے ہے۔

﴿وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾ (ع-۴)

اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔

خالص روحانیت:

حج کی حقیقت میں گذر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رمی قربانی اور اس دوزدھوپ کا نام نہیں یہ توجج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے۔ حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ حج مبرور رکھا ہے یعنی وہ حج جو سراپا نیکی ہو اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سالکوں کے لئے خاص ہے۔ حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، اتابت اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُسْلِمَةٌ لَكَ وَارْحَمْنَا سَكَوْنًا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ

أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ (بقرہ-۱۵)

ہے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اور میں سے اپنا ایک فرمانبردار گردہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا ان کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر جہاں اکثر نبیوں رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار کرنا ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیدہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روئے ہوئے مومن کو منانا ہے تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گنہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم و کرم لطف و عنایت کا بحر بیکراں ہے۔

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین ﷺ نے فرمایا کہ حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھیٹی لوہے سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گذارتا ہے اس کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔^۱

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے۔ وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ ر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے جو انہوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا) مومن مالک میں ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل رہا، غضبناک نہیں ہوتا کیوں کہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے۔ یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی و ارساماسکسکس و نب عیساؑ اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا اور ہماری توبہ قبول فرما کی تفسیریں ہیں۔

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ تَبَتُّبْتُ لِنَفْسِي تَبَتُّبْتُ لِنَفْسِي تَبَتُّبْتُ لِنَفْسِي خداوند میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں کا ترجمہ بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے۔ طواف میں سعی میں کوہ صفا پر کوہ مروہ پر عرفات میں مزدلفہ میں منی میں اور ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ ﴿النَّاسُ بِسُوءِ الظَّنِّ كَمَلٌ لَا دُنْبَ لَهُ﴾ گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے اس لئے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں اس کے لئے تعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں لیکن حج کے مشاعر مقامات اور رکان اپنے گونا گوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں صدق توبہ کے لئے

۱۔ نسائی و ترمذی و بزار و طبرانی کہے بحوالہ جمع الغوائد کتاب الحج جلد اول صفحہ ۱۶۳ میرٹھ۔

۲۔ نسائی و ترمذی و بزار و طبرانی کہے بحوالہ جمع الغوائد کتاب الحج جلد اول صفحہ ۱۶۳ میرٹھ۔

بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں۔ ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے۔ وہ مقامات جہاں انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول وہ فضا وہ تمام گتھگاروں کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا و زاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی منظر اور ربانی مشاہد جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین مواقع ہیں جہاں حضرت آدم و حوا نے اپنے گنہ گنہوں کی معافی کی دعا کی۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی۔ جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈی۔ جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں جہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائیں مانگیں وہی مقامات، وہی مشاہد، اور دعاؤں کے وہی ارکان ہم گتھگاروں کی دعائے مغفرت کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور انسان اس ابرکرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگان الہی پر عرش الہی سے برستار ہا ہے اور ہنوز آں ابر رحمت ورفشاں است۔

انسان کی نفسیات (سائیکالوجی) یہ ہے اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حد فاصل کی تلاش کرتا ہے جہاں پہنچ کر اس کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جازا گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں جہاں سے ادھر یا ادھر مڑ جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حد فاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔ یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے۔ ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جہاں جلیل القدر انبیاء کرام اور خاصان الہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے رویہ و جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گنہ گنہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف، خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گزشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے سرور کائناتؐ نے یہ فرمایا:

﴿مَنْ حَسِبَ لِبَنِيهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ﴾

جس نے خدا کے لئے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور نہ گنہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن

اس کی ماں نے اس کو جٹا۔

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی۔ یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں طواف کی دعا کا آخری ٹکڑا ہیں:

﴿ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۖ فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَسَاجِدَكُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۚ فَمَنْ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ بَصِيثٌ مِمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۲۵﴾﴾

پھر طواف کے لئے وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلے اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو، بے شک خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو یا ان سے بھی زیادہ، تو بعض لوگ (حج کی دعا میں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے اور ایسوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا یہ وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا اور اللہ ہمارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں مثلاً

۱۔ حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے۔ حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے اس لئے آدمی حج کے لئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل و عیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے اس لئے اس کو اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں۔ معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے اس لئے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھوں کو مانتا ہے قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۲۔ اسلام آج ہر ملک میں ہے اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سکی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۳۔ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا ایک لباس میں ایک صورت میں ایک میدان میں ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے نہ آگے پیچھے کی قید۔

۴۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اس کو خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

الغرض ”حج“ اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بند منارہ ہے۔



جہاد

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ (ج-۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضہ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو توہر تو پردے پڑ گئے ہیں ان کو اٹھایا جائے۔

جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اسی کے اصطلاحی معنی بھی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و اقارب کی اہل و عیال کی خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سر نہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے صرف دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے۔ یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سر تا پا عمل ہے۔ آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ و حیان اور الہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد انہیں کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے اسی لیے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ قعود (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے، سورۃ نساء میں ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِّ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۖ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (نساء-۱۳)

مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذرت نہ ہو اور پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخش ہے۔

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں اس لئے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سورہ نساء کے اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جو کھوں میں ڈال دینے آگ میں جلانے جانے سولی پر لٹکانے جانے تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سر بلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحّد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا۔ اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہا و راندہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھریار سے دوری کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈمگانہ نہ سکی اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَحَافَذُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ﴾ (حجرات-۲)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈمگائے نہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔

﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَتْلُوا أَوْ قُتِلُوا لَا كُفْرًا عَنْهُمْ سُبْحَانَهُمْ وَلَا دُخْلًا لَهُمْ جَهَنَّمَ﴾ (آل عمران-۱۴۰)

پھر جنہوں نے اپنا گھریار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے میں ان کے گناہوں کو اتار دوں گا اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔

جہاد کی قسمیں:

۱۔ جب جہاد کے معنی محنت، سعی، بلیغ اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔ علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ آپ نے ان صحابہ سے جواب بھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے فرمایا ”تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو“ کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔ حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں۔ لے چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابو ذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ”بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے“۔ یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو یہ تینوں روایتیں گوشت و گوشت کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت بعض حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (نکبت۔ ۷)

اور جنہوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بے شبہ خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

اس پوری سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز میں ہے

﴿وَمَنْ جَاهَدْ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (نکبت۔ ۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے جہاد کرتا ہے۔ اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہرے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے۔ یہی مجاہدہ کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے سورہ حج میں ارشاد ہوا

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّنْهُ اِنَّكُمْ اَنرَاهِيمَ﴾ (حج۔ ۱۰)

اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت اس نے تم کو چنا ہے اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تگ نہیں کی تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔

”یہ اللہ میں محنت اور جہاد کرتا“ وہی جہاد اکبر ہے جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا۔ ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صیہ سے فرمایا کہ ﴿المحاهد من حاهد نفسه﴾ یعنی ”مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے“ صحیح مسلم میں ہے ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم پہلوان کس کو کہتے ہو؟ عرض کیا جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔ فرمایا نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ ۱۰ یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔

۲۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے۔ دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے۔ ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

﴿ اذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بَاتِّقَىٰ هِيَ احْسَنُ ﴾ (غل-۱۶)

تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر۔

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے۔ قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیمار یوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پروں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا تُطْعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ﴾ (فتح-۵)
تو کافروں کا کہاتہ مان اور بذریعہ قرآن کے تو ان سے جہاد کر، بڑا جہاد۔

”بذریعہ قرآن کے جہاد کر“ یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر ”بڑا جہاد“ اور بڑا زور کا مقابلہ فرمایا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن پاک کی نظر میں کتنی ہے؟ علماء نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کو جہاد کا مہتمم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابو بکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے ۳۱ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس

۱۔ بحوالہ کنز العمال، کتاب الایمان جلد ۳ صفحہ ۳۹۔

٢ صحیح مسلم باب من یملك نفسه عند الغضب جلد ٢ صفحہ ٢٩٦ مصر۔

۳ ادکام القرآن را در یک خط طبعی جلد ۳ صفحہ ۱۱۹۔

راہ میں صرف کرے اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں ان کو اس لیے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

جہاد بالمال:

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا نشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں اس لئے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے آنحضرت ﷺ کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں اور انہیں سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز و شاداب ہوا اور اسی لیے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے۔

﴿إِنَّ الدِّينَ أَمْوَالٌ وَهَاجِرُونَ وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (انفال-۱۰)

بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں بلکہ یہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہو گا جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو اور قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو مقدم بخش گیا ہے جیسے:

﴿أَنْصَرُوا حِمَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكَُمْ حَبِيرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (توبہ-۶)

بلکہ یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کو معلوم ہو۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (حجرات-۳)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کیا یہی سچے اترنے والے ہیں۔

﴿فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً﴾ (نساء-۱۳)

اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں۔

میدان جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لئے آسان

ہے جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آ جاتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست گرز طلبی سخن وریں است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے

(۴) جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے عورتیں حضور انور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے ارشاد ہوا کہ ”تمہارا جہاد نیک حج ہے“ لے کہ اس مقدس سفر کے لئے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟ عرض کی جی ہاں فرمایا ﴿فصیہما فحاہد﴾ تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو گے یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے ہاک ہونا بھی جہاد ہے آپ نے فرمایا: ﴿ان من اعظم الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر﴾ (ترمذی ابواب الفتن)

ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔

(۵) اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آ پڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے ایسے جان نثار اور جانناز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا وہ ہمیشہ کے لئے اس کو بخش دی جائے یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے اسی لئے ارشاد ہوا۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَنَحْنُ لَا نَشْعُرُونَ﴾ (بقہ ۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔

آل عمران میں ان جاننازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ (فرجین بما

اَنْهَمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ إِلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

هُمْ يَخْزَنُونُ) (آل عمران-۱۷)

جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی دی جا رہی

ہے خدا نے ان کو اپنی جو مہربانی عطا کی ہے اس پر وہ خوش ہیں اور جواب تک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں ان کو خوشخبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غم میں ہیں۔

ان جان نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں ”شہید“ ہے یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ جاوید ہیں
ہرگز نہ میرا آنکھ دلش زندہ شد عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلوں پر ابن میں قیامت کے دن انھیں گئے ملے اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے ﴿وَلْيَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ (آل عمران-۱۳) اسی کے ساتھ وہ جانیاز بھی جو گواہنا سر پہیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے لیکن ان کے سر کا بدیہ دربار الہی میں اس وقت اس سے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا وہ بھی اپنے حسن نیت کی بدولت رضا ہی کی سند پا میں گئے اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لئے ”غازی“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقتَلْ أَوْ يَمُوتْ يُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (سورہ-۱۰)

اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے پھر وہ یا مارا جاتا ہے یا وہ غائب آتا ہے تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔

﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَآخَرُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوْدُوا فِي سَبِيلِي وَقُتِلُوا أَوْ كَفَرُوا عَنْهُمْ سَيَاتُهُمْ وَلَا ذَحْلَهُمْ حَتَّى تَحْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (آل عمران-۲۰)

تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور ان کو جنت میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

ان آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیلات نہایت مؤثر الفاظ میں ہے اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جہد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان سب تاب نظر آتا ہے یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے ظاہر کی اور فرمایا کہ مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں مار کر دوں۔ لہذا ان فہروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے ان میں یہ نہیں ہے کہ میں ۱۰۰ سالے کو مار ڈالوں بلکہ یہ ہے حق کی راہ میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے اور پھر زندگی مارا جاؤں۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہرزماں از غیب جان دیگر است

دائمی جہاد:

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آ سکتا ہے اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، سید کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، ردِ ظلم اور احکام الہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورہ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں، آخری آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران - ۲۰)

اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہی وہ جہاد محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے۔



عبادات قلبی

یہ اسلام کی ان عبادات کا بیان تھا جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان میں بھی ہے، لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی حوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیک کا کام عبادت ہے، اس لئے تمام امور خیر خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہاء نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیہ نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہاء نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیہ نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فرائض کو بتانا ہے جن کی تاکید تو صیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تاکید تو صیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنج گانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، خلص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی سے ان کا نام ”قلبی عبادات“ رکھا جاسکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں، جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنج گانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسد بے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گو یہاں ہے محل ہے مگر رہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔

ہم اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لئے خلش ہو، یہ تقویٰ ہے اور پھر کام کو خدائے واحد کی رضا مندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ اخلاص ہے، پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ توکل ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یہ نتیجہ من سبب حل برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برانہ چاہا جائے، یہ صبر ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و رحم سمجھا جائے اور جسم و جان و زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انتہاک صرف کیا جائے، یہ شکر ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے۔



تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے:

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھ سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (بقرہ-۱)

یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشاء اسی تقویٰ کا حصول ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (بقرہ-۲۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا عبادت کرو تا کہ تم تقویٰ پاؤ۔

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (بقرہ-۱۸۳)

تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

حج کا منشاء بھی یہی ہے:

﴿وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (حج-۳)

اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَبْتَغِي اللَّهُ لِكُلِّ تَقْوًى مِنْكُمْ﴾ (حج-۵)

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہئے

﴿أَقِمْنَ أَسْوَاسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللَّهِ﴾ (توبہ-۱۳)

جس نے اس کی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی۔

﴿لَمَسْجِدَ أُتِّسَ عَلَى التَّقْوَى﴾ (توبہ-۱۳) ابستہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی۔

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى﴾ (بقرہ-۲۵)

اور سفر میں زور راہ لے کر چلو اور سب سے اچھا زاد راہ تقویٰ ہے۔

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے۔

﴿وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ﴾ (اعراف-۳)

اور تقویٰ کا لباس وہ سب سے اچھا ہے۔

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

﴿وَأَن تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (بقرہ-۳۱)

اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

﴿إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (مائدہ-۲)

انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

﴿وَإِن تَصْرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ غَرَمِ الْأُمُورِ﴾ (آل عمران-۱۹)

اور اگر صبر کرو اور تقویٰ کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔

﴿وَتَتَّقُوا وَتُصْبِحُوا بِإِثْنِ النَّاسِ﴾ (بقرہ-۲۸)

اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔

﴿وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾ (نساء-۱۹)

اور اگر اچھے کام کرو اور تقویٰ کرو تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں:

آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہیں تقویٰ والوں کا حصہ ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ﴾ (ادخان-۳)

بے شک تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ﴾ (طور-۱)

بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَعُيُونٍ﴾ (ذاریات-۱)

شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَنَهْرٍ﴾ (قمر-۱)

بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ﴾ (مرسلات-۱)

بلاشبہ تقویٰ والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّتِ النَّعِيمِ﴾ (ن-۲)

یقیناً تقویٰ والوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔

﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا﴾ (نبأ-۲)

بے شبہ تقویٰ والوں کے لئے کامیابی ہے۔

﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ﴾ (م-۳)

لاریب تقویٰ والوں کے لئے بازگشت کی اچھائی ہے۔

کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے:

گو بظہر ابتداء میں اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بناء پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہئے، حالانکہ جو جتنا دور بین ہے، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دور بین اور عاقبت اندیش وہ ہیں جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کے دائمی اور دیر پا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں، اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دنیا بھی ان کی بن جاتی ہے، اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انہیں کی قسمت میں ہوتی ہے، فرمایا

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (اعراف-۱۵)

اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

﴿إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (مود-۳)

بے شبہ انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

﴿وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (زخرف-۳)

اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى﴾ (طہ-۸)

اور انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں:

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے۔

﴿إِنَّ أَوْلِيَاءَهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ﴾ (انفال-۳)

تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں۔

﴿ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴾ (آل عمران-۸)

تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴾ (توبہ-۱۰)

اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ﴾ (جاثیہ-۲)

اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے۔

معیت الہی سے سرفراز ہیں:

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے۔

﴿ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴾ (بقرہ-۲۳)

اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے:

ایک کام ہزاروں اغراض اور سینکڑوں مقصد کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں فرمایا:

﴿ إِنَّمَا يَقْبَلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴾ (مائدہ-۵)

اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔

اسی لیے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقاء قیام اور ہر و عزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ والے کون ہیں؟

یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لیے ہیں یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورہ زمر میں ہے:

﴿ وَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدَقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۚ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ

جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴾ (زمر-۳)

اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا وہی لوگ ہیں تقویٰ والے ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ ہے جو وہ

چاہیں یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ فوری ثمرہ مال و دوست اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور

خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹتا نہیں چاہتا، لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورہ بقرہ میں ہے:

﴿وَلَكِنَّ الْإِنْسَانَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْأَنْفُسِ وَانْتِ الْمَالِ عَلَى حُبِّهِ
دَوَى الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينِ وَانْسِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامِ الصَّلَاةَ وَآتِ
الزَّكَاةَ وَالْمُؤَقُّونَ بَعْدَهُمْ إِذَا عَاهَدُوا - وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ
أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا - وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (بقرہ - ۱۷۷)

لیکن یہی ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور مانگنے والوں اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا اور نماز کو برپا کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور سختی، تکلیف اور نڈائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ٹھہرے اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟

تقویٰ اصل میں وقوی ہے عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

﴿وَمَنْ يُعْطِمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (ن - ۳)

اور جو شعائر الہی کی تعظیم کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے اور وہ سلیبی کیفیت (بجنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا اور شعائر الہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُعْصُونَ أَمْرًا مِنْهُمْ عِنْدَ رَسُولٍ اللَّهِ أُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ (حجرات - ۱)

ب شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

﴿فَالْتَمَسْنَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (الشعس۔۱)

تو ہر نفس میں اس کا فجو اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔

فجو تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل اصول ہے۔
وردونوں بندہ کو فطرتاً و بیعت میں اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے مگر بہر حال یہ دونوں الہام ربانی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے اس لیے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے صبیحہ نے کفار کے اشتعال دلائے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا:

﴿ادْجِعِ الَّذِينَ كَفَرُوا هِيَ قُلُوبُهُمُ الْحَمِيَّةُ حَمِيَّةٌ لِّجَاهِلِيَّةٍ فَأُنْزِلَ إِلَهُ سَكِينَةً عَلَى

رُسُلِهِ وَعَسَى أَنْتُمْ مِمَّنْ كَسَمَةِ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلُهَا﴾ (فتح۔۳)

اور جب کفار نے اپنے دلوں میں کج رکھی نادانی کی کجی تو اللہ نے اپنا جہنم اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔

یہاں جنگ و خونریزی سے استراحت خانہ کعبہ کے ادب اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبيت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا ہے ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفادہ عہد و رحتی اما مکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے۔

﴿وَتَمُوا إِلَيْهِمْ عَهْدُهُمْ إِيَّائِيْ مُدْتَمِرَةٌ إِنَّ اللَّهَ بَاحِثُ الْخَفِيَّاتِ﴾ (آہ۔۱)

تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿وَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آہ۔۲)

تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان سے ساتھ سیدھے رہو خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

جس طرح انسان کا فجو بری تعظیم بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے۔

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْهُمْ هُدًى وَاتَّاهُمُ تَقْوَاهُمْ﴾ (محمد۔۲)

جو لوگ راہ پر آئے خدا نے ان کی سوجھ اور بڑھائی اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کیا۔

اس سے عیاں ہے کہ ”تقویٰ“ ایک ایجابی و مثبتی کیفیت ہے جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر مزید دوست تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے ایک صحیح حدیث سے تصریح معلوم ہوتی ہے صبیحہ کے

مجمع میں ارشاد فرمایا:

﴿التقوى ههنا﴾ (مسلم)

تقویٰ یہاں ہے۔

اور یہ کہہ کر دس کی طرف اشارہ فرمایا جس سے بے شک و شبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے جو تمام نیکیوں کی محرک ہے اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا حاصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار:

اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعظیم محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، غرض نوع انسانی کے ان صدها خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو منہ کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے اور اس لیے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے چنانچہ قرآن پاک نے یہ آواز بلند یہ اعلان کیا:

﴿حَسْبُكُمْ شُعُونًا وَقَاتِلُ لِنَعَارِفُوا﴾ اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَىٰكُمْ ﴿(جرت ۲۰)

ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لیے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

اس اعلان کو آنحضرت ﷺ نے ان دو مختصر لفظوں میں دفرمایا: "سکرم" تقویٰ یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے اور اسی کے لیے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ "عربی و عجمی پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔"



دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں بڑے دن کے عذاب سے کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں اپنی اطاعت گزاری کو اس کے لیے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو۔

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾

اطاعت گزاری کو خدا کے لیے خالص کر کے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو اور ﴿إِلَّا اتَّبَعُوا وَجْهَ رَبِّهِ الْعَلِيِّ﴾ (یس۔۱) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں

﴿وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ - إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (شعرا۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۰)

اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا میری مزدوری تو اسی پر ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے۔

حضرت نوح کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

﴿يَقَوْمَ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا - إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (حود۔۳)

اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے۔

خود ہمارے رسول ﷺ کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا میں تم سے اپنے لیے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا اگر

چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لیے۔

﴿قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (سبا۔۶)

کہہ دے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لیے میری اجرت تو اللہ پر ہے وہ ہر بات پر گواہ ہے۔

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض اور صرف خدا کے لیے

ہے دوسری جگہ فرمایا:

﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ (شوری۔۳)

میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے اس کے لیے وہ تم سے کسی

ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو اور آپس میں

محبت رکھو۔

اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا﴾ (فلقان۔۵)

کہہ دے کہ میں تمہاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرنے نہیں اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض آنکھ و ارنیش تھا تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے رجائے گی اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدائی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو مقصود اس سے یہ ہے کہ نبی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بے خواہش ہو اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے باز تر ہو۔ یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہیں وعطا کرتی ہے جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ نبیوں نے اپنا کام نہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں اس کی وہ شکلیں پیدا ہوتی ہیں ایسا ہی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضاء کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے دوسری روحانی جس کا ہیوں ہمارے دل کے ارادہ و نیت اور کام کی اندرونی غرض و نیت سے تیار ہوتا ہے کام کی بجا اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے اسی سے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معادلات عبادت کا درجہ پاتے ہیں اس سے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر خیر خاص نہ غرض و نیت سے باز اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھیں تو رات اور قرات دونوں میں ہائیل اور قابیل آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیدوار کی قربانیاں پیش کیں خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرمادیا

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (مائدہ-۵)

خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں انہیں کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخش جاتا ہے ان کو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے ورنہ دنیا میں ان کو ہر عزیز کی ملتی ہے ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں لوگ ان کے ان کاموں سے سلا بعد نسل فیض یاب ہوتے ہیں اور ان کے لیے رحمت و دعا میں مانتے ہیں حضرت موسیٰ کے عہد میں فرعونوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا کہ ان دونوں سے انہوں نے عجیب و غریب امور کا یہاں مشاہدہ کیا خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجیب و غریب میں ظاہری نہیں باطنی صورت کا فرق ہے ایک کے کام کی غرض صرف تماشہ اور بازیگری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے اسی لیے یہ فیصلہ ہے کہ

﴿وَلَا يُفْلِحُ السَّاجِرُ حَيْثُ أَتَى﴾ (ط-۳)

اور جادوگر جہر سے بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔



توکل

﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ (آل عمران-۱۷)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اباہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا؟ کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش کا ترک بھی توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا نہ بدروا اُحد اور خندق و حنین میں سواروں، تیر اندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزمائوں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سننے کی حاجت ہوتی۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ اور اثر ہے بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا آل عمران میں ہے

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنَّ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ يُحْذِلْكُمْ فَمَنْ دَ الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (آل عمران-۱۷)

اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو پھر جب پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مدد کارآمد نہیں ہو سکتی اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔

منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا۔

﴿فَاعْبِرْ ضَعْفَهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۖ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا﴾ (نساء-۱۱)

تو ان منافقوں سے درگزر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا۔

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی غفلت کی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔

﴿وَإِذْ عَشِيرَتُكَ الْأَقْرَبِينَ ۖ وَاحْفَظْ حِمَاكَ لِمَنِ اتَّفَعْتَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ۖ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْغَرِيزِ الرَّحِيمِ ۖ أَلَدَىٰ بَرَكٍ حَيْثُ تَقُومُ ۖ وَتَقَلُّبُكَ فِي السَّجْدَيْنِ﴾ (شعراء-۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لیے اپنی (شفقت) کا بازو جمکا پھر اگر وہ تیرا کہنا نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے جب تو (رات کو) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔

دشمنوں کے زعم میں ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گزار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَنِيمًا حَكِيمًا ۚ وَأَسِعْ مَا يُوَلِّحِي الْبَلْكَ مِنْ رَمْتٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۚ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا﴾ (احزاب-۱)

اے پیغمبر خدا سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مان بے شک اللہ جاننے والا اور رحمت والا ہے اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے اس کے پیچھے چل بے شک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کام بنانے کو کافی ہے۔

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور مصالحت کر لو اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بد عہد کہیں دھوکا نہ دیں خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے فریب کا داؤ

کامیاب نہ ہوگا۔

﴿وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ﴾ (انسان-۹)

اور وہ صبح کے لیے جھپٹیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو چھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے اسی نے تجھ کو اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔ یہود جن کو اپنی دوست ثروت اور علم پر ناز تھا ان سے بھی بے خوف و خط ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لیے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے۔

﴿وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ﴾ (نمل-۶)

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اثر وہ باتیں ظاہر کرتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں اور بے شک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے بے شک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہی غالب اور جاننے والا ہے تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بے شک تو کھلے حق پر ہے۔

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں فرمایا۔

﴿وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ﴾ (فرقان-۵)

اور میں نے تو (سے رسول) تجھے خوشخبری سنائی دلا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے کہہ دے کہ میں تم سے اس کے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزاوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ مخالفین کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو جس کے سوا کوئی دوسرا بااختیار نہیں۔

﴿وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ﴾ (توبہ-۱۶)

تو اے یہ (مخالفین) کہانہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ بس ہے نہیں کوئی معبود لیکن وہی اسی پر میں نے بھروسہ کیا وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہئے اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے۔

﴿وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ وَنَجْعَلُكَ وَاعِدًا لِّمَنْ يُّدْعُوهُ ۚ﴾ (شوریہ-۲)

اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے وہی اللہ ہے میرا پروردگار اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو نہانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی دی جاتی ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پروا نہ کرو اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔

﴿كَذَلِكِ اَرْسَلْتُ فِيْ مُمَّةٍ قَدْ حُتْ مِنْ قُلُوبِهَا اَمَمٌ يَّتَّبِعُوْهُ عَسَیْ اَنْدِیْ اَوْ حَسْبُ اَنْبِیْثٍ وَهُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَّبِّیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ مَتَابٌ ﴿۱۰۰﴾﴾
 ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے ماننے سے انکار کرتے ہیں کہہ دے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پر اگندہ خاطر نہ ہونا چاہئے کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیے

﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اَمَّا بَہْ وَعِیْہِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْمَلُوْنَ مِنْهُ وَ هُوَ فِیْ صُلْبِ ثَمِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾﴾ (سب-۱۲)
 کہہ دے وہی رحم و دان ہے ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر بھروسہ کیا تو تم جان لو گے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔

جس طرح ہمارے رسول ﷺ کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، سختیوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اہل العزم رسولوں کی زبان سے عملاً اس تحیم کا اعلان ہوتا رہا ہے حضرت نوحؑ جب تنہا سا لہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے تو انہوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرما دیا

﴿وَ اَنْزِلْ عَلَیْہِمْ سَابُوحٌ ۚ اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ یَقُوْمُ اِنْ کَانَ عَنْکُمْ مَّقَامِیْ وَ تَذٰکِیْرٰی مٰیثَ اللّٰہِ فَعَلٰی اللّٰہِ تَوَكَّلْتُ فَاجْمَعُوْا اَمْرَکُمْ وَ شُرَکَآءَ کُمْ ثُمَّ لَا یُکُنْ اَمْرُکُمْ عَلَیْکُمْ عُمَّةٌ ثُمَّ اَقْضُوْا اِلَیَّ وَلَا تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ (یونس-۸)

(اے پیغمبر!) ان کو نوح کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم سے کہا اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تم پر شاق گذرتا ہے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کر لیا ہے تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب مضبوط کر لو پھر تم پر تمہاری تدبیر چھٹی نہ رہے پھر اس کو مجھ پر پورا کر لو اور مجھے مہلت نہ دو۔

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ دشمنوں کے ہر قسم کے مکر و فریب سازش اور بڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہیں حضرت ہودؑ کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے تو وہ جواب میں فرماتے ہیں:

﴿اِنِّیْ اَشْہَدُ اللّٰہَ وَ اَشْہَدُوْا اِنِّیْ سَرِیٌّ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۚ مِنْ دُوْہِ فَکِیْذُوْہِیْ جَمِیْعٌ ثُمَّ لَا تُنْظَرُوْنَ ۝۱۰۱﴾ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَ رَبِّکُمْ ۚ ﴿(ہود-۱۵)﴾

میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داد کر لو پھر مجھے مہلت نہ دو میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے بھروسہ کر لیا ہے۔

حضرت شعیبؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروا نہیں مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے وہ کروں گا میرا مکیہ خدا پر ہے۔

﴿إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴾ (حود-۸)
میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے کام سدھارنا چاہتا ہوں میری توفیق اللہ ہی سے ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ان پیغمبروں کی اس استقامت صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کی مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہئے۔

﴿قُلْ لِلدِّينِ لَا يُؤْمِنُونَ اَعْمُوا عَلٰی مَا كَانَتْكُمْ اِنَّا عَمِلُوْنَ ۙ وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۙ وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدُوْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (حود-۱۰)
کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو ہم بھی کرتے ہیں اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو ہم بھی کرتے ہیں اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے پھر اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ کرو۔

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پیروؤں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و اقارب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی۔

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسُوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرٰهٖمَ وَالدِّیْنِ مَعَهُ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءُ وَا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كُفْرًا بَّكُمْ وَبِدَا بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰی تُوْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ خُدَّہٗ اِلَّا قَوْلُ اِبْرٰهٖمَ لَا بَیْہٖ لَا اَسْتَغْفِرُ لَكَ وَ مَا اُعْبُدُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۚ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَیْكَ اَنْبَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ﴾ (ممتحنہ-۱)
تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لیے کھل گئی تب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ مگر ابراہیمؑ کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جاتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں لیکن فرط محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسفؑ کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہیں بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے ان تدبیروں سے اس کا حکم مل تھوڑا ہی سکتا ہے اس لیے بھروسہ تدبیر پر نہیں بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے:

﴿وَقَالَ یٰۤاِبْنٰی لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۚ وَ مَا اُعْیٰ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۚ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَیَّہٗ ۚ عَلَیْہٗ تَوَكَّلْتُ وَ عَلَیْہٗ فَلِیْتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ (یوسف-۸)
وہ فرماتا ہے کہ بیٹو! نہ ایک ہی دروازے سے اندر نہ جاؤ بلکہ متفرق دروازوں سے جاؤ اور اللہ نے تم سے کچھ چھپایا ہے اس کا حکم اللہ ہی کے پاس ہے اور تم اللہ ہی پر توکل کرو اور اللہ ہی پر توکل کرنے والے متوکل ہوں۔

اور (یعقوب نے) کہا 'اے میرے بیٹا! ایک دروازہ سے نہ جانا بلکہ الگ دروازوں سے جانا اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا' فیصلہ اسی کا ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر چاہئے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔

حضرت یعقوبؑ کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیر شان توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیبؑ کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

﴿قَدْ افْتَرَيْتَ عَلَيَّ الْبُذُخَ كَذَبًا اِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ تَعْدُوْا نَحْنُ وَاللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّعُوْذَ فِيْهَا اِلَّا اِنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَنِ اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ ۚ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ﴾ (اعراف-۱۱)

اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آ جائیں جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا اور یہ ہم سے نہیں ہو سکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے ہم نے خدا پر بھروسہ کیا 'اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا فیصلہ کر دے اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی

تعلیم دی فرمایا:

﴿يَقُوْمُ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ﴾ (یونس-۸)

اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لا چکے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم فرمانبردار ہو۔

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا

﴿عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِتْنَةً لِّقَوْمِ الطّٰمِيْنَ﴾ (یونس-۹)

ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لیے آزمائش نہ بنا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں

سے جس طرح سرفراز کیا اس سے ہر شخص واقف ہے یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ (طلاق-۱)

جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور

دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا اور ہم کہاں سے

کھائیں گے؟

ع خدا خود میرا سامان است اور باب توکل را

تو کل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں نہ ایک پر غوری نظر دئے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے جہنم موانع کی نثر اور پرزور محققوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استقامت و عزم و استقامت کے ساتھ اپنے کام میں تھے رد کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ تہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں اونٹ و یونکی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا یا اس کو باندھ کر ارشاد ہوا اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو۔ اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے۔

ع بر توکل زانوے اشتہ بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین فشا کے مطابق ہے بعض لوگ تعویذ گنڈا غیر شرعی کے جھاز پھونک ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدابیر توان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار شخص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے جو بد شگونی کے قائل نہیں جو مانع نہیں کرتے باندھنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو دعوت و تعویذ گنڈا کرتے ہیں وہ توکل سے محروم ہیں۔ اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں بلکہ جہالت و ہاس کی غنائی ہے ایب اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اُرتم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو میر ہو کر واپس آتے ہیں"۔ اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بندھ کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے بندگان کو بھی از سر سمیتوں و باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا

۱۔ یہ حدیث مفقود ہے۔ ترمذی (آخر باب قیمت ستر ۴۱۲) میں شعب ابی ثعلبہ میں یہ بھی خطیب کی روایت کا ایک اور متن ہے (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۳۰ میر آقا)۔

۲۔ شرعی حقائق میں حدیث سے احادیث میں اس سے کیا ہے کہ اس سے تہذیب حاصل ہے۔ ترمذی میں میں ان کا یہ سوال کر عینا یا جس قبو کے ساتھ احد او میں ان کو لکھنا ثابت نہیں۔

۳۔ ابن ماجہ باب من مرق و کتاب الرقاق فتح مسم کتاب ایمان جاہلیت میں اشیاء یوم کا حلق آگ سے الگ کر دینے

۴۔ باتع مدنی ترمذی میں جامع ترمذی باب الزہد صفحہ ۳۸۸ و حاکم۔

ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ:

﴿وَمَا مِنْ ذَاتَةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ (ہود۔۱)

زمین میں کوئی ریگنے والا نہیں لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔

تو وہ اس کے لیے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ ان کو دل تنگی اور مایوسی ہو کرتی بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (طہ۔۱)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے وہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس بنے بے شک اللہ اپنے راہ کو پہنچ کر رہتا ہے اس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے اسی سے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں ”خود اعتمادی“ کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پیدا جاتا ہے لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں اس لیے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے ”خدا اعتمادی“ کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔



صبر

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (احقاف-۴)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ ان کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے، اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکتا ہیں، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی:

”صبر“ کے لغوی معنی ”روکنے“ اور ”سہارنے“ کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیار کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی اور اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں، حضرت موسیٰ اور حضرت کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضر کہتے ہیں:

﴿أَنْتَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾، وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿ (صافات-۹)

تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو جس کا علم تمہیں نہیں۔

حضرت موسیٰ جواب میں فرماتے ہیں:

﴿سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا﴾ (صافات-۹)

اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا

پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھنے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو

اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

﴿إِنْ كَادَ لَيُصِصَّا عَنْ الْهَنَاءِ لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا﴾ (ذوق-۲۰)

یہ شخص (پیغمبری کا دعویٰ) تو ہم کو اپنے خداؤں (بتوں) سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم ان پر صابر (ثابت) نہ رہتے۔

﴿وَبَوَّاهُمْ صَبْرًا حَتَّىٰ نَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (حجرات-۱)

اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لیے بہتر

ہوتا۔

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گویا حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں

تفاوت و فرق پیدا ہو گیا ہے، بایں ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن

میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

وقت مناسب کا انتظار کرنا:

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا آنحضرت ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی اور اس وقت تسل کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں خدا آپ کا نگہبان ہے خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (طور-۲)

(اے رسول) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

﴿فَاصْبِرْ وَأَنْتَ يَاحْتَىٰ يَحْكُمُ اللَّهُ بَيْنَنَا﴾ (اعراف-۱۱)

تو ثابت قدم رہ کر منتظر ہو یہاں تک کہ خدا ہر رے درمیان فیصلہ کر دے۔

﴿وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ﴾ (یونس-۱۱)

اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (حود-۳)

ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ بے شبہ آخر کار کامیابی پر ہیزگاروں ہی کی ہے۔

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈمگاری ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری توقع رکھنی چاہئے۔

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ﴾ (روم-۶، مومن ۸۰)

ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ وعدہ الہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو اور باطل کے گروہ میں

مل جاؤ:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطِعْ مِنْهُمْ ابْتِغَاءَ كُفُورًا﴾ (دھر-۲)

اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ اور ان (مخالفتین میں) سے کسی گنہگار یا کافر کا کہا نہ مان لے۔

آنحضرت کو حضرت یونس کا قصہ سنایا گیا کہ ان کو خیال ہوا کہ ان کی نافرمان قوم پر عذاب آنے میں تاخیر ہو۔

رہی ہے اس لیے وہ بھاگ کھڑے ہوئے حالانکہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی اس لیے وہ عذاب اس سے ٹل گیا

تھا ارشاد ہوا کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے۔

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ﴾ (۲-۱)
اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کرنا اور پھسلنے والے (یونس) کی طرح نہ ہو۔

بیقرار نہ ہونا:

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی:

﴿وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ﴾ (ج-۵)

اور جو مصیبت میں صبر کریں۔

حضرت یعقوبؑ بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھینڑی نے حضرت یوسفؑ کو کھالیا فرماتے ہیں:

﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبِرْ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ﴾ (یوسف-۲)

بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لیے جانے کا حال سن کر کہتے ہیں:

﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبِرْ جَمِيلٌ عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا﴾ (یوسف-۱۰)

بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے تو بہتر صبر ہے عنقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔

حضرت ایوبؑ نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا اس کی مدح

خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی

﴿إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (ص-۳)

ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا کیسا اچھا بندہ وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔

حضرت اسماعیلؑ اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں

﴿يَا سَتِ اَعْمَلُ مَا تُؤْمَرُ سَتَحْدِثِي اِنْشَاءَ اللّٰهِ مِنَ الضَّرِيْنِ﴾ (صافات-۳)

اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گزرا خدا نے چاہا تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا:

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور

مخالفین جو طعن و طنز کریں ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور

زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انہوں نے

استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے آنحضرت ﷺ کو اسی لیے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور

دعوت کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ..... وَلَئِنَّكَ فَاضِرٌ﴾ (مثر-۱)

اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر..... اور اپنے پروردگار کے لیے پامردی (صبر) کر۔
اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا۔

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ﴾ (تحف-۳)

(اے محمد ﷺ!) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں نے کی اور ان (مخالفوں) کے لیے جلدی نہ کر۔

حضرت لقمان کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر۔

﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (لقمان-۶)

نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے اس کو برداشت کر یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔
کفار عذاب الہی کے جلد نہ آنے یا حق کی ظاہری بے بسی کے سبب سے آنحضرت ﷺ کو اپنے دل و زطعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروا نہ کر اور نہ ان سے دل کو اداس کر بلکہ اپنے دھن میں لگا رہو اور دیکھو کہ تمھارے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا۔

﴿إِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَادْخُرْ عَبْدًا ذَاوُدَ﴾ (مر-۲)

ان کے کئے پر صبر کر اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر۔

اس قوت صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے

﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ﴾ (طہ-۸ و ۹)

تو ان کے کہنے پر صبر کر اور صبح شام اپنے پروردگار کی حمد کر۔

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن و طنز کا دھیان نہ کیا جائے بلکہ اس کے جواب میں اُن سے لطف و مروت برتا جائے فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا﴾ (زل-۱)

تو ان کے کئے پر صبر کر اور ان سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔

در گذر کرنا:

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔ قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ﴾ (و صبر و ما

صَبْرُكَ إِلَّا بِأَلَنَةٍ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٦﴾ (نحل-۱۶)

اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کرو اور تیرا صبر کرنا نہیں لیکن خدا کی مدد سے اور ان کا غم نہ کرو اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو بلکہ صرف خدا کے لیے ہو۔

﴿وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِعَاءً وَجْهَ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٣٠﴾﴾ (زمر-۳۰)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔
فرشتے ان کو مبارکباد دیں گے اور کہیں گے:

﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٣١﴾﴾ (زمر-۳۱)

تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے کہ اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے صبر نماز خیرات برائی کی جگہ بھلائی مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے کیونکہ یہی اصل ہے جس میں یہ جو ہر ہو گا وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا مصیبتوں کو بھی جھیلے گا اور دشمنوں کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دے گا چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ درگزر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی جس میں صبر ہوگا۔

﴿وَلَا تَسْتَوِ الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ إِحْسَرُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ

كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۚ وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٥١﴾﴾ (صمت-۵۱)

بھلائی اور برائی برابر نہیں برائی کا جواب اچھائی سے دو تو یکبارگی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ قریبی دوست سا ہو جائے گا اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں ان پر خدا کا عذاب ہوگا اس لیے ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے اور معاف کر دے فرمایا:

﴿أَمَّا السَّبِيلُ فَعَلَى الَّذِينَ يَظْلُمُونَ النَّاسَ وَيَتَعَوَّنَ فِي الْأَرْضِ سَبِيلُ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ

عَذَابَاتُ الْيَمِّ ۚ وَلَمَنْ صَبَرَ وَعَمِلَ ذَلِيلًا لِّمَنْ غَرَمَ الْأُمُورَ ﴿٣٢﴾﴾ (شوری-۳۲)

راستہ انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے پروردگار عذاب

ہے اور البتہ جس نے برداشت کیا اور بخش دیا بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

ثابت قدمی:

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آ جانے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے صادق القول اور مستباز شہر ایا ہے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا فرمایا

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (بقرہ - ۲۳)

اور صبر کرنے والے ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت وہی ہیں جو سچ ہوئے اور وہی پرہیزگار ہیں۔

اگر لڑائی آپڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں خدا کی یاد امام وقت کی اطاعت آپس میں اتحاد و موافقت اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (انفال - ۶)

اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تم ست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر دکھاؤ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جانثاروں کو سکھادیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ خَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۖ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝ الَّذِينَ حَقَّقَ اللَّهُ عُنُكُهُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (انفال - ۹)

اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھرا، اگر یہ بیس صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے تو اگر سو صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے اور اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے۔

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کریں اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

﴿قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلْكُوا اللَّهَ كَمِ مِّنْ فِتْنَةٍ قَبِيلَةٍ غَنَبَتْ فِتْنَةٌ كَثِيرَةٌ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (بقرہ - ۳۳)

طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے منا ہے یہ کہا کہ بس اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر و ثبات دکھانے والوں کے ساتھ ہے اور جب یہ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ میں آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر بھرا اور ہم کو ثابت قدمی بخش اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر۔ اللہ نے کمزور اور قلیل العدد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتا دیا کہ خدا انہیں کا ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنَّا بَعْدَ مَا قُتِلُوا أَنَّهُمْ جَاهِدُوا وَصَبَرُوا﴾ (نحل - ۱۱۳)

پھر تیرا پروردگار ان کے لیے ہے جنہوں نے ایذا پانے کے بعد گمراہ چھوڑا پھر لڑتے رہے اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے۔

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لیے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آ پڑا تو حضرت موسیٰ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا:

﴿قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (اعراف - ۱۵)

موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر و استقامت سے کام لو بے شک زمین خدا کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بناتا ہے اور انجام پر میز کاروں کے لیے ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہو گئیں اور کثیر العدد دشمنوں کے زرعہ میں پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے فرمایا:

﴿وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا وَتَمَثَّلَ لِكَبَلَةِ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ

وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿١٦﴾ (اعراف-۱۶)

اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کی وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لیے سر بلند ہوئی کہ اس نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يُهْدُونَ بِلِئَالِيهِمْ صَبْرُؤُا وَكَانُوا يُؤْفَكُونَ﴾ (سجده-۳)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے جب انہوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گزشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں ایک احکام الہی پر یقین اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثبات قدم یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا یقین اور پھر ان اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی بلکہ ستر مسلمان خاک و خون میں تھمز کر راہ خدا میں جانیں دیتے ہیں بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی زوہداد ان کو سناتا ہے۔

﴿وَكَابُنَ مِنْ نَبِيِّ قَاتِلٍ مَعَهُ رَيْثُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا

وَمَا اسْتَكْبَرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا

وَاسْرَافْنَا ۚ أَمْرًا وَتَكُنْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (آل عمران-۱۵)

اور کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل ہودے ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ بھی کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گنہگاروں کو اور کام میں ہماری زیادتی کو معاف کر اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے اُن توہر توہر کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری ہے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبورانہ درگزر کا نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت و ہمت کی بلندی عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آ جانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گزشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کو

دو باتوں کی تاکید فرمائی ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا۔
 دنیا کی فتح یابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے انہیں کے حصہ میں ہے جن کو یہ پامردی دل کی مضبوطی اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿ اِمَّ حَسْبُكُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْحِجَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمِ الضَّٰعِيْنَ ﴾ (آل عمران - ۱۳)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے (آزمائے) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔

ضبط نفس:

اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے مگر یہی نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کیرسز کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت تو ام ہیں ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو اور غم و تکلیف میں وہ ادا اس اور بدول نہ ہو دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے انسانی فطرت کے راز دار کا کہنا ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَدْقَا الْاِنْسَانَ مَسَارِحُهُ ثُمَّ رَغْنَهَا مِنْهُ اِنَّهُ لَيَبْغُورُ ۝ وَلَئِنْ اَدْقَا نَعْمَاءَ بَعْدَ صِرَآءٍ مَّسَّتْهُ لَيَكْفُرُ ۝ ذَهَبَ الشَّيْثُ عَنِّي اِنَّهُ لَمَرْخٌ فَحُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرٌ كَبِيْرٌ ﴾ (حدود - ۲)

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں بے شک وہ شاداں اور نازاں ہے لیکن وہ جنہوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کئے یہ لوگ ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا:

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی سے بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے اسی لیے مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گذرتے ہیں عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے اسی لیے حکم ہوا:

﴿ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ عِبَادَتَهُ ﴾ (مریم - ۴)
 آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے سب کا تو اس کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ
 (مبرک)

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے۔

﴿ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (طہ - ۸)

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اس پر قائم رہ۔

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے وہ لوگ جو خدا کے سامنے صبری کے دن سے ڈرا کرتے

تھے اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری سناتا ہے:

﴿ فَوْقَهُمْ الْوَعْدُ الَّذِي لَهُمْ فِيهِمْ نَصْرٌ وَمِنْهُمْ نَجْرٌ ۚ وَجَسَدًا لَهُمْ صُورًا جَنَّةً

وَحَرِيرًا ﴾ (دھر - ۱)

تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچالیا اور ان کو تر و تازگی و شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکام
 الہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں ایمان لائیں نیک کام کریں فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں

بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں اور خدا کی باتوں کو سن کر

اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ

اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سناتا ہے:

﴿ أُولَٰئِكَ يُحْزَنُونَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا ﴾ (فرقان - ۶)

ان کو بہشت کا جہر کہ بدلہ میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر خلاف طبع اور تکلیف و مشقت ہونے

کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے بچتے

رہے راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سر بسجود ہوتا صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دو گانہ ادا

کرنا الوان نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچی

سے باز نہ آنا قبول حق کی راہ میں شہداء کو آرام و راحت جان کر جھیل لینا سود کی دولت سے ہاتھ اٹھا لینا حسن و جمال

کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائیداری صبر کی

بہت ہی نثری منزل ہے اور اسی لیے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیات پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿ حُحِشْتُ (حُفَّت) الْحَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُجِجْتُ (حُفَّت) لِمَا رَأَى الشَّهَوَاتِ ﴾ (صحیح بخاری تباریت و ترقی)

مسلم کتاب الجہاد

جنت ناخوشی کے کاموں اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانی گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے اس وقت دنیا میں بڑے بڑے لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں اور اس عارضی دہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکام انہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے کسی قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھرا آئے اور اس وقت بھی مال حرام کی کثرت کے رائج کے بجائے مال حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کر لئے تو یہ بڑی قوت کا کام ہے جو صرف صابروں کو ملتی ہے

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جو قارون تھا اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے لیکن جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا ان کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آتی جانی چیز کے دن کی ہے خدا کی وہ دولت جو تینو کاروں کو بہشت میں ملے گی وہ لازوال غیر فانی اور جاودانی ہے۔

﴿قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يَبِئْسَ لِمَثُلٍ مَاؤُنِيَ قَارُوْنُ اِنَّهُ لَذُوْ حَيْطٍ عَظِيْمٍۭۙ وَّ قَالَ الَّذِينَ اٰتَوْا الْعَنَمَ وَبَسَكُمۡ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا وَّ لَا يُفْقَهَاۙ اِلَّا الصَّبْرُ وَاُوْنُ﴾ (قصص-۸)

جو لوگ حیات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنہیں علم ملا تھا انہوں نے کہا تمہارا ثواب ہے اللہ کی جزا ان کے لیے جو ایمان لایا اور نیک کام کیے سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پاسکتے ہیں جو صابر ہیں۔

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے۔

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَّلَنُخْرِیْنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوْۤا اٰخِرُھُمْ بِاٰخِسِّنۡ مَا كَانُوْۤا یَعْمَلُوْنَ﴾ (نحل-۱۳)

جو تمہارے پاس ہے وہ چمک جائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جائے والا ہے اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے اس کے بعد ہے:

﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اِجْرَ الْمُحْسِنِ﴾ (حجۃ-۱۰)

اور صبر کر کہ بے شبہ اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

صبر کے فضائل اور انعامات:

یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی۔

﴿إِنَّمَا يُوفَى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (زمر-۲۰)
صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔

جن محاسن اور محامد صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے۔

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (احزاب-۵)

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا کے سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں اللہ نے ان کے لیے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اس کے معاوضہ میں ملتی ہے یہی بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے۔

﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّا أَمْنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ﴾ (آل عمران-۳)
(جنت اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لا چکے ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گنائے ہیں جس میں پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے دوسرا راستی اور راست بازی کا تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا اور چوتھا راہ خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتح مشکلات کی کنجی صبر و دعا:

بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے دعا اور صبر اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں یہود جو آنحضرت ﷺ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے اس کے دو سبب تھے ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں یہ بیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا۔

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (بقرہ-۵)

اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لیے اخلاص کی ترازو میں تلخے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ وَلَنَسْلُوَنَكُمْ بَشِيرًا مِّنَ الْخَوْفِ وَالْحُجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۚ وَالصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَأَنَا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ (بقرہ-۱۹)

اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو بے شک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور بھوک اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائیں گے اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوشخبری سناؤ جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے یہ لوگ ہیں ان پر ان کے پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر۔

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر ضبط نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو اٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہئے اگر اس راہ میں موت بھی آجائے تو وہ حیات جاوید کی بشارت ہی ہے۔



شکر

﴿وَكَفَىٰ مِنَ الشَّاكِرِينَ﴾ (اعراف-۱۷)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ”جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تردد تازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے“۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرنے پر قدر شناسی تمین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے، یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو۔ زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹ کفر ہے۔ اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں اسی سے ہماری زبان میں ”کفرانِ نعمت“ کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے۔ جس کے مرتکب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصیت ہے اس کے بالقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالقابل بولے گئے ہیں۔

﴿إِنَّا هَذِيئَةُ السَّبِيلِ إِنَّمَا شَاكِرًا وَأَمَّا كَفُورًا﴾ (احزاب-۱)

ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا (اب وہ) یا شکر گزار (شاکر) ہو یا ناشکر (کافر) ہو گیا۔

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ (ابراہیم-۱۲)

اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی تاقدیری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے۔

﴿إِنْ أَرَاهُمْ كَانُ أُمَّةٍ فَاِنَّا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ شاکراً لِنِعْمِهِ - اِحْتِنَا

﴿وَهَذَا إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (نحل-۱۶)

در اصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اس کو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ

تھا۔ اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکر گزار اللہ نے اس کو جن لیا اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکر گزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے احکام الہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ دین کی اصل اور اطاعت الہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قوی و عملی اظہار کا نام شکر ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَدَاكُمُ إِن شَكَرْتُمْ وَامْتَنَمُ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴾ (نہ-۲۱)

اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے۔ شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے۔ ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے۔ دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے۔ صاحب علم اپنے علم سے بندگان الہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔ الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے تو یہ کہا۔

﴿ وَلَا تَعِدُ أَكْثَرُهُمْ شَاكِرِينَ ﴾ (اعراف-۲)

تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

﴿ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ﴾ (آل عمران-۱۵)

اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے۔

﴿ بَلِ اللَّهُ فَاعِلٌ وَتَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴾ (زمر-۶)

بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گزاروں میں سے ہو۔

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہیں زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے۔ جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمد الہی میں اللہ تعالیٰ کے ان صفات کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں اور اسی لیے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورہ فاتحہ ہے سورہ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورہ فاتحہ سے اور سورہ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے۔

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (فتح-۱)

سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں سب کی پرورش اور زندگی اور بقا اسی ایک کام ہے اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں اور نکھر رہے ہیں اس لیے حمد اسی ایک کی ہے یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے لیکن دنیا جب اپنی تمام منازل حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا۔ یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں جا چکیں گے وہ وہ وقت ہو گا جب دنیا اپنے اس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی جس کے لیے خدا نے اس کو بنایا تھا۔ اس وقت عالم امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی۔

﴿وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (زمر-۸)

سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے۔

﴿لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (روم-۲)

اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ (نور-۱)

جو عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے چاروں طرف ہیں وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اسی کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے۔

﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ (نہی اسرائیل-۵)

اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے۔

﴿سُبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ (جزء مومن طوزقان)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

آنحضرت ﷺ کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں۔ مثلاً کھانا

کھانے کی نئے کپڑے پہننے کی سونے کی سوکر جاگنے کی نئے پھل کھانے کی مسجد میں جانے کی طہارت خانہ سے نکلنے کی وغیرہ وغیرہ ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکر یہ ادا کرنا ہے لیکن زبان کا یہ شکر یہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں ان کا شکر یہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں

کی تعمیل میں لگا رکھیں اور ان سے ان کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جز سے محروم ہیں مثلاً جو پا بج اور معذور ہوں بیمار ہوں کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکر یہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں ان کو اس سے حصہ دیا جائے۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے پیاسوں کو پانی پلایا جائے۔ ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الہی کا مطالبہ کیا گیا ہے اس لیے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے۔

﴿تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا ۝ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ حُلُفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا﴾ (فرقان- ۶)

بڑی برکت اس کی ہے جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالہ کرنے والا چاند رکھا اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے۔

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے۔ یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرق ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے۔

﴿...الرَّحِيمُ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ (عبودہ- ۱)

بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی پھر اس کی اولاد کو بے قدر بنچڑے ہوئے پانی سے بنایا پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تم کم شکر کرتے ہو۔

﴿وَاللَّهُ أَعْرَضَكُمْ عَنْ أَنْتُمْ أَنْ تَعْلَمُوا شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (نحل- ۱۱)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے۔ یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنادیا۔ وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اس میں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں بعض آیتوں میں ہے۔

﴿فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعَمُوا الْأَنْفَاعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (ج- ۱۵)

تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہے اسی

طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیئے ہیں تاکہ تم شکر کرو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ﴾ (بقرہ-۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں کھاؤ اور خدا کا شکر کرو۔

﴿فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ آيَاهُ تَعْبُدُونَ﴾ (نحل-۱۵)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس

کے ساتھ کریں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جاسکتا اس تیسری قسم کے

شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو۔ اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ

کریں۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے۔

﴿وَأَحْسِنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ (قصص-۸)

اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔

اسی کا نام خدا کو قرض دینا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرض دے خدا کو قرض دینا

یہی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کو یا قابل ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے ارشاد ہوتا ہے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (حدید-۲)

کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔

﴿وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (حدید-۲، زل-۲)

اور خدا کو قرض حسد دو۔

﴿إِنْ تَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (تھاہن-۲)

اگر خدا کو قرض حسد دو گے۔

خدا کو قرض حسد دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا۔

”اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو! تو جہان کا

پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا کہ تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی پرسش نہ کی اور

اگر کرتا تو! تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہیں کھلایا،

بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار تو! تو سارے جہان کا رب ہے میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا تجھے معلوم نہ ہوا کہ

میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم

کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو! تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو! تو سارے عالم کا

پروردگار ہے میں تجھے کیسے پانی پلاتا، فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو نہیں پلایا، اگر تو اس کو

پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکر یہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیوں کراتا رہنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تلقین فرمائی ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی۔ جو کچھ مل اس کے فضل و کرم سے ملا اور جو کچھ ملے گا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی۔ انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں دیکھ کر اور ان کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں۔ بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے جس کے شکر یہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر خوب سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونٹیلیں نکلتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوا دیا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے تاکہ ربوبیت الہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بار آور بنائے۔

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے یہ ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ قارون نے کہا تھا یہی غرور ہے جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ارشاد ہوا۔

﴿وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُم وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُتَخَبِّلٍ فَخُورٍ﴾ الَّذِينَ يَنْحَنُونَ وَيَأْمُرُونَ
النَّاسَ دَسْخُلٍ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿۳﴾ (حدید-۳)

(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا اس پر اتر و نہیں اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا جو خود کنجوس ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن و خوبی) سے مالا مال ہے۔

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے کہ وہ تو غنی ہے اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے۔

خدا نے انسانوں پر جو تو برتو نعمتیں اتاری ہیں اور اپنی لگا تار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے اس کے مرتبہ کو جانے اس کے حق کو مانے اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے۔

﴿وَرَفَعْنَا لَكُمْ ذِكْرَكَ وَاللَّهُ عَلِيمٌ غَذِيرٌ﴾ (۳-۷۷)
اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دی تاکہ تم شکر کرو۔

﴿وَهُوَ الْبَدِيُّ سَحَرُ السَّحَرِ لَنَأْكُلَنَّ مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَنُسْتَحْرِحُوا مِنْهُ حَلِيَّةً تَنْسُونَهَا وَتَرَى

الْفُلْتُ مَوَاحِرُ فِيهِ وَلِتَسْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢﴾ (نہ-۲)
اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو
جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور تاکہ تم خدا کی
مہربانی ڈھونڈو اور تاکہ تم شکر کرو۔

﴿وَكَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥﴾ (ج-۵)
اور اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو۔
﴿وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَسْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ﴿٦﴾ (نفس-۶)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے
فضل و کرم کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشأ یہ ہے
کہ بندہ اپنے آقا کو پیچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦﴾ (یونس-۶)
اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے لیکن ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں۔
﴿وَبَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَغَاشٍ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿١﴾ (اعراف-۱)
اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی اور اس میں تمہارے لیے بس اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے تم بہت کم شکر
کرتے ہو۔

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر بڑی محبت غضب کا اظہار بھی فرمایا۔

﴿فَقَتَلَ الْإِنْسَانَ مَا أَكْفَرَهُ ﴿١﴾ (جس-۱)

مارے جائیو انسان کتنا بڑا ناشکر ہے۔

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا تو مالک کا
شکر ادا ہو گیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے
محبت رکھتے ہیں ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لیے سراپا سپاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں
کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں اور اس کی فرمائیشوں کو پورا کرتے رہیں اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں لیکن دل میں
احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو اور اس اثر کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسان مندی
کے اظہار میں جھوٹے ہیں اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو
اپنے پے در پے احسانات سے جس طرح نوازا اس کے بیان کرنے کے بعد ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے۔

﴿اَعْمَلُوا الْاٰلَ دَاوُدَ شُكْرًا ﴿٢﴾ (سبا-۲)

اے داؤد کے گھر والو شکر ادا کرنے کے لیے نیک عمل کرو۔

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔ اسی لیے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہیں۔

﴿رَبِّ اَوْرِغْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ﴾ (نمل-۲)

اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو۔

اس دعا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شکر میں شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور من سب نیک عمل بھی ہو۔ دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے میں ان کے لیے اپنے نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لیے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے اس کی طرف سے شکراۃ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو کوئی نئی نعمتیں اور عنایت ہوتی جاتی ہیں اسی لیے فرمایا۔

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ (ابراہیم-۲)

اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔

﴿كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ﴾ (قمر-۲)

ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔

﴿وَسَنَجْزِي الشَّكْرِيْنَ﴾ (آل عمران-۱۵)

اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے لیے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کرے گا اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کرے گا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے خود آپس میں ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری کا معیار مقرر فرمایا ہے ارشاد ہوا۔

﴿مَنْ لَا يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ﴾ (ترمذی کتاب البر والصدقہ)

یعنی جو انسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا۔

اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکر یہ ادا نہ کرے گا تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکر یہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہو گئی، ان صفحات میں آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں ان تعلیمات کے ایک ایک آیت حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزء ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی۔ عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے وہ کتنے مکمل اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ ﷺ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپ ﷺ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے۔ عملاً صاف واضح اور متعین ہے اور زمانہ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے۔ اس لیے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔

﴿ صَلَّوْا۟ لِلّٰہِ عَلَیْہِ وَبَرَکَاتُہٗ ﴾

مغفرت کا طلبگار

سید سلیمان ندوی

۱۲ جمادی الثانیہ ۱۳۵۴ھ

حصه ششم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الحمد لله الذي أنزل الكتاب والحكمة والصلوة والسلام على رسوله سي الرحمة﴾
وعلى آله واصحابه أولى العزم والهمة

اے تو ہمیں صفت سزاوار	نام تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ زنج خانہ راز	بر آدمیاں در خن باز
عالم ز تو شد حکمت آباد	حکمت ز تو یافت آدمی زاد

☆☆☆☆☆☆

در قربت حضرت مقدس	غیر پاک، رہبرم بس
گنجینہ کیمیاے عالم	پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بر سر پادشاہی	توقع سپیدی و سیاہی (خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے عوام کے اس وہم کو دور اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاق حسنہ ”اسمائے حسنی“ کا پرتو ہیں بار بار اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق خالق کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے منسوب ہوتی ہے اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں جیسے اللہ کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر اللہ کی اس صفت علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں حالانکہ حقیقی صفت علم اللہ میں ہے بندہ میں نہیں لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفت علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے اس لیے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے اسی لیے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک اشتراک بادیٰ مناسبت ہے اور بس ﴿تیس کعثنہ شیء، وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (۲ ی ۲)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آ گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور

حضرت عیسیٰ علیہا السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں یا ان کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور نہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم بہ امتراض سے بلند اور ہر خرد گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو زبانی تعلیم آئی وہ اس کے لیے بالکل مناسب تھی یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لیے تکمیل فرمادی گئی۔

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آگئے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے اس لیے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھ نہیں گیا ہے ایسے موقع پر اگر شک و شبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر روشنی کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گئی ہیں۔ پھر حقوق فضائل رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں جن کو میں نے گھٹ بڑھا کر شامل کر لیا ہے۔ موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار ہوں۔

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح و حکم کی تشریح میں اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا۔ سہو و خطا انسان کی فطرت ہے پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلہ سیرت کے بانی حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزاء پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں (رحمہ اللہ تعالیٰ)

وہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور اپنا ملے ملت میں اس آئینہ محمدی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی ترمیم و آرائش کا ذوق پیدا کرے۔ اور وہ سمجھیں کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق و عادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

(۴ رذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿لِحَمْدِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةِ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَنْ أَيْمَنِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ﴾

تعلیمات نبوی کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے اس کے اپنے ماں باپ اہل و عیال عزیز و رشتہ دار دوست و احباب سب سے تعلقات ہیں بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ وطن قومیت جنسیت یا اور کسی نوع کا ملکہ رکھتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی خوشحالی اور امن و امان اسی اخلاق کی دولت سے ہے اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستے سے ہٹنے نہ دے دنیا کے سارے مذہبوں نے کم و بیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔



اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے چنانچہ اس عرصہ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی اور چوری بدی ہے، لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿نُعِثُ لَا تَعْمُ حُسْنُ الْأَخْلَاقِ﴾ (موحاکمہ حسن خلق)

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

یہ امام مالک کی موحاک کی روایت ہے مسند احمد، بیہقی اور ابن سعدؒ وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں آپ ﷺ نے فرمایا۔

﴿إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ﴾ ۱

میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آ کر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے۔

﴿رَأَيْتُهُ يَأْمُرُ بِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ﴾

میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

جسٹ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

”اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست زبردستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا، اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عقیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں“ ۲

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے آنحضرت ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا، اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ اللہ کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ”وہ پاکدامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قربت کا حق ادا کریں“ ۳

۱۔ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدرآباد دوزرقانی شرح موطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ مطبع کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ۔

۲۔ صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۳۳۹ مصر۔

۳۔ ابن ضبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الوقی و کتاب الجہاد ۱۲۔

قرآن مجید نے جا بجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۲۰۶۲)

یہ پیغمبران ان پڑھ جاہلوں کو پاک و صاف کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے (جمعہ-۱)

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں ایک پاک و صاف کرتا جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت

۱۔ تزکیہ:

کے لفظی معنی پاک و صاف کرنا، نکھرنا، میل پکیل دور کرنا ہیں قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صقل اور جلا پیدا کر دی جائے سورہ والفتح میں ہے۔

﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا، فَأَنهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، قَدْ أَفْلَحَ مَنْ رَكَّهَا، وَقَدْ حَاقَ مِنَ دَسَّهَا﴾ (ش)

قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنا یا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔

دوسری جگہ ہے۔

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى، وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى﴾ (۵)

بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک و صاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

﴿عَسَىٰ وَتَوَلَّىٰ، اِنْ جَاءَهُ الْاَعْمَىٰ، وَمَا يُدْرِيكَ لَعَنَةُ يَرْسُكِي، اَوْ يَدَّكُرُ فَنَضَعُكَ الذِّكْرَىٰ﴾ (جس)

پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھتا اس کے کام آتا۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس ”تزکیہ“ کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبر اسلام کی

خاص خصوصیت قرار دی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفس انسانی کو جلادیں ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

۲۔ حکمت:

اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے مگر اس

موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے جو نور الہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و

احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون سی باتیں داخل ہیں سورہ بنی اسرائیل میں توحید و والدین کی اطاعت و تعظیم قرابتداروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی بخل اولاد شئی بدکاری کسی بے گناہ کی جان سینے اور قیہوں کے ستارے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر رٹر کر نہ چھنے کی تائید کی گئی ہے اس کے بعد ارشاد ہے۔

﴿لَا تَلْبِسْ مَعَ الْبِئْسِ رِثْتِ مِنْ حَكْمَةٍ﴾ (۱۰۲)

یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورہ لقمان میں ہے کہ

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ إِذْ اشْكُرْنَا لَهُ﴾ (لقمان-۲)

اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ اللہ کا شکر ادا کر۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ "کسی کو اللہ کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی، صاف مغرور نہ بن، زمین پر رٹر کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔" ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری مہربانیوں کا خیر ہونا فطرتِ قوموں اور مذہبیوں میں مسلم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں "حکمت" کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو "حکمت" سے غلط سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وہی محمدی کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (انج-۱)

اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدی کے جسم کے دو بازو ہیں ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

حقوق عباد کی اہمیت

یہ اہم نقطہ سے دیکھ جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اس لیے کہ حقوق عبادت یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی اللہ کے فرائض ہیں۔ مہتممان نے جو ارحم الراحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے "مہربانہ" مہمیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے مگر حقوق عبادت یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور

تقصیر کی معافی اللہ نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہوسکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس (ظالم بھائی) کو چاہئے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرالے ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے سے یہ کسی سے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا صرف اعمال ہوں گے ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی۔“^۱ ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں نامہ اعمال کی تین فرمیں ہوں گی ایک وہ جس کی کوئی پروا اللہ نہ کرے گا دوسری وہ جس میں سے اللہ ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے چھ نہ معاف فرمائے گا جس فرد کے گنہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے اللہ کے درمیان ہے جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو یا نماز نہ پڑھی ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گنہ کو معاف کر دے گا اور بخش دے گا لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے۔“ (مسند احمد و حاکم عن عائشہ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟^۲ چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کر لے اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہو لیا۔

اسلام کے ارکان پنج گانہ اور اخلاق:

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان سے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ و اعظموں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے زکوٰۃ سر تا پا انسانی ہمداری اور غنیمت خوری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ، الگ جو چھ ہوں عمران کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے عمران عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں وہ پھول ہیں جن

۱۔ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامت ص ۹۷

۲۔ یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے دیکھو جلد ایہ کتاب الحج ص ۲۱۳ مرتبہ مولانا عبدالحق مرحوم۔

میں خوشبو نہیں اور وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں قرآن پاک اور تعلیم نبوی کے جو اشارات اس باب میں ہیں حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

”اللہ فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو کتنے نمازی ہیں جنہوں نے گو شراب نہیں پی مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا پھر فرمایا کہ ”نماز عاجزی، فروتنی، زاری، درد مندی اور شرمندگی کا نام ہے اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ ”اے میرے اللہ! جس نے یہ بات نہیں پیدا کی اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور بھوکے محتاج کو میرے لیے کھانا کھلاتا ہے۔“ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”نماز اسی لیے فرض کی گئی اور اسی لیے حج کے ارکان بنائے گئے تاکہ اللہ کی یاد کی جائے۔“ تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو جو مقصود ہے تو اس یاد الہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو اسی نماز اس کو اللہ سے اور دور کر دیتی ہے۔“^۱

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۃ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ”جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز ہی نہیں“^۲ اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے ارشاد ہوا کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔“^۳ ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاق حسنہ اور ایمان:

اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گوندہ ب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنہ کو قرار دیا گیا ہے چنانچہ سورۃ مومنوں میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہل ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے فرمایا۔

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِقُرْآنِهِمْ خَافِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ

۱۔ جلد اول باب فضیلة العشوع۔

۲۔ تفسیر ابن کثیر سورۃ عنکبوت آیت مذکورہ۔

۳۔ صحیح بخاری و جامع ترمذی والبوداؤ و ابن ماجہ کتاب الصوم۔

وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا، وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَنقُ أَتَمًا،----- وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ السُّبُورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا، وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَجْعَلُوا عَلَيْهَا ضِمًّا وَوَعْمِيَانًا، وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَرْوَاحِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْ لَنَا لِمَتَّقِينَ آمَنًا ﴿٦﴾ (فرقان-۶)

اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب تاکھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سہم کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب دور کر کہ اس کا عذاب بڑا تادان ہے اور جہنم برا ٹھکانا اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گزریں اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے جس کو اللہ نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا۔۔۔۔۔ اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغو بات پر سے گزرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب اللہ کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعائیں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں غنودہ گزرو میا نہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا اور کمزور میں

شریک نہ ہونا وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف:

وہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان

ہوئے ہیں۔

﴿وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾، وَالَّذِينَ يَحْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْأَثَمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا عَصَوْا هُمْ يَغْمُرُونَ، وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ، وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ، وَجِزَاؤُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ، وَلَمَّا انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ قَاُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ، إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٣﴾ (شوری-۳)

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں نماز ادا کرتے ہیں اور ان

کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ دیکھی ہی برائی ہے تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کر دے اور سہلے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

﴿أَعَدْتُ لِلْمُتَّقِينَ ۖ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالصَّرَّاءِ وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران ۱۳)

جنت ان پر ہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَبِالْحَسَنَةِ الَّتِي رَفَعْتُمْ يَنْفِقُونَ ۖ وَإِذَا سَمِعُوا النَّغْوًا أَنْعَمُوا لَهُمْ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ﴾ (قصص ۶)

یہ وہ ہیں جن کو دہرا ثواب ملے گا اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ برائی کو بھائی سے دور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے تم سلامت رہو ہم نا سمجھوں کو نہیں چاہتے۔

﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حَتٍِّ مُّسْكِنًا وَيَتَنَبَّهُونَ ۖ وَاسْتَرْتَفَعُوا﴾ (دھر)
اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں:

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا۔

﴿وَاهْدِنِي سُبُلَ الْإِسْلَامِ لَا يَهْدِي إِلَّا حَسَنَاتُهَا ۖ وَلَا تَصْرِفْ عَنِّي سُبُلَاتِهَا إِلَّا أَنْتَ﴾ (مسلم باب الدعاء فی الصلوة)

اور اے میرے اللہ تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا لیکن تو۔

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجاب کے بہترین موقع پر بارگاہ الہی

سے جو چیز مانگتا ہے وہ حسن اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے فرماید۔

﴿اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا﴾

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابن ضہل، ابوداؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے ماں کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اخلاق حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف بھی حاصل ہو جاتا ہے ارشاد ہوا۔

﴿إِنَّ الرَّجُلَ لَيُدْرِكُ بِحَسَنِ خُلُقِهِ حَقَّ دَرَجَةِ هَاطِمِ بْنِ أَبِي ذَرٍّ﴾

نسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن ضہل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے وہ بھی درجہ حسن خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے حسن اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادت کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے فرمایا

﴿خِيَارُكُمْ أَحْسَنُكُمْ اخْلَاقًا﴾ (بخاری کتاب الادب)

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

﴿مَامِنْ شَيْءٍ يَوْصَفُ فِي الْمِيرَانِ الْفَقِيرِ مِنْ حَسَنِ الْخُلُقِ وَالصَّاحِبِ حَسَنَ الْخُلُقِ لِيُصْغَرَ

بِهِ دَرَجَةُ صَاحِبِ الصَّوْمِ وَالصَّلَاةِ﴾

(قیمت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حسن اخلاق دار اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن ضہل، ابوداؤد) میں مختصر اصراف پہلا ٹکڑا ہے یعنی یہ کہ حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں اس حدیث نبوی نے چوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ راس کوئی چیز نہیں ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو اللہ کی طرف سے جو کچھ ملے اس میں حسن اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

﴿غَيْرَ مَا أُعْطِيَ النَّاسَ خُلُقٍ حَسَنٍ﴾

لوگوں کو قدرت الہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم نسائی، ابن ماجہ، ابن خضیل، طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے اس بشارت نے اخلاق حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنادیا ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿احب عباد اللہ الی اللہ احسنهم اخلاقاً﴾ (طبرانی)

اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے عمدہ ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے فرمایا

﴿ اِنْ احْتَكَمْتُمْ إِلَىٰ وَاٰقِرِكُمْ مِى فِى الْاٰحِرَةِ مَحَالِسٍ مَّحَسِّنٌ اَحْلَاقًا وَاِنْ اَعْصَمْتُمْ

النَّيِّ وَابْعَدَكُمْ مَنَىٰ فِي الْأَحْزَةِ مَسَاوِيَكُمْ أَحْلَافًا ﴿١٠﴾ (النَّسْلُ ١٠) مَنْ أَسْعَبَ يَدًا يَتَلَّى ١٠

تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ایک صحابی کی دو بیویاں تھیں ایک رات بھر نماز پڑھتیں دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کئے رکھتی تھیں دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں آنحضرت ﷺ سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ "اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی اس بد خصلتی کی سزا بھگتے گی" اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ "وہ جنتی ہوگی۔" ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت کو لے جائے فرمایا "انسان کو غلامی سے آزاد کرنا انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑا تو یہ نہ کر سہے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا اور غیبی بتا اور برائی سے روک اگر یہ بھی نہ کر سہے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک۔" غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف و لوازم:

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے منشاء میں زیادتی و کمی ہوگی، یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا۔

۱۔ یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ہفتمی، کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہیں۔

۲ ادب المفرد امام بخاری باب من لا یودی جاره۔

۳ مشکل لاچار لاما مطحواوی جلد ۳ صفحہ ۴۴ حیدرآباد دکن۔

۱۔ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے۔

۲۔ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف دہ کی چیز کو بنادو (تا کہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا جس کو اللہ اس کا رسول سب سے پیارا ہو جو دوسرے سے صرف اللہ کے لیے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنے آگ میں پڑنے سے۔

۴۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا حق بات کے سامنے جھکڑنے سے باز رہنا مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

۵۔ تین باتیں ایمان کا جز ہیں مفہمی میں بھی اللہ کی راہ میں دینا دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

۷۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دے دیں۔

۸۔ ایک شخص آ کر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: (بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا (سلام کرنا)

۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے؟ فرمایا اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جو انمردی دکھانا (سماحت)

۱۰۔ مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بدعاد دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بد زبان ہوتا ہے۔

۱۲۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا اللہ اس کی مدد میں ہوگا جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

۱۳۔ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں مسلم وہ ہیں جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔

۱۴۔ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

۱۵۔ بے ایمان (منفق) کی پہچان تین ہیں بولے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو خلاف کرے اس کو امانت

سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ ۱۔

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہئے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاق حسنہ صفات الہی کا سایہ ہیں:

لیکن اسلام نے اخلاق حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق حسنہ درحقیقت صفات الہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفات کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا حسر الخلق خلق الله الاعظم (طہرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفات ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو اللہ کی صفات کے منافی ہیں البتہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا جیسے اس کا واحد ہونا خالق ہونا نیز بعض ایسی پر جلال صفتیں بھی ہیں جو صرف اللہ ہی کو زیبا ہیں جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کے مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں اللہ کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور اللہ کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ صفات الہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے ۲۔ اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔



۱۔ یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

۲۔ ہم نے سوائے ان کی بحث میں اس جہاں کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے۔ المجلد سیاحت جلد چہارم ص ۳۸۳ تا ۳۸۵۔

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے جن کے کتب میں آنکر بڑی بڑی قوموں نے اب کا زانو تہرہ کیا اور آداب و اخلاق کے وہ سبق اس سے حاصل کئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان ویاہیں اور سچی یہ ہے کہ آج جہاں نہیں بھی حسن خلق کا کوئی نمونہ نہ وہ انہی کے صحیفہ تعلیم کا ایک ورق ہے مگر ایک تنہا فی نظر یہ بتائے کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے ان سے تعلیمی نصاب کی ترتیب ان بن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درگاہ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو یہ امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے نوع انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں ایک وہ جس نے اپنی تعلیم بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی جیسے عام انبیاء علیہم السلام اور بعض مذہبوں کے بانی دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ حمت اور عقل و انانی کی بنیاد پر اپنی علم و کھڑکی کی بنیاد میں سے اول و انبیاء اور صلحین دین اور دوسری کو حملہ نام سے تعبیر کر سکتے ہیں ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول و طریقے الگ الگ اختیار کیے پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ ”حکم خداوندی“ کو قرار دیا اس حکم و فرمان الہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی دہر بنیاد نہیں نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے نہ اخلاق کے دقیق نمونوں کی روشنی ہے نہ ان کا دہر و تعلیمات کی اخلاقی مصحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق نفسیاتی خواص کی بحث اخلاق کی غرض و نایبیت کی تعیین قواعد عملی کی تحدید یہ سب چھ ہے مگر بحث و نظر سے عمل کا درجہ صنف محض ہے اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر ع

یا رہائیں وارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی و عقلی دقیقہ رہی فرمان الہی اور اخلاقی نکتہ وری امر ربانی اور حکم فطرت کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔ انبیاء اور صلح میں جو اصلی فرق و امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں جن کا فیض ان کے ہر بن موت خیر و برکت کی سہیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو یہ اب کرتا ہے لیکن بند سے بند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محو حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی باز رہی ہے ایک انج بند نہ ہوگی وہ گو اوروں کو روشنی دکھا سکتا ہے مگر خود تاریکی سے باز نہیں آتا وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا وہ سچائی اور راستبازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچی اور راستباز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے دل اور ہاتھ نہیں اس لیے اس کے منہ کی آواز سی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی بلکہ ہوا کے تھوچ میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام چونکہ جو چھ

کہتے ہیں وہ کرتے ہیں جو ان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے جو ان کے من پر ہے وہی دس میں ہے اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور خلفاء یعنی موسیٰ عیسیٰ محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر یہ شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰ عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تمقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں اور آج زمین کے کدو پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجہ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو تا کہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور ہل صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مشابہتوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے ادراک میں محفوظ رہیں تا کہ بعد کے آنے والے بھی اس نشان قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے۔

- (۱) اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔
- (۲) اس کی ہر زبان تعلیم کے مطابق اس کی عملی مشابہت بھی سامنے موجود ہو۔
- (۳) اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی:

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبیوں کے بانوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلامؐ کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے تو راقہ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے سامنے ہیں ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو تو راقہ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ کمالات سے پاک اور بری قرار دیا ہے حضرت نوح سے لے کر حضرت موسیٰ علیہم السلام تک تو راقہ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل و صورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس (۳۳) برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات و خوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاق زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ن انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان ایران اور چین کے ہاں مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا راہ پڑا ہوا ہے صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف و دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسور تھامتھ کے کہ ”یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جس میں محمد کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے“ اے آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمان راز کو ابزات تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برعکس بیان کر دو جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو ﴿الافلیح الشاهد الغائب﴾

قوں کے ساتھ عمل:

اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواظ و نسیح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہ زیتون کے پر تاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راستبازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”سب کچھ جو تمہارے پاس ہے جب تک اس کو اللہ کی راہ میں لٹا نہ دو آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گے“ کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”شریروں کا مقابلہ نہ کرو“ کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر“ کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بائیں گال بھی اس کے سامنے کر دو“ کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ”تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو“ کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفیات موجود نہ تھیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ ﴿اَنۡاۤ اَمۡرُوۡنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَاَنۡفُسُنَاۤ اَفۡسٰکُمۡ﴾ (بقہ ۵۰) (کیا اور کونسی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ﴿لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفَعۡلُوۡنَ کَثَرۡ مَّقۡنَا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفَعۡلُوۡنَ﴾ (صف) (تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں بڑی بیزاری ہے

اللہ کے یہاں کہہ وہ جو نہ کرو)

ایک شخص نے آ کر ام المومنین ؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا کساں خُصْفَةُ الْقُرْآنِ ' لے جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و انت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا اگر آپ ﷺ اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا کھانے میں زبردینے والوں سے درگزر کیا اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا جنھوں نے آپ ﷺ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں مسیح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی سیرت کی دوسری جہد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیات کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے معصروں کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن محمد رسول اللہ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیات کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا فرمایا

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (یوسف-۲)

(اے منکرو) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

پھر آپ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا۔

﴿أَنْتَ لَعَلَىٰ خُلُقِي عَظِيمٌ﴾ (ن-۱)

(اے محمد) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل و مکمل:

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے کیا اس میں جن کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفہ وحی نے بار بار اعلان کیا

﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (جمہ-۶۲:۲)

وہ ان والہ کی باتیں سنا تا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے
اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ
نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور اللہ کے احکام سناتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر
سے پاک و صاف و مصفیٰ بنا بھی دیتا ہے وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا
دیتا ہے چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے
تھے اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، تیس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اونچے کمال پر پہنچا جس کی بلندی
تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا

تعلیم اخلاقی کا تنوع:

اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر ہو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لیے ایک ہی قوت کے
انسانوں کی نہیں، بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے اخلاق کے دوسرے معلمین کی درگاہوں پر ایک
نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰؑ کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم
سے سوانہائی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰؑ کے مکتب میں غفور و درگزر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے دیار اور خانقاہ میں
در بدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد رسول اللہؐ کی درگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو
معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی
ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق
اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانداندار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک
حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے
یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوے ادب تہہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپ کی تعلیمات
سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، یہ انہی کی اس درگاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون
کھجور کے تنوں سے بنا گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبویؐ تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ
الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ، زبیرؓ، معاویہؓ، سعد بن
معاویہؓ، عبادہؓ جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں، کہیں خالدؓ، ابوجبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ
سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زاہد و عباد کا مجمع
ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں گنتی تھیں، کہیں ابوذرؓ، سلمانؓ، ابودرداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح
اسلامؑ اہلکات تھے، کہیں وہ صف والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی
طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن
ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی

محفل ہے کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ دار جمع ہیں، سب پر توحید کا یس نہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ۱۔



اسلام کا فلسفہ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفہ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث ان کے اسباب و سبب کی تلاش ان کے اصول و قوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعیین یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب و سبب و عقل اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسئلوں کی تشریح ہیں جنہیں یونانی اصطلاح میں ”رواقیہ“ اور ”لذتیہ“ کہا گیا ہے، موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ”ضمیر یہ“ اور دوسرے کو ”افادیہ“ کہہ لیجئے یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہئے پہلا فریق اخلاق کی بنا ”جذبات“ پر قرار دیتا ہے اور دوسرا ”عقل“ پر پھر اس خشاے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنی نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل مآخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں، علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، اللہ کا قانون، فطرت کا قانون، حاسہ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانین اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی مآخذ سے، جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ رکھ سکے انھوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی مآخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی مآخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا، اور کسی نے اس سے باہر جنھوں نے خود انسان کے وجدان کو انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا مآخذ قرار دیا، جنھوں نے انسان سے باہر ذھونڈا انھوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا مآخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم یا بادشاہ کا حکم یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لیے لامحالہ اس بیرونی مآخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی مآخذ کو اصل مبنی قرار دینا ہوگا، اور نہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پر داختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق کے امہات مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا مآخذ اللہ کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اللہ نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں وہ عیت بھی رکھا ہے، تاکہ فطرت انہی سبب سے خاموش رہے تو احکام الہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیا کر دے، فلسفیانہ کادشوں اور مویشی گانیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں، ہو سکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا مآخذ اللہ کا حکم ہونے کے ساتھ اس

کے تائیدی ماخذ اور محرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادہ حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہو سکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد اللہ کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہو سکتے ہیں جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جارہی ہو اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قوی کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض اللہ کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہے، وجدان کہے، حاسہ اخلاقی کہے، ضمیر کہے، اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا، خصوصیات اقلیم، زبان، مذہب، رسم و رواج، طرز حکومت وغیرہ صد ہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی احکام ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے جس طرح دوسرے قوی اور حواس ودیعت ہیں اب یہ کاوش کہ جس طرح مریات، مسوعات اور ملموسات وغیرہ کے لیے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور امس کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانات جیسے حسن و قبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یا دلائل سے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدیؐ نے گواخلاق کے ان اصول و مہانی کی طرف کہیں تفصیلی اور ہمیں اجمالی اشارات کئے ہیں مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ ان کے عمل میں ہے اس لیے ”علم بلا عمل“ کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں لیکن اسی کے ساتھ ”عمل بلا علم“ کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کئے ہیں مگر اخلاق کے باب میں ان کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کئے جائیں کہ یہ اللہ کے احکام ہیں وہ اللہ کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں انہی احکام الہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے

اس تک وہ سب وصل پہنچے ہونا چاہئے ان میں ہر ایک جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی قدر انسان کا روحانی کمزور ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمزور میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ اللہ کا حکم ہے پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہئے اس کا وجدان بھی یہی ہو اس کو وہ اپنا فرض بھی جانتے اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرتے اور اسی نے پیروی میں نوح انسان کی شیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قوی میں اس بارہ میں ہر ایک موافقت اور یکسانی ہوگی اتنا ہی اس کا روحانی کمزور ہوگا اور جس قدر اس توفیق میں کمی ہوگی کہ اللہ کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور غلبہ پیدا نہ ہو اسی قدر اس کے روحانی ایمانی کمزور میں نقص پیدا ہے کتنا ہی نیک کام ہم اللہ کا حکم سمجھ کر انجام دیں لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم و راہ سمجھاتی ہے تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس نے اللہ کے حکم ہونے پر ہمارے یقین پختہ نہیں ہوا ہے جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا محسوس مسرت یا فائدہ عام کی غرض سے انجام دے مگر اللہ کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیہ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی:

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لیے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہئے اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے اسی قدر وہ قابل قدر ہوتا ہے ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی اداان نعمت چنیں لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہہ میں ذاتی نفع یا ریا کاری یا نمائش یا خوشامدی کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ مان و تمک بی رکھ دیں تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہاء نہ رہے گی تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت

اسی لیے آنحضرتؐ نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی ایک

شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے یا سخت تکلیف پہنچائیں گے اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بہت کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گنہگار مرتکب نہ ہوگا کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے میری جیب میں روپیوں کا ایک ہوا تھا اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا۔ جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بوہ پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھ لیا تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا ہوا مجھ کو سڑک پر پڑا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھ لیا تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گنہگار کی برائی سے پاک ہے راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گنہی بالکل ظاہر ہے نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے العذاب کا باعث ہوگا اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورہ آل عمران میں ہے۔

﴿وَمَنْ يُرِذْ ثَوَابَ الدُّنْيَا فُتُوْهُ مِنْهَا وَمَنْ يُرِذْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ فُتُوْهُ مِنْهَا﴾ (آل عمران: ۱۵)

اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَطْلُبُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْأَعْيُنِ وَالَّذِي كَاذِبٌ يُفْنِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (بقرہ: ۲۶۴)

اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں

﴿انما الاعمال بالنیات﴾ (صحیح بخاری باب ال)

انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے

وَمِنْ سَكُنِ مَكَّةَ مَنْ مَكَاتٍ هَجَرَهُ سِيْنَهُ وَرَسُولُهُ هَجَرَهُ اِسِيْنَهُ وَرَسُولُهُ
وَمِنْ كَانَتْ هَجَرَهُ اِسِيْنَهُ دِيْنًا بِصِبْهِهِ اَوْ امْرَاةً يَتْرُوحُهَا هَجَرَهُ اِسِيْنَهُ مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ (صحیح
بخاری جلد اول باب ما جاء ان العمل بالنية)

ہر شخص سے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ و رسول
کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا مانا ہو یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی
کی طرف ہے جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص
اہمیت حاصل ہے حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسن خلق کے دائرہ سے خارج دنیاوی تعریف و ستائش
کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفہ اخلاق کی تائید:

آنحضرت کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفہ اخلاق سے بھی ہوتی ہے چنانچہ
جان ایس میلنزی اپنی تصنیف "مینول آف آتھلکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے۔

"جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، وہ صاف ہے یعنی فعلِ راہی جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے یہی وہ چیز ہے جس سے
اخلاقیات میں شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا ہونا ہے جو اخلاقی احکام
ہم لگاتے ہیں ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں۔"
اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہیں۔

"یہ لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق
کرنی پڑتی ہے وہ کہتے ہیں کہ "بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو بھی
الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جاسکے۔"

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط:

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت یعنی قلب کے عمل پر ہے تو قلب کی اندرونی کیفیت اور
حالت کی درستگی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل سے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے ہم
مجمع میں ہوں یا تنہائی میں اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہہ کو ہزار پردوں
میں بھی دیکھ رہی ہیں دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے پھر یہ اعتقاد
بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال

کی جزایاں ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاں نریں نہ ہوں گے اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعاً محال ہے اسی سے وحی محمدی نے اللہ اور قیامت پر ایمان دانا ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے فرمایا

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَصْلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (بقرہ-۳۶)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتنا کر یا سنا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمان صحیح جس سے حسن نیت پیدا ہوتا ہے، آب حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِفِئَةٍ يُحْسِبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ نَمَّ يَحْدُوهُ شَيْئًا﴾ (نور-۵)

اور جو اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے، ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے جب وہاں وہ جائے تو اس کو کچھ نہ پائے۔

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو۔

﴿أَوْ كَطُغْمَنٍ فِي تَحْرِ لُحْيٍ يُغْشَىٰ مَوْحٌ مِّنْ مَّوْحٍ سَحَابٌ طُلُمْتُ نَفْسُهَا فَوْقَ نَفْسٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكْذِبْهَا وَمِنْ لَّمْ يَخْلَعْ لَّهُ نُورًا فَعَالَهُ مِّنْ نُورٍ﴾ (نور-۵)

یا (اللہ اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر دکھائے ہے اس لہر پر دوسری لہر ہے اس پر گھٹا چھائی ہے تاریکیاں ہیں ایک پر ایک، جب اپنا ہاتھ نکالے تو سو جھتا نہیں اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔

جب تک کسی واقف اسرار عالم الغیب دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہو گا دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بے غرضانہ بند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے۔

غرض و غایت:

اسی لیے آنحضرت کی شریعت کاملہ میں نفس عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قابل ہے تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آ سکتا ہے حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہوئے سقراط افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں لیکن حقیقت کا

راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاص کی غرض و غایت کیا ہونی چاہئے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ پست اور بلند متعدد غرضیں اور رعایتیں ہو سکتی ہیں ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اس کو اس کے گھر تک با آرام پہنچا دیتے ہیں ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچ کے بڑھا خوش ہو کر ہم کو مزہ دہری اور انعام دے گا یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگ ہم کو بلکہ ہمارے تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے یہ بھی غرض ہو سکتی ہے کہ آج اگر ہم جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑے چاہے میں کل کے نوجوان ہمارے مدد کریں گے بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے وہ اپنی اس خوشی کے لیے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہو سکتے ہیں لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج ہستی سے بلندی کی طرف جارہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیے کرنا بھی گو پست مقصد ہے مگر پہلے سے بند ہے پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے یہ بالکل فطری بات ہے کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں لیکن درحقیقت اس میں بھی گواہی دینا کی نہیں لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعظیم محمدی میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دی گئی ہے یہاں تک کہ ایک بادشاہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں۔

طاعت میں تار ہے نہ ہے، انگلیں کی لڑک دوزخ میں لے کے ڈال دے کوئی بہشت و

ضمیر کی آواز:

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے اور جس سے اس کے دل کے اندر سے خواہش کی دعوت ملے، از انھستی بے غریب والا چار آدمی کو، مجھ پر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صداقت ہے انسان کے ضمیر میں

ہے ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا تفرین کی آواز آتی ہے لیکن بری صحبت بری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے اس کے ذکر سے اس کی خیالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دبا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پیشانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکرے سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نسی و بدی کے جو فطری الہامات و دلیات رکھے ہیں یہ اس کے نتائج ہیں قرآن کہتا ہے۔

﴿فَأَنهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (نفس)

بر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے وحی محمدی کی اصطلاح میں اس کا نام نفس لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے سورہ قیامہ میں ہے۔

﴿وَلَا أَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (قیامہ)

اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسٍ بِصِيرَةٍ، وَلَوْ أَنفَىٰ مَعَادِيرَهُ﴾ (قیامہ)

بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے اگر چہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال دیتا ہے۔

نواس بن سمعان انصاری ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انھوں نے دریافت کیا فرمایا "نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں" اسی طرح وابصہ بن معبد نام ایک صاحب خدمت نبویؐ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے، چاروں طرف جان نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہناتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے لوگ ان کو روک رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا "وابصہ قریب آ جاؤ" جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا "اے وابصہ" میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم بتاؤ گے "عرض کی "حضور ہی ارشاد فرمائیں" فرمایا "وابصہ" تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو "عرض کی "سچ ہے یا رسول اللہ" فرمایا

﴿يَا وَابِصَةَ اسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَاسْتَفْتِ نَفْسَكَ الرِّمَاطِمَانَ إِلَيْهِ الْقَلْبُ وَاطْمَأْنَنَ إِلَيْهِ النَّفْسُ

وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي الْقَلْبِ وَنَرَدُّهُ فِي النَّفْسِ وَنَافَتَاكَ الْإِسْمُ﴾ ۱

اے دھڑ! اپنے دل سے چھڑا کر اپنے نفس سے فتویٰ لیا۔ رائی و بے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہوئی اور نہ وہ بے جو دل میں کھٹنے اور نفس کو جھینپن میں ڈالے اگرچہ لوگ تجھے اس کا رونا جانیوں نہ بتائیں۔ یہی وہ حارس اخلاقی ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنی ضمیر کی آواز سے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل میں صاف و سادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اگرچہ ہوش میں آکر جب توبہ و استغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا ہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے اسی مفہوم کو آنحضرتؐ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا۔

﴿عَدَدُ حَصَصِ حَصَصِ كُنْ فِي فِئَةِ كُنْ سَوْدًا، فَاْدَاهُو بَرِخٌ وَاسْتَعْمَرُوْا ذَنبًا

صَفْلَ قَلْبِهِ وَانْ عَادَرِيْدَ فِيْهَا حَتٰى يَّعْلُوْ قَلْبُهُ﴾

بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے تو اگر اس نے پھر اپنے کو طمأنہ و تسکین اور اللہ سے مغفرت مانگی اور توبہ بن تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا رنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾^۱ (تفسیر)

بھی نہیں بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر رنگ چھا گیا تھا۔

آنحضرتؐ نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہیں اور ان دونوں میں چھ دروازے کھٹے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہیں راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو اور ادھر ادھر مڑو۔ نہیں جب کوئی راہ گیر بندہ کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دوائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی والا پکار کر کہتا ہے ”خبردار پردہ نہ اٹھانا اٹھاد گئے تو اندر چلے جاؤ گے“ پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کے حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے ﴿هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِيْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ﴾^۲

وہ اللہ کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔

یہاں تک بڑے بڑے ضمیری نے بھی خدائی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت و انبساط:

یہ بات یہ کہ کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے وہی اس کو تنگی کے

۱۔ بیانِ تفسیر آیت مذکور۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی تعجب میں اورین و تفسیر محمد ص ۱۰۰

حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ گو تمام تر صحیح نہیں بننا تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو نقباض اور غم ہوتا ہے۔ لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہئے۔ یہ بھی مایہ خو، غرضی ہے۔ بعدہ حقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں۔ ایک غریب و لچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری غصہ نہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن وہ اس کی محرک علت اور غرض و غایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ ہے اللہ اور اس کی رضا مندی کا حصول۔

اس تشریح کے بعد معصوم ہوگا کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ کی تعلیم نے حمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت و الم کے اصول پر قائم کرتی ہے تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض و غایت نہیں بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔ حمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفہ ہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿وَنَكَرَ اللَّهُ حَبْ آبَائِكُمُ الْإِبْرَحَانَ وَرَبَّنَا فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمْ الْكُفْرَ وَالْمُفْسَدَ وَالْعُصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾ (حجرات-۱)

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دھایا اور کفر و رگنہ اور نافرمانی سے گھن لگا دی یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی۔

﴿اِذَا مَرَّتْكَ حَسَنَةٌ وَمَا لَكَ مِيئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ﴾^۱

جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔

﴿مَنْ سَرَّتْهُ حَسَنَةٌ وَمَا لَهُ مِئَةٌ فَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾^۲

جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنادے وہ مومن ہے۔

﴿مَنْ عَمِلَ مِئَةً فَكَرَّهَا حِينَ يَعْمَلُ وَ عَمِلَ حَسَنَةً فَسَرَّهَا مُؤْمِنٌ﴾^۳

جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراح خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصول اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقہ لذت کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش

۱۔ مسند احمد بن حنبل میں فی الامتہ ہائی جلد ۵ صفحہ ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴

باقی رکھی ہے اور پیغمبر اسلام کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بد اس نظر یہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرمادی ہے۔

رضائے الہی:

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض و غایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہئے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے، یہیں آ کر فلسفہ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ دھونڈھتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور معمم حکمت یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دینی چاہئے، انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور انہی دونوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسن عمل ہے پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِىٰ نَفْسَهُۥ بِتُفَاهٍ مَّرْصَاتٍ ۚ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعَصَادِ﴾ (بقہ ۲۵)
بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔
پھر مال کے متعلق فرمایا۔

﴿وَمَنۢ مُّسۡئِرٌۭ سَفَقُوۡنَ اٰمُوۡا۟هُمۡۤ اٰتَعَاۡ مَرۡصَاتِہٖۤمۡ﴾ (بقہ ۲۶)
اور ان کی مثال جو اپنی دولت اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔
﴿وَمَا تَفۡسُقُوۡنَ اِلَّاۤ اِنۡتَعَاۡ وَحۡہٗۤ اِنَّہٗ﴾ (بقہ ۲۷)
اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

﴿وَمَنۢ یُّفۡعَلۡ ذٰلِکَۤ اِنۡتَعَاۡ مَرۡصَاتِہٖۤمۡ فَاِنَّہٗ فَاۡتَعَاۡ اَجۡرَہٗ عَظِیۡمًا﴾ (بقہ ۲۸)
اور جو یہ تمام کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔

﴿وَالَّذِیۡنَ صَرُّوۡاۤ اِنۡتَعَاۡ وَحۡہٗ رَتۡہُمۡ وَاَقَامُوۡا الصَّلٰوۃَ وَانۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنَہُمۡ سِرًّا وَّ عَلٰنِیۃً وُّبۡرًا وَّنَٰ اَلۡحَسۡنَۃَ السَّیۡئَۃِ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عُقۡبٰی الدَّارِ﴾ (رد ۳)
اور جنہوں نے اللہ کے لیے صبر کیا اور نماز پڑھی کی اور ہم نے جو ان کو دیا ہے اس میں کچھ اور کچھ اعلیٰ طریقہ سے خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورہ ییل میں کھولی گئی ہے۔

﴿اِنَّہٗ یُوۡفِیۡ مَنۡہٗ یَتَرٰکٰی ۚ وَمَا لَاحِدٌ عِنۡدَہٗ مِّنۡ نَّعۡمَۃٍ تُجۡرٰی ۚ لَاۤ اِنۡتَعَاۡ وَحۡہٗ رَتۡہٗۤ اِلَیَّ﴾ (یل)
جو پناہ مل صفائی اور پاک حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو بلکہ وہ اللہ کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے، ایک صحابی پوچھتے ہیں یا رسول اللہ کوئی

اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے کوئی اس لیے کہ اس کو شہرت حاصل ہو تو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے فرمایا ”اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ اللہ کی بات بلند ہو“۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا ”گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب کسی کے لیے پردہ پوش اور کسی کے لیے گناہ ہے“۔ اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں اس کو باندھتا ہے تو اس کے چہرے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے پردہ پوش اس کے لیے ہے جو ضرورت اس لیے باندھتا ہے کہ اللہ نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے تو وہ رحم و شفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے“۔ ۲

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زار زار روئے حضرت ابو ہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا ”بارالہ! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے فرشتے کہیں گے یہ جھوٹا ہے پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولت مند سے اللہ فرمائے گا کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب! دریافت کرے گا تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دے گا میں اہل استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا ارشاد ہوگا تو جھوٹا ہے فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا بخشنے والا ہے تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا (تو اپنا بدلہ پا چکا) اس کے بعد وہ لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا تو اللہ اس سے دریافت کرے گا تو کس بات کے لیے مارا گیا کہے گا اے اللہ تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے اللہ کہے گا تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے“۔ ۳

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے پھر بولے اللہ اور اس کا رسول سچا ہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی۔

صحیح بخاری کتاب الجہاد ج ۱ ص ۳۹۴۔

۲ صحیح بخاری کتاب الجہاد کتاب الخیرات علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ج ۱ ص ۱۰۰۔

لاحکام النبی تعرف بالدلائل و بآب تفسیر اوز زلات و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ۔

۳ جامع ترمذی باب الزہد باب ما جاء فی الریاء و السمہ۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَرَبُّهَا ثَوَفَ إِلَهُمْ أَعْمَالُهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُنْجُونَ﴾، اُولَٰئِكَ
لَسَوْفَ يَكُنُ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ أَلْسُنٌ حَرْشٌ وَحُطَّ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَحَالَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۰﴾
جو ولی، نیاں زندگی اور اس کی حق چاہت ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے بے کم و کاست ان لوگوں کا
آخرت میں کوئی حصہ نہیں مگر، ورنہ اس دنیا میں انھوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو بنایا وہ برباد گیا۔

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح
سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل
رضا الہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذات الہی ہو جاتی ہے۔

﴿وَمَا تُمْقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ﴾ (بقرہ-۳۷)
تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

﴿لَسَوْفَ يَصَدُّوا عَنْهُ وَجْهَ رَبِّهِمْ﴾ (۳۰-۳۱)
انہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔

﴿وَمِنْ أَمْرٍ أَحَدٌ حَيْثُ مِنْ تَعْمَلُ نَحْرِي لَا تَعْمَلُ وَجْهَ رَبِّهِ الْأَعْلَى﴾ (یل-۹۲)
اور جو کسی سے حسن کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔
اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادا کے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا۔

﴿فَابْدَأْ فَرَسِي حَقَّهُ وَحَسْبُكَ الْسَّيْلُ﴾، ذَلِكَ حَبْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۳۱﴾ (زمرہ-۳۱)

تو رشتہ دار کا حق ادا اور غریب کا اور مسافر کا ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی ذات کو چاہتے ہیں اور
وہی کامیاب ہیں۔

مذہب میں اخلاق کا بنیادی اصول۔

آنحضرت کے ذریعہ سے اصول اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے
تو رونے اپنے اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت
کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی انجیل میں فطری صنایعوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیادی قائم نہیں کی گئی تاہم
عیسائی مذہب میں چھ اصول ضرور موجود ہیں مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقت
انسانی کا ہے۔

سوائے یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے یا گناہوں سے واندار ہے عیسائیت کی تعلیم
یہ ہے کہ انسان اصل میں سہکار پیدا ہوتا ہے گناہ اس کا یہ خمیر ہے کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدم اور حوا گناہگار
تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں اس مسئلہ میں
مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا

اُس کی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گناہ گار مرنے والا اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جدا گانہ ہے اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے فطرۃ اللہ فی فطرۃ عبہا (اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر انسان کے ازل سواں کے جو ب میں ملی یعنی اللہ کا اعتراف ہر انسان روز ازل کر چکا ہے اس لیے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور زلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوح فہم پر جو زریں حروف لکھے ہیں وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اس کو ابھار کر چکا دیتا ہے یا مٹا دیتا ہے فرمایا

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (التین)

ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا۔

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

﴿أَنذَىٰ خَلَقْتُ فَسَوَّاكَ مَعَدِّلًا، فَبِئْسَ أَتَىٰ صُورَةَ مَا شَاءَ رَكْعَتُ﴾ (الانعام)

جس اللہ نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو برابر کیا پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔

یہ آیت سورہ انفطار کی ہے اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ”ٹھیک کیا“ کیا ہے اس کے لفظی معنی ”معدّل کیا“ کے ہیں یعنی اس کو قوی کا ہر قسم کا اعتدال بخش نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قوی کا اعتدال داخل ہے دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے سورہ اعلیٰ میں ہے۔

﴿سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ، أَنذَىٰ حَقِّ فَسَوَّىٰ، وَأَنذَىٰ فَتَرَهَدَىٰ﴾ (الاعلیٰ)

پنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔

راہ دیکھنا یعنی ہدایت انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے جس طرح اس میں دوسرے حیوانوں قوی اس نے ودیعت رکھے ہیں سورہ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے۔

﴿أَبْ حَقَّقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ امْتَسَاحٍ نُّتِينِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا نَّاهِدِيهِ السُّبُلَ أَمَّا

شَاكِرًا أَوْ أَمَّا كَفُورًا﴾ (دہر)

ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا پلٹتے رہے اس کو پھر کر دیا اس کو سنتاد دیکھتا ہم نے اس کو راہ بھادی تو وہ یا شکر گزار (نیکی کار) ہوتا ہے یا ناشکر (بدکردار)

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی اب عقل و تمیز آنے کے بعد اللہ کا شکر گزار یا ناشکر نیکی کار یا بدکردار اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے سورہ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔

﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، قَدْ أَفْضَحَ مِنْ رَكْعَتِهَا، وَقَدْ خَابَ مِنْ دَشَّهَا﴾ (شس-۱)

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا سو جھا دیا) اس کی نیکی اور بدی تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف رکھا اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا (سندہ کر دیا) الغرض محمد رسول اللہ کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی سنہگار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام و دیت ہے اس لیے یہ کہا گیا۔

﴿فَاقْمْ وَّجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا، فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (روم-۳)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ دو ہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا اللہ کے بنانے میں بدلنا نہیں یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ دین فطرت اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جن کی بنیادی چیز توحید ہے آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے وہ سن کتنا نہیں پیدا ہوتا اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحی محمدی نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا ﴿اَسْتَسْرِكُمْ﴾ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ انھوں نے اپنی زبان حال یا قل سے بالاتفاق جواب دیا ﴿سَلٰی﴾ ”ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے۔“ یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ ”دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔“

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پستارہ اپنی پیٹھ پر لا دکر نہیں آتا قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰی﴾ (فاط-۳)

اور ایک کے گناہ کو بوجھ دوسرا نہیں اٹھایا۔

﴿كُلُّ امْرِئٍ لِّمَا كَسَبَ رَهِیْنٌ﴾ (طہ-۱)

ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿اَلَا لَا يَحْسِي حٰنٌ عَلٰی وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ عَلٰی وَالِدِهِ﴾ ۱

صحیح بخاری و مسلم کتاب الایمان۔

۲ سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب العطلہ یوم النحر۔

ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنہوں نے انسانوں کو آواگون اور تاج کے چکر میں پھنسا رکھا ہے انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ہی ٹھہرایا ہے انہوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جہنم کو دوسرے جہنم کا نتیجہ بنا کر اس کو اپنے پیچھے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کے لیے متنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گنہگار بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش و حواس اور عقل و تمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گنہگار ہے فرمایا کہ ”اللہ کا قسم بچہ سے اس وقت تک کے لیے اٹھ دیا گیا جب تک وہ عقل و تمیز کو نہ پہنچے۔“ ۱۔

باغ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں آپ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے وہ اللہ کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنت میں لے جائیں گے ۲۔ آنحضرت کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا ”یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پئے گا۔“ ۳۔ اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے فرمایا ”اللہ کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے“ ۴۔ لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمائی ”ایک دفعہ دیا میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمن بچوں کا جھوم تھا فرمایا یہ وہ کمن بچے تھے جو این فطرت پر مر گئے صیہ“ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اور مشرکوں کے بچے! فرمایا ”اور مشرکوں کے بچے بھی۔“ ۵۔ ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کسنی میں مر جانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی بہا نہتے تھے لیکن چونکہ غیب پر خیر لگاتا صرف اللہ کا کام ہے اس لیے تصریح کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا بہہ دینا آپ ﷺ نے مناسب نہیں سمجھا ایک دفعہ ایک صیہ بی کا بچہ مر گیا تھا ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانچہ کو سن کر آنحضرت ﷺ سے عرض کی ”یا رسول اللہ اس کو مبارک ہو یہ جنت کی چیزوں میں سے ایک چیز یا تھی نہ گناہ کیا نہ گنہ کرنے کا زمانہ پایا۔“ فرمایا ”اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ پیدا کئے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ“ ۶۔ ایک طرف عیسائیت ہے جو ہر قسم پانے سے پہلے م

۱۔ صحیح بخاری کتاب الطلاق و ترمذی فی من لا یجوز علیہ الحد۔

۲۔ صحیح مسلم باب فضل من یموت لدولہ۔

۳۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

۴۔ صحیح مسلم کتاب القدر۔

۵۔ یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں ہیں نیز امام نووی و شیخ مسلم میں بھی یہ باب محمود باب فضل من یموت۔ و ما جہدہ منہ ۳۳۔ ۳۴۔

۶۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

جانے والے کسمن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا، گننے کی تعلیم دیتا ہے ”اے اللہ! اس کو میرے بے بیشگی کا ذخیرہ بنانا“ اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔“ احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گنہ گاروں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے اکثر آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ ”وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔“

خوف ورجا:

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گذرے ہیں ایک کو رونے والے فلسفی دوسرے کو ہنسنے والے کہتے ہیں پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خاوار نظر آتی ہے دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل چلش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنا لو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے دوسرے کا نظریہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قوی سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی سادہ کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے کہ وہ بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا وہ اخیر وقت تک اللہ کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے اس کی شریعت میں اللہ سے ناامیدی اور کفر ایک ہے۔

وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی ناامید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا۔

﴿وَلَا تَكُنْ مِنَ الْفَاسِقِينَ﴾ (حجر-۳)

(براہیم) ناامیدوں میں سے نہ بن۔

پھر حضرت یعقوبؑ کی زبانی تعلیم ملی۔

﴿وَلَا يَنْفَعُكَ مِنْ رُوحِ اللَّهِ نَهْلٌ وَلَا يَنْفَعُكَ مِنْ رُوحِ اللَّهِ لَا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ﴾ (یوسف-۱۰)

اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے ناامید نہ ہو ہی ہیں جو اللہ کے منکر ہیں۔

اس امت کے گنہگاروں کو کس پیر سے خطاب ہوتا ہے۔

﴿بَعْدَ تَسْبِيحِهِ عَلَى نَفْسِهِ لَا يَقْضُو مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾ (مر-۱۶)

میرے وہ بند و جنہوں نے اپنی جانوں پر آپؐ ظلم کیا تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت بنو۔

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پر امید رہنے کی تاکید کی ہے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ

تحیح مسلم باب اوقات لقی نبی عن صلوٰۃ فیہا تحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الحج۔

تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ”میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں۔“ یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے وہی اس کے لیے ہو جاتا ہوں اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے۔

﴿اَمْسُ حُو قَاثَتِ اِنَاءِ الْيَلِّ سَاجِذَا وَقَانَمَا يُخَدِّرُ الْاٰحِرَةَ وَرَجُو رَحْمَةً ۙ﴾ (مر)

بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجہ ہیں گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ و باز پرس کا ڈر بھی ہے اور اللہ کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے اللہ کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے یہ اس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہیں ہونے دیتا اور یہ امید اس کو مایوس، غمزہ اور شکست خاطر نہیں ہونے دیتی اسی لیے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے ہریز رہتا ہے اسی کی طرف اشارہ کر کے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے۔

﴿وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ﴾ (نساء-۱۵)

اور تم کو اللہ سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اس کو نہیں پاتا تو دل شکستہ ہو جاتا ہے وہ کامیابی صاف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے لیکن مومن اگر دنیا ہی کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نبی کا کام کیا اور بہر حال اس نبی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو اللہ کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال اس کا اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنادیا ہے اور ان کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص سے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خود شیوں کا عام طور سے رواج ہے ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھتے ہیں یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے جس وقت یہ سطر میں لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس نے قیام میں خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور اللہ کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹی امیر ہو کہ غریب تندرست ہو کہ بیمار اولاد والا ہو کہ بے اولاد کامیاب ہو یا ناکام دولت مند ہو یا یو ایہ حالت میں وہ پر امید رہتا ہے مشکلات میں بیماریوں میں محتاجیوں میں ناکامیوں میں ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ اللہ کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور فردہوں اس کے مذہب میں ایک چیز ہیں اور اس کے عمل کا مواخذہ یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے کہ اس کے اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ:

! جامع ترمذی کتاب الزہد باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ۔

﴿إِنِّي لَا أَضِيعُ عَمَلٌ عَامِلًا مِنْكُمْ﴾ (آل عمران-۳)
میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔

اخلاق اور رہبانیت:

اخلاق درحقیقت انسانوں سے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہئے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے جو رہبانیت، تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے اسی لیے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے عیحدگی، اہل و عیال، عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے تعلقات سے آزادی اخلاق سے استعمال کے موقع ہی کو کھودیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس سے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نشئی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کرنی ہے اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور جب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے مذہب پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل و عیال، اعزہ و اقارب، دوست و احباب اور قوم و ملک و ملت کے فرائض و حقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں اسی لیے اسلام نے اپنے اصول اخلاق میں راہبانہ جوگی نہ اور بھڑانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمع انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری ہے یہی طرز عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہؓ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے تجرذ عیحدگی، خلوت نشینی، ترک عمل اور ترک جماعت کے سے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں ان سے ہٹ کر نہیں وہ وگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرنے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سر پرست ہیں؟ کیا وہ خلق الہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد جیسے فریضوں سے مہربا ہیں؟ حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (تحریم۔ ۱)

تم اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے آنحضرت ﷺ نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا ﴿كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْنُونٌ عَنْ رَعِيْنِهِ﴾ ”تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا میرا پی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل و عیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔“ ۱

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنہارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اسی لیے وحی محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا۔

﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾ (اعل ۳)

اور اس فساد سے بچو جو جن کو صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپٹ گنہگارو بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تہمید کی مجرم ہوئی ہے تو کنہارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنہارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

دنیا در حقیقت جدوجہد اور دارو گیر کا ایک میدان ہے جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال و لحاظ کرنا پڑتا ہے اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے یہی نے شعب ایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

﴿اِنَّ الْمُسْلِمَ الَّذِي يَخَالُطُ النَّاسَ وَ يَصْرُ عَلَى اِذَا هُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِي لَا يَخَالُطُ النَّاسَ

وَلَا يَصْبِرُ عَلَى اِذَا هُمْ ۝۲﴾

وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں فتنہ میں عزت نشینی کی حدیشیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ

۱ صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأة رهيبة في بيت زوجها ص ۸۳۔

۲ شعب الایمان، بیہقی و جامع ترمذی کتاب الزہد ص ۳۱۲۔

اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے۔ یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت ﷺ نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔ آپ نے فرمایا کہ ”بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور منانا ہر مسلمان کا فرض ہے اگر ہاتھ سے نہ منا سکے تو زبان سے منائے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھ اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔“ ۱

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

اسلام کے اس اصول اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے اسی اخلاقی فرض کا دوسرا شرعی نام ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی ہو اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (توبہ: ۹)

وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔

پھر خاص طور سے حکم ہوا

﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (لقمان: ۲)

اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (العصر)

اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ (بلد: ۱)

اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قومی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراة میں قاتیل کا یہ فقرہ کہ ”کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟“ ۲ عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام ”شخص آزادی

۱ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

۲ سفر تکوین ۴: ۹۔

کی بھائی“ ہے۔ لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ ”﴿كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْنُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ﴾“ (تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی) قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چینی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے بے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سبت کے دن پھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کر نیوالا ہے لیکن ان پر جب عذاب الہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا، پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورۃ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر میں ہے:-

﴿وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۚ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَدِّتُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۚ قَالُوا مُعَذِّبُهُ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۚ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنحَنَّا إِلَيْهِمُ يَبْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ ۚ وَآخِذْنَا بِالذِّينِ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ ۚ بَئِيسٌ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ (اعراف ۲۱)

اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا دینے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے اترام اتارنے کیسے ان کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچالیا اور گناہ گاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہ گار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں، فرمایا

﴿مَاعَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾ (مائدہ ۱۳، نور ۷)

رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لیے سورہ مائدہ میں فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَنِيبُكُمْ نَفْسُكُمْ لَا بَصُرُكُمْ مِمَّنْ صُلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (۱۶: ۱۰۷)

اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکاؤ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ”نوگو! تم کو اس آیت کے ظہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ نہ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔“ ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کے معنی دریافت کئے تو فرمایا کہ ”نہیں بلکہ نبیؐ کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شہد کو ہاتھ سے پکڑنا ہے۔“ ۱

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ ”کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟“ منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے رسوم و آداب اور ایسی کیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے ہر شخص کے پرائیویٹ اور نجی قسم کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع و نقصان کرنیوالے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ ”بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے صہاء نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کی معرفت ان پر لعنت کی۔“ اس کے بعد آپؐ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا ”نہیں! جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کو حق پر نہ جھکاؤ۔“ ۲

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم۔

اس کے چند شرائط:

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے۔ قرآن نے کہا:

۱ یہ دونوں حدیثیں ترمذی، کتاب التفسیر (مائدہ) میں ہیں، ص ۳۹۸-۳۹۹۔

۲ جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔

﴿اتَّامِرُونَ النَّاسَ بِالْمِثْرِ وَتَسْؤُونَ انْفُسَكُمْ﴾ (۵۰)

کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمائش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے، خود آنحضرت

ﷺ سے فرمایا گیا۔

﴿أَذْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (نحل ۱۷)

تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانا ئی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا۔

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (۲۵)

تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔

ایک اور جگہ تعظیم دی گئی:-

﴿وَعَصَهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِيْ انْفُسِهِمْ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (۹۰)

اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات۔

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا

اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن و امان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور

زبردستی کے حکمانہ انتظامات جن کیلئے تنقیدی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے

روکنے کے لئے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت:

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی جس کا نام تجسس اور نوہ لگانا ہے ممانعت

کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے،

یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ "مختب راورون خانہ چہ کار؟"

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ

رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک

محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، اور اسی کے ساتھ

اور ایک نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم و حیا کا جو ہر ابھی موجود ہے جو ممکن ہے

کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی

بادنند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھریا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت

ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کو ظاہر فرمادیا ہے کہ ﴿اسما الادب لاجل الرؤیة﴾ یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو محال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے چنانچہ وحی محمدی نے اسی لیے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور پر ممانعت کی، فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اخْتَسُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ أَثْمٌ وَلَا تَحْسَبُوا وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم مِّبْعًا أَيَبَحْثُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَحِبِّهِ مِمَّا فَرَغْتُ مَوْتَهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (نور مجید ۲)

اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو، کہ بیشک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا نوا کرنا اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہنا۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے سو تم کو گناہ آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ معاف کرنا لامہربان ہے۔

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کر سکتا، اس غیبت کی ایسے قابل نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرتاً گھن آجائے، اس سے زیادہ بیخ نہیں ہو سکتی، اس کی آراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری بر ملا ظاہر ہو جاتی ہے، جو ایک مسلمان کی شان ایمان کے شایان نہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو ان کو برباد کر دو گے“۔

غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکلتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال:

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور زور چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے آیا اور سلسلہ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملامت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی

نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰؑ کی شریعت مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان و درگزر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے۔ ۱۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، ان کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت بہت کم پائی جاتی ہے۔ ۲۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت نے دنیا کیلئے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیئے تھے، اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا۔

”تم نے یہ سنا ہو گا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ ۳۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو۔ بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے، نکلے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔ تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہو گا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔“ (متی، باب ۵)

حضرت عیسیٰؑ سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا وہ حضرت موسیٰؑ کا قانون تھا جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰؑ کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا لیکن اسلام نے عدل و احسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کر دیا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (نحل ۱۳)

بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعت موسوی و عیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل و احسان:

”عدل اور احسان“ کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کیلئے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد و حقیقت ”عدل“ پر ہے۔ ”عدل“ کے معنی ”برابر“ کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ ”عدل“ ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ ”احسان“ ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے۔ یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانون عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے۔ اس لیے حکومت کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لئے توراۃ کے قانون عدل کا خاتمہ کر

۱۔ یہودی سنگدلی کے سبب ہے۔

۲۔ یہودی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کیلئے۔

۳۔ یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

دیا، کبھی دنیا کے لئے قابل عمل نہیں رہا۔ خود جیسا فی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانون عدل کے بغیر صاف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن وامان قائم نہیں رہا۔ اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ حقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے۔ اس لئے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں انکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لئے اخلاق کو قانون عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعت محمدی میں پوری طرح برقی گئی کیونکہ وہ دنیا کی انکی شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لئے معاف کر دینا، درگزر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے اور بعض خصلت مزاج اور تند خو پیدا ہوئے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لئے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لئے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور "برائی، برائی کے بقدر" کے اصول پر عمل کرنے کے لئے ان کو رضامند کر دیا جائے۔ اس سے ایک عالمگیر شریعت کے لئے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لئے آئی ہو، عدل اور احسان، دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق:

اوپر جو کچھ کہہ گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لئے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق، اور گوان، دونوں کا منشاء ایک ہی ہے مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے۔ جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لئے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتہاً نہیں ہو سکتا، تو راۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی سے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت ﷺ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کی جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول، شریعت محمدی میں دو حیثیتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دیدی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنادیا بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت میں رکھا مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرائم کے لئے قرآن نے سزا مقرر کی ہے جو حکومت اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس کے متعلق تھیں، ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم رکھنا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اسی طرح شریعت محمدی اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانون اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدر لے، لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کی پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ و محسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام:

موسیٰ، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں۔ لیکن اگر وہ قانون محمدی کے ساتھ ساتھ اخلاق محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عا دلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اس کا حکم ہے۔

”اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے، سو جیسا کرے گا دیا

پائے گا توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت“ (احبار ۲۳۔۱۷، خروج ۲۱۔۱۲، گنتی

۳۵۔۳۱، استثناء ۱۹۔۱۱۔۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے۔

”تم من چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا،

بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے“ (متی ۵۔۳۸)

لیکن اس سر تا پا روحانی اخلاقیات پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد ﷺ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں، اوپر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں۔ اس کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۚ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ

بِالْأُنثَىٰ﴾ (بقرہ ۲۲)

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے۔

﴿مَنْ عَفَى لَهُ مِنْ أَجِبِهِ شَيْءٌ فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (بقرہ ۲۲)

تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لئے دکھ کی سزا ہے۔

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے بعد ان کے جذبہ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خون بہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے اس غلو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خون بہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذاب الہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور غفودونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے۔

﴿وَكُتِبَ عَلَيْهِمُ فِيهَا أَنْ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ مَّنْ تَصَدَّقْ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُۥ وَمَن لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (مائدہ ۷)

اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

۲: یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانون و اخلاقی احکام تھے۔ مالی معاملات کے متعلق بھی

اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے، فرمایا

﴿وَإِنْ تَبْتَغُوا فَلَکُمْ رِءً وَّسْ أَمْوَالُکُمْ﴾ (بقرہ ۳۸)

اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے۔

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (بقہ ۳۸)
اور اگر قرضدار جنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشائش ہو اور بالکل معاف کر دینا
تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہے۔

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا۔

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ﴾ (نحل)
اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنے والوں کیلئے بہت بہتر ہے۔
اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ ۖ وَجِزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَمَا وَاَصْلَحَ
فَاجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (شوری ۴)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور
نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے۔ وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی
ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی
برائی ہے جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس
برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (واصلح) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر
مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتقام اور
سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو
برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے
حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا
رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے آنحضرت ﷺ ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے۔ اس
نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دیدیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ
کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام
قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی
کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کیلئے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے وقت حکم ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمْ رَافِعَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (نور ۱)

اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گنہگاروں پر ترس نہ آئے، اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔
یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس
گناہ کی سزا دنیا میں ہی دے دیتا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا ہے۔ اس لیے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی
جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب
ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لئے
آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا ”اے لوگو! تم سے پہلے تو میں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ
جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ خدا کی قسم
اگر محمد کی بیٹی فاطمہؑ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا“ ۱۔

دوسری طرف غنوکا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی
انتقام نہیں لیا الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے ۲۔ تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو“۔ یہ عمل تھا۔ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ
حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ”میں نے آپ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا لیکن یہ کہ اس میں
آپ نے معاف اور درگزر کرنے کا مشورہ دیا“ ۳۔ یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرتاوان یا خون بہا)
لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سے فرمایا ”آپس میں گنہ گاروں کو معاف کر دیا کرو لیکن
مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائیگی“ ۴۔ یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائیگا تو
پھر سزا ہونا واجب ہے تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر
اوزھے سو رہے تھے۔ ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا اور عدالت نبوی میں پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے
ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے عرض کی کہ ”یا رسول اللہ! کیا تمیں درہم کی ایک چادر کے لئے
ایک انسان کا ہاتھ کاٹنا جائے گا، میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں“۔ فرمایا کہ ”میرے پاس لانے سے
پہلے یہ کیوں نہیں کر لیا“ ۵۔

یہ تو اس غنوکا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانون محمدی،
موجود سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم ہے، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن غنوکا عام اخلاقی تعلیم کا
دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

۱۔ صحیح بخاری جلد دوم کتاب اللہ و دہ، ص ۱۰۰۲۔

۲۔ ایضاً کتاب اللہ و دہ۔

۳۔ ابو داؤد نسائی کتاب الدیات۔

۴۔ ابو داؤد کتاب اللہ و دہ۔

۵۔ ایضاً کتاب اللہ و دہ۔

عفو و درگزر کی تعلیم:

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گزرتی ہے، وہ عفو، درگزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ”تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں۔“

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام ۱۳)

اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (اعراف ۲۳)

معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر، اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑا بھاردے (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ، وہ ہے سستا جانا۔

سکون کی حالت میں عفو و درگزر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔ صحابہ کی تعریف میں فرمایا۔

﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ (شوری: ۴)

اور جب غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔

نیکوکاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دباننا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران ۱۳)

اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔

فرمایا۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ الْأُمُورِ﴾ (شوری ۴)

اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدی نے اپنے الفاظ میں ”عزم“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاء اور پیغمبروں

کی توصیف میں آیا ہے، فرمایا

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (تحف ۴)

اور برداشت کر۔ جس طرح نمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہئے کہ یہ بڑی ہمت

کا کام ہے، فرمایا

﴿وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْتَ عَلَى الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (القمان ۲)

اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا

﴿وَأَنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (آل عمران ۹)

اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا

سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں

ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ﴾ (جاثیہ ۲)

(اے پیغمبر) ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو کافر و مشرک

ہیں۔ اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ

وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ

مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے۔

﴿إِنْ تُلْدُوا حَيْرًا أَوْ تُخَفُّوهُ أَوْ تُعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا﴾ (نساء ۲۱)

اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپ کر کرو یا کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا

معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا

ہونا چاہئے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی

الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور

جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہئے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے

﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحْسِنُونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (تور ۳)

اور چاہئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا اس میں عفو و درگزر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

برائی کی جگہ نیکی:

غفور و درگزر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے والوں کا نام خدا نے صابر اور ذو حظ عظیم یعنی ”بڑا خوش قسمت“ رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنالینے کی یہ بہترین تدبیر ہے، فرمایا ﴿لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۚ وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ ضَرَّوْا وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا ذُو حِطَّةٍ عَظِيمٍ﴾ (ہم اسجدہ ۵)

نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائیگا جیسا ناتے دار دوست، اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے ”بڑی خوش قسمتی“ سے تعبیر کیا ہے، اس سے اسکی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برانہ مانو کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے۔

﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةِ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ۖ وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ ۖ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ﴾ (مومنون ۶)

مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے، ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور غنوکا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام مذکورہ بالائیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۖ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِعَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْا زَكَاةً مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۚ جَنَّتٌ عَدْنٌ﴾ (زمرہ ۳)

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لئے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کے لئے ہے پھلا گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ۔

ان سے کہا جائے گا:

﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَبِعَمِّ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (رد ۳)

تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا بچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوف خدا کا، صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نو مسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دل آزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں۔

﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَبِالْحَسَنَةِ الَّتِي كَانُوا يَعْمَلُونَ وَاللَّهُ يُفْقَهُونَ﴾ (نقص ۶)

وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نیکی بات سنتے ہیں تو اس سے درگزر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں، اور تمہارے لیے تمہارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”قربت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو“۔^۱ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ ”اے خدا کے پیغمبر میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں۔ میں صم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں“۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے، تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو“ یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی۔^۲ حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے، اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو“۔^۳

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کا رانہ معاہدوں اور پرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو یہی ہدایت ہوئی۔

۱۔ صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ۔

۲۔ صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ۔

۳۔ جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، ص ۳۳۴ (غریب)۔

﴿وَلَا تَرَوْا تَطْمَعُ عَلٰی حَاسِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاَعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ بِحُثِّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (۳۰۰۰)

اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کو کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو تو ان کو معاف کر اور ان کے قصور سے درگزر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایک خیانت کا قوم کو بھی معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگزر کرنا، اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔



اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظم حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصول قانون میں وئی جدید اضافہ کر دیتا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظام حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کالی ظ رکھا جاتا ہے جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جاسکتا، لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور زیادہ پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں دی جاتی، ہر سہولت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے کسی قدر کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیئے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقع واردات کا سراغ دیتے ہیں، نام مسروق کو بیچتے یا خریدتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، بہر حال تمدنی نظام حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظم حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی، تمدن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری:

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جاسکتی ہے اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جاسکتا ہے، مثلاً اصول شریعت میں دنیا سے اکثر مذاہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے اس لحاظ سے عقائد میں اعمال میں عبادات میں معاملات میں اخلاق میں جو چیزیں ناجائز اور مصلحت عامہ کے مخالف تھیں ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی اور جو چیزیں جائز اور مصالح عامہ کے موافق تھیں ان کی ترغیب دی، لیکن امر و نہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے جس سے برائیوں کا تمام تر سد باب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصاء کیا ہو اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجنبی تشریح کی ہے۔

مثلاً تو حید تمام مذاہب کا اتم الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعمین نہیں کی اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے

شرک کے تمام عمل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی 'اور ان کا کلی استیصال کیا' شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا 'اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی 'اور عرب کے تمام بت توڑ دیئے جاتے' لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا 'بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں' تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی 'تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی 'اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا 'کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بد اخلاقی ہے 'تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے 'اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے 'اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت سے لیے اس سے کام لے سکتا تھا 'تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے 'جس نے ام قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی 'اس لیے آنحضرت ﷺ نے برسر منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔

﴿ لَا تَطْرُقُوا كَمَا أَطْرَقَتِ النَّصَارَى اس مَرِيْمَ فَاسْمَا اِنَا عَمِدَهُ فَقَوَّيَا عَمَدَ اللّٰهِ وَرَسُولَهُ ﴾
(بخاری کتاب الانبیاء)

میری شان میں مباحثہ نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان میں کیا، میں تو اللہ کا بندہ ہوں تو کہو کہ اللہ کا بندہ و رسول۔

یہ ایک کلی حکم تھا 'اور آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی 'اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا کر اس کی بیخ کنی کی 'یہی حال عبادات کا بھی ہے 'اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا 'اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے 'اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا 'اور کوئی بات سوال و جواب کے لیے باقی نہیں رکھی 'یہی معنی اس تکمیل کے ہیں جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے۔

۱۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

۲۔ ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

۳۔ نرمی و نرمی عاجزی و بندہ ہستی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ:

یہودی و عیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈالیں 'اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے 'بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے 'اور ان میں سے بھی صرف چند اصولوں کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے 'حضرت موسیٰؑ کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے 'یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے 'ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت 'تیسرا اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کرہت 'اور چوتھا سبت کے دن آرام

کرنے و بدایت پر مشتمل ہے باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسب ایل میں ۱ (۱) میں مذکور ہیں۔
۱۔ تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

۲۔ تو خون مت کر۔

۳۔ توز نامت کر۔

۴۔ تو چوری مت کر۔

۵۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

۶۔ تو اپنے پڑوسی کی جو رو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ایجاد ہے اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آگئی ہیں یعنی مسافر بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جہونی گواہی کی ممانعت پھر اسباب باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے۔

۱۔ تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

۲۔ تم چوری نہ کرو نہ جھوٹا معاملہ کرو ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

۳۔ تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

۴۔ تو اپنے پڑوسی سے دعا بازی نہ کرنا اس سے کچھ چھین لے تو مزدور کی مزدوری چاہئے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

۵۔ تو بہرے کو مت کوس تو وہ چیز جس سے اندھے ٹھوکر مٹے اندھے کے آگے مت رکھ۔

۶۔ تو حکومت میں بے انصافی نہ برائے بغیر و امیر کو نہ دیکھ بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

۷۔ تو عیب جوؤں کے، نندا اپنی قوم میں آیا جی نہ کرا اور بپے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

۸۔ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

۹۔ تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ ان کی طرف سے کینہ رکھ۔

۱۰۔ تو اس کے آگے جس کا سر سفید تھا ٹھہرا ہوا اور بازو ہمہ کو عزت دے۔

۱۱۔ اُر کوئی مسافر تمھاری زمین پر تمھارے ساتھ سنوت رہے تم اس کو مت ستاؤ بُد مسافر کو جو تمھارے ساتھ رہتا ہے ایسا جافو جیسے اپنے گھر میں پیدا ہوا ہے بُد تم اس کو یہاں رہو جیسے آپ کو گرتے ہو۔

۱۲۔ تم حکومت کرنے میں پیہش کرنے میں تولنے میں ناپنے میں بے نصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام:

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے، حضرت عیسیٰؑ کی

بعثت کا مقصد، حقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی۔ یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے اخلاق میں بھی جھلکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی توراۃ، حضرت داؤد کی زبور، حضرت سلیمان کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے ان کو یک جا اپنے مشہور و عظیم ان کے سامنے پیش کیا اس مشہور اخلاقی وعظ میں یہ ترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔

دل کی غریبی، غمگینی، صدم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگزر، پاکدامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریائی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو چہ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں، ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں بنی اسرائیل نے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں اور حضرت عیسیٰ کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور غلطی شریعت کے اصل روح و معنی کو جھوٹا کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا اس لیے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں ان سب کو استقصاء کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا اور ان کے حصول کی تائید کی گئی۔ گزشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت ﷺ کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصاء کیا اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا۔ ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست:

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، عہد بے عملی کی مذمت، عفو و درگزر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، اللہ کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور یتیم خانوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سالکوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفاء کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدق و خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گتھگاری پر اثر نثری سے بات کرنا، زمین پر انڈا نہ

چند صلح ہوئی تھی، واثاق ایمانی برادر، انسانی برادری، اکل حلال، روزی حلال، صلح کرنا، تجارت کرنا، گند سڑی کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا، ناشی خود کشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت اس کے مال و جائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور قوس میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرعی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، سزا اور مجاہد خیانت کی برائی، آنکھ کاٹ اور دہ کی باز پرس، نیکی کے کام کرنا، غوغا سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درمندرہدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں سے بتوں تک کو برا نہ کہنا، فیصدہ میں عدل، انصاف، دشمنوں تک سے عدل، انصاف، صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان، گھرنے کی برائی، انا ہے کی مذمت، فسق و فجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ زہنی اور دوسرے کے مال و بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقویٰ اور پائیزی کی پاکبازی، جتنے کی برائی، رفقا میں وقار و متانت، مجالس میں حسن خلق، ضعیفوں، مزدوروں، درویشوں کے ساتھ نیکی، شوبہ کی اذیت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغل خوری، طعن زنی اور تہمت لگانے کی ممانعت، جسم و جان اور پیڑوں کی پائیزی اور طہارت، شرمگاہوں کی ستر پوشی، رات کو نہ بھڑکنا، یتیم کو نہ دہانا، اللہ کی نعمت و عطا کرنا، غیبت نہ کرنا، بدعتی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشہ کی ممانعت، اثبات قدم، استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی، الزامی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ بھاگے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جو اٹھیلنے کی ممانعت، بھوؤں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست:

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن پاک ہے، ان کے ملوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات بار یک ٹاپ کے بڑی قطعے ۸۷ صفحوں میں ہیں جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ذہانی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں، ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و صفات کا کوئی سیا جز نہ ہوگا جو داعی اسد شریک تعلقین کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔

صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، مسایلوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرضداروں پر

احسان، فریادیوں کی فریادیں، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بد زبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، صلہ و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، غفودہ رنگہ، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فحاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھ میں بااجازت داخل ہونا، دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفیق، نرمی، قناعت اور استغناء، گداری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلی خوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض و کینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع و خاساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پر مدح و ستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول زری کی ممانعت، کبر و غرور کی مذمت، ہلسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احتیام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غمخواری و غمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضاء، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا، فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت اور دورخی چار کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خوری، زنا کاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست احباب کی ملاقات، سلام و تحیت، مصافحہ و معاف، دیگر آداب ملاقات، آداب مجلس، آداب طعام، آداب باس، آداب نشست و برخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ خلائیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصاء:

انسان بڑا بہانہ جو اور حیدہ طلب واقع ہوا ہے اس کے لیے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بد اخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچ جائے اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیئے جائیں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اس کی توضیح کے لیے امر و نہی دونوں کی ایک ایک دودھ و مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ و خیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر و زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جزء کی

تفصیل ساری تو راقہ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غدا یا سونے چاندی کے مالک پر مشر یا زکوٰۃ فرض اور ان چیزوں میں فرض ہے شریعت محمدی نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد و زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی وہ اجناس مقرر کردیے جن میں مشر یا زکوٰۃ واجب ہے ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب چھراہ اند میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا۔

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (بقرہ ۲۷۰)

لو کہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں! بھلا ہے۔ جو تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تعین ضروری کی کہ تم خود اپنی ضرورت رک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو تو یہ تمھارے مال خلق کی دلیل ہے انصار جنھوں نے خواہ مخواہ اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں ان کی تعریف میں اللہ نے فرمایا۔

﴿يُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (حشر)

وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان کو حاجت ہو۔

صحابہ کی مدح میں فرمایا۔

﴿يُضَعِفُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حَتِّهِمْ مِنْكُمْ وَأَنْفُسَهُمْ سِيرًا﴾ (۶)

خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھاتے ہیں۔

قرآن پاک سر اپنا غاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اس شریعت و وحی اللہ کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں جو بڑی گلی خراب اور گلی ہو قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ و تصفیائی کے۔ جسے جو اس خیرات کا مقصد ہے نفس کی وراثات و آواگی ظاہر کرتا ہے فرمایا۔

﴿يَسْأَلُونَكَ سِرَّ خَيْرٍ أَمْ غَيْرِ خَيْرٍ قُلْ سِرُّ خَيْرٍ مِّنْ شَيْءٍ وَأَنَّهُ عَصِيَّةٌ﴾ (۱۰)

تم نے پوری نیکیوں کا پوچھا ہے اب تم اس میں سے تم نے خرچ کرنا جو تم کو محبوب ہے اور جو بھی تم خرچ کرو اللہ کو اس کا صلہ ہے

پھر فرمایا۔

﴿سَاءَ مَا يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ ضَلُّوا مِنْ حَيْثُ مَنَاصِرُ الْأَرْضِ وَلَا يُخْبِرُونَ أَحَدًا﴾ (۱۱)

تم نے سب سے برا کہا ہے کہ تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا سب سے برا کہا ہے اور تم نے اس کی تعریف نہیں کی ہے

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَٰؤُلَاءِ﴾ (۱۲)

اے ایمان والو! جو تم کہتے ہو ان میں سے کی اچھی چیزیں اور جو تمھارے لیے زمین سے نکالے ہیں اس میں سے

چھوڑ دو اللہ کی راہ میں دوا اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرنا کہ تم کو کوئی ایسی چیز ہے تو نہ لو مگر یہ کہ چٹم

پوشی کر لو اور یقین کرو کہ اللہ ہے پروا اور خوبیوں والا ہے۔

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ ”وہ ہے پروا اور

خوبیوں والا ہے۔“ یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی اس کا یہ سبب

نہیں کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے کہ وہ ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے اس لیے خوبی ہی وہ چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں جن کی کفالت کا بار تم پر ہے اہل وعیال دست نگر، عزیز و قریب پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر۔

﴿يَسْتَنْوِثُ مَا دُعِيَ فَيُفْقُونَ قُلْ مَا اسْفَقْتُمْ مِمَّنْ حَبِرَ مَسْئُورِينَ وَافْقَرِينَ وَالْيَتَامَىٰ

وَالْمَسْكِينِ وَانْسِ السَّيْلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ حَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ (۲۶۰)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ خیرات کریں کہہ دے جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو وہ ماں باپ رشتہ داروں یتیموں مسکینوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ اس سے واقف ہے۔

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ”ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو فرمایا ”مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے کچھ محتاجوں کو کھلائے صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو فرمایا تو غم رسیدہ حالت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے، یہ بھی صدقہ ہے۔“ دوسرے موقع پر فرمایا ”اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے راستہ سے پتھر کاٹنا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔“ غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد امت و لاؤ نہ اپنا احسان اس پر جتاد نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو نہ نمائش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے آنحضرت ﷺ کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا ”فرمایا۔“

﴿وَلَا تَنْسُوا نَسْتَكْثُرُ﴾ (۱۷۱)

اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَنْسُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَلَا ذِي كَدٍّ يُفْقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ

وَلَا يَوْمُ مَنِّ بَيْنَهُ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۲۶۰)

اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمُعْصِرَةٌ حَبِيرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يُّشْفَعُ بِهَا إِلَىٰ وَاللَّهُ عَنِّي حَبِيمٌ﴾ (۲۶۰)

اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

ریاء اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دوا اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصد ہو تو دکھا کر بھی دے سکتے ہو۔
﴿اِنْ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَسَعَمَّاہِیْ وَاِنْ تُحْفُوْہَا وَتَوْتُوْہَا الْفُقَرَاءُ فَہُوَ حَبِیْرٌ لَّکُمْ وَیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّئَاتِکُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ حَبِیْرٌ﴾ (بقرہ ۲۷۰)

اگر تم خیرات کھول کر دوتو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غریبوں کو دوتو وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالِہُمْ بِاللَّیْلِ وَالنَّہَارِ سِرًّا وَّعَلٰنِیَۃً فَہُمْ اَجْرُہُمْ عِنْدَ رَبِّہُمْ وَلَا حَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (بقرہ ۲۸۰)

جو لوگ اپنا مال رات اور دن چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہلکی اور خوشی ہونی چاہئے جبر و کراہت سے نہ ہو کہ یہ منافقت کی نشانی ہے۔
﴿وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَہُمْ کَرِہُوْنَ﴾ (توبہ ۷)
اور وہ اللہ کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔

صدقہ و خیرات پکے دل سے اور صرف اللہ کے لیے ہونی چاہئے۔

﴿وَمِثْلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالِہُمْ اِنْعَآءَ مَرٰصَاتٍ اللّٰہِ وَتَشِیْنًا مِّنْ اَنْفُسِہُمْ کَمِثْلِ بَرۡئَۃٍ﴾ (بقرہ ۲۶۶)
اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود اللہ ہو۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا اِنْعَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ حَبِیْرٍ یُّوْفَّ لَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُنْصَمُوْنَ﴾ (بقرہ ۲۷۰)
اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور جو خیرات کرو گے وہ تم کو پوری ملے گی تمہارا حق کچھ دہانہ رہے گا۔

صدقہ و خیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ:

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے

محفوظ نہیں رکھا جاسکتا اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کھیت محفوظ نہیں رہ سکتے مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا لیکن اس کی تجارت کرتا ہے ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

﴿قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَعَنَ اللَّهُ الْحَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَمَانِعَهَا وَمَتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمَعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُولَةَ إِلَيْهِ﴾ (ابوداؤد کتاب الاشراب)

آپ ﷺ نے فرمایا اللہ شراب پر اس کے پینے والے پر اس کے پلانے والے پر اس کے بیچنے والے پر اس کے خریدنے والے پر اس کے نچوڑنے والے پر اس کے اپنے لیے نچوڑانے والے پر اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے لعنت کرتا ہے۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (تعریف) بتائے عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعیین فرمادی۔

﴿قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّهُنَّ أَلْسُنُ الْعَمْرِ حُمْرًا وَأَلْسُنُ الْعَمَلِ حُمْرًا وَأَلْسُنُ الْبِرِّ حُمْرًا وَأَلْسُنُ الشَّعِيرِ حُمْرًا﴾ (ابوداؤد کتاب الاشراب)

آپ ﷺ نے فرمایا انگوٹھ سے بھی شراب بنتی ہے کھجور سے بھی شہد سے بھی گیسوں سے بھی اور جو سے بھی۔

﴿قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ الْحَمْرَ مِنَ الْعَصِيرِ وَالزَّبِيبِ وَالتَّمْرِ وَالْحِطَّةِ وَالشَّعِيرِ وَالْدَّرَةِ وَأَبَى أَنْ يَهَاجِمَ عَنْ كُلِّ مَسْكِرٍ﴾ (ابوداؤد کتاب الاشراب)

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ شراب انگوٹھ، منقہ، کھجور، گیسوں، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑ سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی اس لیے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھی لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور محمد یدان کو شامل نہ ہو اس لیے آپ ﷺ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسام شراب پر حاوی تھی۔

﴿كُلُّ مَسْكِرٍ حُمْرٌ وَكُلُّ مَسْكِرٍ حَرَامٌ﴾ (ابوداؤد، احمد، بخاری، مسلم)

ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

﴿كُلُّ شَرَابٍ أَسْكِرَ فَهُوَ حَرَامٌ﴾ (ابوداؤد، احمد، بخاری، مسلم)

ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لیے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا حرمت شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے

مستحب ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے اس لیے فرمایا۔

﴿ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام﴾ (ابوداؤد کتاب الاشراب)

جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں، تاہم اعصاب میں ایک حد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کی بھی ممانعت فرمائی۔

﴿نہی رسول اللہ عن کل مسکر و مفر﴾ (ابوداؤد کتاب الاشراب)

آنحضرت ﷺ نے ہر فحشی و مخدر چیز سے منع فرمایا۔

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی فحشی چیزیں استعمال کریں جن پر عرفا خمر کا طلاق نہ کیا جاتا ہو عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی جس کو داوی کہتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا۔

﴿یقول یشرس ناس من امتی الحمر سموہا بغير اسمها﴾ (ابوداؤد کتاب الاشراب)

آپ نے فرمایا یہ میری امت میں پتھوٹ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔

اس کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی۔

﴿نہی عن الدباء والحتم والمذقت والمقیر﴾

آپ ﷺ نے بدو بنزدیہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی منع فرمایا۔

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی اس لیے آپ ﷺ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرمادیا اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی چنانچہ چند قیمتی بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوئی، حضرت ابو طلحہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنایا جائے، لیکن آپ ﷺ نے اجازت نہ دی۔

ایک بار دیم حمیری نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں اس لیے گیسوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے انھوں نے کہا ”ہاں“ آپ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو انھوں نے کہا، لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے ارشاد ہوا کہ ”اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو“۔

۱۔ ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشراب اس سرکہ کے جواز و عدم جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

۲۔ ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشراب۔

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی انجیل نے بھی "تاروا نفع" سے لوگوں کو روکا ہے تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربانی حقیقت ربانے اقتدا کرنے کن چیزوں میں کس کس قسم کا رہنا جائز ہے اس کی پوری تفصیل کی اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رہا اس ظلم میں جو لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

﴿لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَكْلَ الرِّبَا وَمُؤْكَدَهُ وَشَاهِدَهُ وَكَاتِبَهُ﴾ (۱۰۰:۱۰۰، کتاب البیوع)
آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے سود کھلانے والے اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔

رشوت کی حرمت میں استقصاء:

﴿لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الرّاشی والمرتشی﴾

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل استقصاء اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا دیا جائے اس چیز کا کلیتہً قلع و قمع نہیں ہو سکتا۔

مسکئی اخلاق کی کمزوری:

مسکئی فلسفہ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور ہردو قسم میں کر دیا تھا یعنی تواضع و خساری، فروتنی، عجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمیینی وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی حالانکہ دنیا کی امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے جس قدر ایک مقام پر تواضع و خساری کی ضرورت ہے اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزت نفس کی حاجت ہے جس طرح غفور و درگزر بندہ ممتی کا کام ہے اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لیے ضروری سہی مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہئے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹھے کا اعتراض مسکئی اخلاق پر:

جرمن فلاسفر نٹھے نے مسکئی اخلاق پر جو بے جا اعتراضات کیے جو تیر برسوں سے اور ان مسکئی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے وہ اسی لیے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم، عزت نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے وہ کہتا ہے۔

”مسیحیت نے ہمیشہ کمزور پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبع انسانی کی تمام خوبیاں اور انہ قوتوں کا استیصال کر دینا اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔“ ۱

اسلامی اخلاق کا اعتدال:

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا ہے جس نے مسیحی نظام اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا جو ہر شخص ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی پست نے بندگی ادنیٰ نے اعلیٰ کی اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریتہ قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلاف استعداد:

اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو، تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بردبار بھی ہیں اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پر امید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی وں بھی، ظالم و زبردست بھی ہیں اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہو سکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح:

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو، اس کو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پر امید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو چھتم کو مل رہا ہے، وہ اللہ سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے اللہ سے مانگنے والا کر دے، وہ ذلیل و خوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مغرور بنادے، وہ اچھی قوتوں کو نشوونما دے اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کر دے۔

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوت غضب اور قوت شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی ممانعت کی قوت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے

مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔ غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے مثلاً خود داری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بندہ ممتی، بردباری، استقلال، ثبات قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبہ حق، جدوجہد، سعی و محنت، جہاد پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور ناست کے قالب میں ظہور کرتی ہے اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے تو اس کو محنت کہتے ہیں یہی صفت مختلف سانچوں میں ذحل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے یعنی پاکدامنی، پرہیزگاری، جود و سخا، شرم و حیا، صبر و شکر، قناعت، بے طمع، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ پھر یہ صفت جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس سے حرص و طمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوہامی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصاف ذمیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق:

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غصبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توازن اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع و محل برا ہوتا ہے اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت غضب کو فنا کر کے 'دشمن کو پیار کر دو' اور نہ یہ کہ اپنی قوت خواہش کو فنا کر کے بھر دور ہو اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گزار دو بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کر دو اور خدائی دشمنوں سے حق میں دعائے خیر کرو کہ انھیں ہدایت ملے اور اللہ کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے غصہ کے مٹانے والے کی نہیں اس نے ﴿وَ الْكَافِرِينَ الْعَبِطُ﴾ کہا ہے ﴿وَ الْعَاقِدِينَ الْعَبِطُ﴾ نہیں کہا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں :

دنیا میں علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جدوجہد جو کچھ ہے وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں اگر یہ دونوں قوتیں یک قدم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدمی دنیا مر جائے نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں نہ عدل کا وجود ہو نہ امن و امان کا نشان ملے نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے نہ انسان کی بلند ممتی، استقلال، ثبات قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایاں ہوں تو قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور اللہ کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت و جنبش کا نام

مسکینی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے بلکہ سب کا غصہ اور ناچیز خواہش بری چیز ہے نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزیں ہیں اسی قدر وہ معاصی بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً بے آبروئی بے غیرتی ذلت پسندی دناست بے طبعی تمسق نام حوصلگی بے عملی مستی فاقہ زدگی بھی برے ہیں اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے اس نے جہاں ان کو ﴿زحماً بنہ﴾ (آپس میں رحم) اور ﴿ادباً علی الخواص﴾ (مومنوں کے فرمانبردار) کی تعلیم دی وہیں ﴿شداً علی الکفار﴾ (کافروں پر بھاری) اور ﴿عزاً علی الکفر﴾ (کافروں پر تراں) بننے کی بھی تعلیم دی اور ان کو بتایا کہ عزت صرف اللہ اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے ﴿ولیس العزۃ ولسناہ ولسناہ﴾ مسکینی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جب تک اسلامی فلسفہ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انھوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکی کا اعتراض مسکینی اخلاق پر:

لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دور کی جہد میں رہتا ہے

”لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام ترمیمیات کا پیدا کردہ ہے۔۔۔۔۔ اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا ترقی تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے لیکن اسے بالکل منادینا جو خانقاہانہ زندگی کا قطع نظر ہے کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مترادف ہو جاتا ہے اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیاہ زور دیا اور اس سے یہ منظرہ چھایا کہ ایک مردانگی اور سہل خودداری انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف کوئی آزاد خیالی خوش معاملگی بلند حوصلگی غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے وہ یہ تھوٹک عاقول میں نہیں پائی جاتی بلکہ ان کے بجائے دناست پست ہمتی مظهر فی بزدلی اور گداری کے منظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں ان سے آخر الذکر میں خالی ہیں“ (فصل گیارہ)

اسلام اور بلند اخلاق:

لیکن اس کے باقیابل معلم اسلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے

فرمایا۔

﴿ان اللہ یحب معالی الامور و یغض سفافہا﴾
بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات امور کو ناپسند کرتا ہے۔

”معالی امور“ سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام اور محقرات سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا۔ کہ ایک مسلمان کو اللہ کا دوست بننے کے لیے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطہ نظر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔

﴿المؤمن القوی خیر وأحب إلى الله من المؤمن الضعیف و فی کل حیر احرص علی ما یبصع و استعن بالله و لا تعجز و ان صدت شی فلا تقل یوانی فعلت کان کذا و کذا و لکن قل قدر الله و ما شاء فعل فان یو تفتح عمل الشیطان﴾ (صحیح مسلم کتاب تہذیب باب فی امر بالقوة)

کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور اللہ کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے بروہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خوشی کر اور اللہ سے مدد چاہ اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ ”اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا“ بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے اور جو چاہا اس نے کیا کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔

تقدیر، توکل، صبر اور شکر:

یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قض و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبدات قبسی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی سے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی پر امید، استقلال اور ثبات قدم پیدا ہوا مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہئے پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ اللہ پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہئے اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ اللہ کا مشاہدہ ہی تھا (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے۔

﴿فاداعرمت فتوکل علی الله ان یتحکم المتوکیب ان یضربکم الله فلا عاب لکم و ان یخذلکم فمن دالذی یضربکم من بعدہ و علی الله فیتوکل المؤمنون﴾ (مؤمن۔ ۱۰)

جب تو پکارا ارادہ کر لے پھر اللہ پر بھروسہ کر بیشک اللہ متوکلوں کو پیر کرتا ہے اگر اللہ تمھاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمھاری مدد کر سکتا ہے اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

﴿ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نُرَاهَا إِنَّ ذَلِكُمْ عِنْدَ اللَّهِ بِسِيرٍّ ۖ لَكِنَّا لَا نَحْكُمُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُخْتَلَفٍ ۚ فَخُورٌ ﴾ (حدیدہ ۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الہی) میں درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے یا اس سے پہلے تاکہ اس پر جو تم سے جا تا رہے غم نہ کرنا اور جو تم کو اللہ سے اس پر اترا یا نہ کرنا اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر تو کل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں ہستی اور دعائت کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرات، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لیے ہے اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے ان کو مشکلات میں اللہ کے دوسرے بزرگ یوں کی یہ دعا سنائی گئی۔

﴿ رُسُلًا أَفْرَأْ غَيْبًا صَبْرًا وَثَبَّتْ أقدامًا وَانْصَرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴾ (بقرہ ۲۳۰)

اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر و ثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافروں کو فتح یاب کر۔ اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا۔

﴿ وَكَيْسٌ مِمَّنْ سَبَى قَتْلَ مَعَهُ رَثِيلٌ كَثِيرٌ فَمَا وَهَلُوا إِذَا اصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا صَعَفُوا وَمَا سَكَنُوا وَلِلَّهِ يُحْكُمُ النَّصْرَ ۚ وَمَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَأْتُوا رُسُلًا يُعْصِرُوا دُونَهَا وَمَا رَأَاهَا فِي أَمْرٍ وَثَقَتْ أقدامًا وَانْصَرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴾ (آل عمران ۱۵)

اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو رہے تھے بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی تو اللہ کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ تڑپے ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہمارے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ (آل عمران ۲۰)

اے وہ جو ایمان لائے ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو تاکہ کامیاب ہو۔

ان آیتوں سے معلوم ہو گا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثبات قدم کی ایسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے اس طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو:

اسکی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھ ہے یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسروں نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ ال کا فعل ہے جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقی محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی جس پر بہ خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو جو تم کو بددعائیں دیں ان کو دعاؤں جو تمہارا قصور کریں ان کو معاف کرو اور جو تم پر ظلم کریں ان کے ساتھ انصاف کرو فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَقْوَامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَحْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اْعْدِلُوا ۚ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (۴۸:۱)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہو جایا کرو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے انصاف کرو کہ انصاف کرنا پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے اور اللہ سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

﴿وَلَا تَسْتَوِ الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ دَفْعُ بِاتِّئِي هِيَ الْحَسَنُ فَإِذَا الْبُيُوتُ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَذٰتِ وَلٰٓئِي حَمِيَّةٌ ۚ وَمَا يُنْقِهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُنْقِهَا إِلَّا ذُو حَصٍّ عَظِيمٌ ۚ وَأَمَّا يُرْعٰكُ مِنَ الشَّيْطٰنِ بَرٌّ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (نور مجید ۵۰)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں برائی کو بھلائی سے دفع کرو تو دفعہ وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

۱۔ اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲۔ اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسن سوک کی تاکید کی گئی ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دشمن ہیں کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرز عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

۳۔ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاق محمدی کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

۴۔ دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو اللہ

کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابن عباسؓ جو صیہ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: ۱۔
 ”اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور غفور و درگزر کرنے کا حکم دیا
 ہے، وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان سے آگے سر
 جھکا دے گا۔“

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سن کر چپ
 رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ
 بول اٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ گئے، حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ ﷺ مجھ سے خفا ہوئے؟
 فرمایا: ”اے ابو بکر جب تک تم چپ تھے اللہ کا فرشتہ تمھاری طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔“ ۲۔
 آپ ﷺ نے فرمایا: ”صلہ رحم یہ نہیں ہے کہ صلہ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحم کر دے، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم
 کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کر دے، یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی
 خوبی ہے۔“

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں آ کر عرض کی یا رسول اللہ مجھے وہ بات بتائیے جس کے کرنے سے
 جنت مل جائے، آپ ﷺ نے اس کو چند باتیں بتائیں، منجملہ ان کے فرمایا: ”ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔“ ۳۔
 اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی دشمن نہیں ہو سکتا، لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے
 ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی غفور و درگزر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے۔

﴿قُلْ تَدْبِیْ اٰمَنُوْا یَعْرِضُوْا اَللّٰہُ لَا یَرْجُوْنَ اٰیٰمَ اَللّٰہِ لِیُخْرِیْ قَوْمًا مِّمَّا کَانُوْا یُکْسُوْنَ﴾ (بقرہ: ۱۹۰)
 (اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے، معاف کر دیا کریں، تاکہ اللہ ایسے
 لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ ”ریا کار فریسیوں“ اور ”سانپوں اور سانپوں کے بچوں“ ۴۔ والی مسیحیت کے واعظ
 میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و واعظ میں ہے، جس نے فتح بن کر مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں، بہ
 یک دفعہ مدہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا، جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیا سا رہ چکا تھا، ۵۔ جس نے اس
 کو معاف کیا، جس نے اس کے قتل یا گرفتاری سے اسے اہل مدہ کا اشتہار و انعام من کر اس کا تعاقب کیا تھا، ۶۔ جس نے خیبر

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۲۷ و ابن جریر جلد ۲۳ ص ۶۸۔ مصر۔

۲۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب۔ باب فی الانصار۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۸۶۔

۴۔ مستدرک حاکم کتاب المکاتب ج ۲ ص ۲۱۷ حیدر آباد دکن۔

۵۔ انجیل متی ۲۳: ۲۵-۲۳۔

۶۔ صحیح بخاری باب فتح مکہ۔

۷۔ صحیح بخاری کتاب الحجۃ۔

میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا^۱۔ جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا^۲۔ جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا^۳۔ جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا^۴۔ جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دست کو معاف کیا^۵ جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا^۶۔ جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ بخواب تھا اپنے ایک تنج بکف حمد آور کو قابو میں پا کر معاف کیا^۷۔ جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی جنہوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی^۸۔ جس نے دشمنوں کے حق میں بد دعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں بلکہ رحمت کے لیے آیا ہوں^۹۔ انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی شان بتائی گئی۔

﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُواكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُطَاهَرُوا عَلَيْكُمْ أُولَٰئِكَ لَا مَتَّعْتُكُمْ إِلَّا الْآلِهَةَ عَاهَدْتُمْ إِلَيْهِمْ أَلِيَّتَهُمْ إِنْ لَمْ يَنْقُصُواكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُطَاهَرُوا عَلَيْكُمْ أُولَٰئِكَ لَا مَتَّعْتُكُمْ إِلَّا الْآلِهَةَ عَاهَدْتُمْ إِلَيْهِمْ أَلِيَّتَهُمْ﴾ (توبہ)

لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انہوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقرر تک پورا کرو اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

کفار و مشرکین سے عدم موالیات:

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالیات سے منع کیا گیا ہے حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے۔ یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے ان مخالفوں کے میل جول رازداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے منادینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو یا غلط فہمی اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں چنانچہ اس قسم کی آیتیں۔

۱۔ صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی۔

۲۔ صحیح بخاری فتح طائف۔

۳۔ صحیح بخاری باب فتح مکہ۔

۴۔ کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہار بیان فتح مکہ ہمار بن اسود۔

۵۔ جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۃ فتح ص ۵۴۰۔

۶۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۲۰۸۔

۷۔ ابن سعد غزوہ طائف۔

۸۔ فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۶ مع باب احد۔

۹۔ صحیح بخاری مبحث النبی او مشکوٰۃ و اخلاق النبی بحوالہ مسلم۔

﴿لَا تَتَّخِذُوا الْمُشْرِكِينَ حُكَّامًا فِيكُمْ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَيَسَّسْ لِّهٖ شَيْءٌ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً﴾ (آل عمران ۳)

ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو پناہ دے نہ بنائیں تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کوئی عذاب نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا أَمْوَالَكُمْ وَأَوْلِيَاءَ الَّذِينَ مَتَّعْتُمُوهَا بِأَمْوَالِكُمْ فِي بَيْنِ يَدَيْنِ مَتَّعْتُمْ مِنْكُمْ قَوْلَتْ لَهُمْ تُصْنَعُ لِلَّذِينَ آمَنُوا ۚ﴾ (آل عمران ۳)

ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے۔

اسی موقع کی ہیں ایم اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی فطرۃً ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری اور میحہ گی ہوگی جو اس حق کے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہل حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور مواصلات سے اسلام نے روکا ہے اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو ”شیرازۃ الصالحین“ کے اس اعلان کے ہیں۔

”یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صبح کروانے آیا، صبح کروانے نہیں بلکہ توار چلنے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے ٹکے ہوں گے جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں“ (متی کی بحیل باب ۱۰-۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گنہگاروں کے ساتھ تھی وہ یہودیوں کے لیے بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر ماں و دوست ساز و سامان اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پدہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کفر داروں کی عاقبت بنی اور دورانہ پیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے دشمنوں سے ساز باز رکھیں تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَإِنَّهُمْ فِي يَدَيْ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۚ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَحْشِي نَ تَصِيبُ دَائِرَةً ۚ فَعَسَىٰ إِنَّ يَأْتِيَنَا الْفَتْحُ أَوْ أَمْرٌ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْحَوْنَ عَلَىٰ مَا اسْرَوْا فِي أَنفُسِهِمْ بِدِينٍ ۚ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهْلُ الْأَدْنَىٰ ائْتَمَرُوا بِأَمْرِ اللَّهِ جَهْدًا بِمَا هُمُ أَهْلُهُمْ نَحْمَدُكُمْ حَصَّتْ أَعْمَالُهُمْ فَاصْبَحُوا حَسْرِينَ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِيَنَّ اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ

اَسْمُوْا مَبِیْنِ اَعْرَیْہِ عَلٰی الْکَافِرِیْنَ ﴿۹۰﴾

اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ وہ آپس میں ایسے دوسرے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے وہ انہی میں سے ہے اللہ بے انصاف لوگوں کو نہیں دیتا اب تو ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوزکران سے ملے جاتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو ذرا ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے تو اللہ شاید جہد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے تو پھر وہ اپنے دل کی چھٹی بات پر پچھتانے لگیں اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں خراب گئے ان کے عمل پھر رہ گئے نقصان میں اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ کا کچھ ہرج نہیں اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لائے گا جن سے اللہ راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہوں گے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنُکُمْ حُرُوْمًا وَّلَعَنَ الَّذِیْنَ وُتُوْا الْکِتٰبُ مِنْ قَبْلِکُمْ وَالْکٰفِرَ اَوْلِیَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۱﴾﴾

اے ایمان والو! اہل کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو نفی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر یقین رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کارِ محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بَطٰنَہٗ مِنْ ذٰوِیْکُمْ لَا یَاۡلُوْکُمْ حٰلًا وَّذٰوِ مَا عَسٰتُمْ قَدْ بَدَلَتِ الْاَعْصٰۤءُ مِنْ اٰمُوْاہِمُمْ ۚ وَمَا تُحْمٰی ضُوْرُہُمْ اَکْثَرُ قَدْ بَیَّسَ لَکُمْ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾

(آل عمران ۹۲)

اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے جتنی تم کو تکلیف پہنچے ان کو خوشی ہے دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو ان کے جی میں چھپا ہے وہ اس سے زیادہ ہے ہم نے تم کو باتیں بتا دیں اگر تم کو عقل ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی چاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے جس کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے سب سے زیادہ تصریح سورہ ممتحنہ میں ہے فرمایا۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوْیْ وَّعَدُوْکُمْ وَّلِیَآءَ یُنْفِقُوْنَ لَیْہِمُ بِالْمُوْدَّةِ وَقد کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِنَ الْحَقِّ یُخْرِجُوْنَ الرُّسُوْلَ وَاِذَا کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ رَتَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ حَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَاتَّعٰۤا مَرْضَیّٰتِیْ تُسْرِوْنَ لَیْہِمُ بِالْمُوْدَّةِ وَاِنَا اَعْلَمُ بِمَا اُخْفِیْتُمْ وَاِنَا اَعْلَمُ بِمَا اَعْمَلْتُمْ وَمَنْ یُّفْعَلْہُ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ۚ اِنْ یُشْفَوْکُمْ بِکُوْنِکُمْ لَکُمْ اَعْدَآءُ وَیَسْتَظُوْۤا اَیْدِیْہُمْ وَاَلْسِنَتُہُمْ بِالْاِسْوَاءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ ۚ لَنْ تَمْعَمَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَا

أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ﴿مختہ﴾

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو اور وہ اس سچی کے جو تم کو ملی منکر ہیں وہ رسول کو اور تم کو اس لیے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے اور تم میری راہ میں لڑائی اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم ان کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو جو تم میں سے ایسا کرتا ہے وہ سیدھی راہ بھوتا ہے اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے پائیں تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہاری تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور برائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اور اذیت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح کیے

﴿لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الدِّينِ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الدِّينِ قَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَطَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الصَّمُونَ﴾ (مختہ)

اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں نہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا تو وہی بے انصاف ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمہاری فتح ہوگی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے

کی فرمایا:

﴿عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الدِّينِ عَازِيَتُمْ مِنْهُمْ مَوَدَّةً ۚ وَاللَّهُ قَدِيرٌ﴾ (مختہ)

امید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ قدرت والا ہے۔

ان آیتوں کا مطلب ان کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کر دیا کہ قریش خبردار ہو جائیں آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی آپ نے دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں وہ خط آیا تو آپ نے حاطب سے پوچھا کہ یہ کیا ہے عرض کی یا رسول اللہ جلدی نہ فرمائیے بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں لیکن ان سے میرا کوئی نسب تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی جس کا مکہ والے لحاظ کرتے تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ

احسان کروں تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں میں نے دین حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا آپ نے فرمایا تم بدروالے لوگ ہو اللہ نے تمہارے گناہ معاف کئے ہیں اس پر یہ آیت اتری 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا اِلٰهَ الْاِيْمَانِ وَالْوَالِدَ الَّذِي فِيكُمْ مِنْكُمْ اَدُوًّا ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَا يَحْمِلْهُ اللّٰهُ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ يَكْتُمُ الصِّغَرَةَ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ خَفِيًّا' (۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱) اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہد عتیق میں بھی مذکور ہیں زبور میں ہے۔

”اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا پس اے خونو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ“ کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں تیرے دشمن تیرا نام بحث لیتے ہیں اے خداوند کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا جو تیرا کینہ رکھتے ہیں کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں بیزار نہیں میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں میں انھیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں۔“ (۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱)

یسوع کے صحفہ میں ہے۔

”اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپٹو جو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ہیں تو یقیناً جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گردہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا بلکہ وہ تمہارے لیے پھندے اور دام اور تمہاری بظلوں کے لیے کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانٹے ہوں گے یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے اللہ نے عنایت کی ہے نابود ہو جاؤ گے (یسوع باب ۲۳-۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں منکروں ظالموں بدکاروں اور گنہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے۔

﴿وَذُو الْاُلُوْا تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ۚ فَلَا تَحْذَرُوْا مِنْهُمْ اُولٰٓئِیْہٗا حَتّٰی یُہَاجِرُوْا مِنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ (نہ۱۰)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انھوں نے کفر کیا تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔

﴿وَإِذَا رَأٰیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْصُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْصُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غٰیِرِہٖ ۚ وَاَمَّا یُنٰسِیْتُ الشَّیْطٰنَ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظَّٰلِمِیْنَ﴾ (نہ۱۱)

اور جب تو ان کو دیکھے کہ جو میری آیتوں کی شان میں لغو جھگڑتے ہیں تو ان سے کنارہ کر لے یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ان گنہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔

﴿وَقدْ نَزَّلْ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اِنْ اٰدَا سَمْعُکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفِرُ بِہَا وَیُسْتَہْزِئُ بِہَا ۚ فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰی یَخُوْصُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غٰیِرِہٖ اِنَّکُمْ اِذَا مَثَلْتُمْ﴾ (نہ۱۲)

اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو نہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔

یہ احکام اس لیے ہیں تاکہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو سینٹ پال کے ان فقرہوں کے ہیں۔

مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نمرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے اور اگر وہ ٹپڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز نہ آجائیں ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے اس موقع کی دو آیتیں سورہ توبہ میں ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وَنَسِ الْمَظْهِرُ،
يَحْتَفُونَ بِآلِهِ مَا قَالُوا وَنَقَدَ قَالُوا كُنْهُ الْكُفَرُ وَكُفَرُوا بِعَدَاةِ اللَّهِ لَمَّا لَمْ يَأْتُوا
وَمَا يَقْضُوا إِلَّا أَنْ أَعْلَنَهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ قُضِيَّةٍ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ وَإِنْ يَتُوبُوا
يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَالَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾ (توبہ ۱۰)

اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کہا حالانکہ انھوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ پانہ سکے اور انھوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا تو اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لیے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ نہ پھیریں تو اللہ ان کو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہو گا نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے جو دو آیتیں ہیں وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں تین رکوع کے بعد سورۃ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَبُوءُ بَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلِيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَغُلِّظُوا بِاللَّهِ
مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (توبہ ۱۶)

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیے ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔ تحریم اور ایلاء کے موقع پر بھی جب بعض منافق اہل بیت نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وَنَسِ الْمَظْهِرُ﴾ (توبہ ۲۴)
اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی سختی بری جگہ ہے۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کئے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورہ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحمہ لی کی تعریف ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (فتح ۳)

محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔

اشداء علی الکفار کا یہ ترجمہ کہ ”وہ کافروں پر سخت ہیں“ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے اس لیے محاورہ کے مطابق اشداء علی الکفار کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں ان سے کسی طرح دبتے نہیں چنانچہ علامہ زنجشیری نے شاف میں ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں قاضی بیضادی نے انوار السنن میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں جو سورہ مائدہ کی اس آیت کے ہیں۔

﴿أَذَلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ (مائدہ ۸)

فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے مثلاً سورہ ہود میں ہے۔

﴿بِقَوْمٍ ارْهَطْنِي اَعِزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ﴾ (ہود ۸)

اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔

دوسری آیت میں ہے۔

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (توبہ ۱۶)

تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے

لسان العرب میں ہے۔

﴿وَرَجُلٌ شَدِيدٌ قُوًى وَالْحَمْدُ لِلَّهِ﴾ (جد ۲ ص ۲۱۸)

مروشدید یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔

قرآن پاک میں اشد فؤاد، اشد حنقا، اشد تشبہ، اشد مہم، اشدًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور

ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں۔

﴿ اَشْدُّدْ بِهِ اَزْرِي ﴾ (طہ)

اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔

﴿ وَسَيَنَافِقُكُمْ سَعًا شَدَاذًا ﴾ (نبأ ۷۸)

اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

﴿ وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ ﴾ (ص ۲)

اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔

﴿ فَسَلُّوا الْوَتَاقِ ﴾ (تال ۱)

پھر مضبوط باندھو۔

شدید کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرام کی صفت تھی انہوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروانہ کی تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہو لہان ہوئے مگر جس کو ایک کہا تھا پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کر چکے تھے پھر اس سے انکار نہ کیا آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبے گئے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ ﴿ سَأَلَفْنِي فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (آل عمران و انفال) کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا، وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا ﴿ وَفَدَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (احزاب و حشر) ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔

مخالفتوں کے دلوں میں اسی رعب بٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامان جنگ مہیا رکھنے کا حکم

دیا ہے

﴿ وَاعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِنُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ ﴾ (انفال ۸)

ان کے لیے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے اسی لیے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے اور آنحضرتؐ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے فرمایا جو شخص گھوڑا اللہ کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لیے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لیے باندھتا ہے اس کے لیے پردہ پوش ہے اور جو نہ نش کے لیے باندھتا ہے وہ اس کے لیے عذاب ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدؐ میں نیت کا سوال سب سے ہم ہے اسی لیے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم مواصلات کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی و قوی نفرت اور بیزاری نہ ہو بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور اللہ کے لیے ہو لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے ناراضی:

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا؟ لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے۔ محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے میں اُبھر سکتی ہیں۔ ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبرت ہے برف کا تودہ بن جائے اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات دوسرے سے فنا کر دیا جائے۔ جہہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی مصلحتات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ محمد رسول اللہؐ کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دیا جائے۔ ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزر رانی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نبی کی اعانت اور اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو۔ دوستی و دشمنی رضامندی و ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ اللہ کے لیے ہو۔ الحب فی اللہ و البغض فی اللہ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے ناخوشی و ناراضی دوسرے سے فنا نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے۔ وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا۔ وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا۔ وہ نبیوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا۔ مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا۔ انسان کے سینہ میں صرف یہ ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہو سکتی جیسا کہ قرآن نے کہا:

لَا تَزِدُ الْعَدُوَّ إِلَّا بُرْحَانًا مِّنْ فَسَادٍ فَبِمَا جَاءَ (آل عمران: ۱۰۶)

اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔ اسی مفہوم کو حضرت مسیحؑ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

’دو آدمی دو قدوں کی خدمت نہیں کر سکتا اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو

نے گا اور دوسرے کو تاجیز جائے گا‘ تم اللہ اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے (متی ۶-۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے پولوس نے اللہ اور آدمی

یعقوب ۱۔ نے اللہ اور دنیا 'یوحنا' ۲۔ نے اللہ اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہر کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کا ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف اللہ کے لیے ہونی چاہئے اپنی ذات کے لیے نہیں، یہی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ "ایمان کی کوئی زنجیر زیادہ مضبوط ہے" عرض کی "اللہ اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے" فرمایا یہ کہ "باہمی میل جول اللہ میں ہو، محبت بھی اللہ ہی میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو اللہ ہی میں ہو" مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت نے صبیہؓ سے دریافت کیا کہ "کوئی نیکی اللہ کو زیادہ پیاری ہے" کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا آپ نے فرمایا "تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ اللہ کو یہ نیکی پسند ہے کہ اللہ ہی کے لیے محبت اور اللہ ہی کے لیے مخالفت ہو" ۳۔

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں:

اللہ کے لیے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا نارضا مندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے عیدگی و بیزاری ہو جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں قرآن پاک کی ایک آیت ہے۔

﴿حَسَبَ آيَاتِكُمُ الْإِيمَانُ وَرِئَیْتُهُ فِی قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ الْبَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْمُسْوَیْقَ وَالْعَصِیَانَ﴾ (حجرات)
اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکرہ بنایا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضا مندی کا بنیادی سبب کافرو منافق کا کفر و نفاق ہے یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے فرمایا۔

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ أَعْلَمُ بِشَیْءٍ تَنَازَعْتُمْ فِیهِ﴾ (نساء)
تو اگر وہ کفر سے تو پہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دین تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعۃً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے اور نارضا مندی رضا مندی سے بدل جاتی ہے کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے نہ ملیچھ ہے، نہ چنڈل ہے نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کاٹے

۱۔ یعقوب (۳-۴)۔

۲۔ یوحنا (۲-۱۵)۔

۳۔ مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ۔

گورے اور یورپین اور غیر یورپین کی تقسیم ہے جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابو جہل و ابولہب ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و نجی مومن و موحد ہو کر بلال حبشی، صہیب رومی اور سلمان فارسی کا رتبہ پاسکتا ہے، وہی عمرؓ، وہی ابوسفیانؓ، وہی مکرّمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرِ تروہ ہو گئے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا۔

﴿ادْكُتْهُمْ اَعْدَاءُ فَاتَفَ بَيْنَ قَتْلِهِمْ فَاصْبَحْتُمْ سَعَمْتَهُ اَحِبَّاءُ﴾ (سورہ بقرہ ۱۷۷)

(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم اغت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

نا پسندیدہ و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے تو یہ وندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے تبدیل ہو جاتا ہے، مبشر عالم نے ایسے گنہگاروں کو اللہ کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

﴿يَعَادِي اُذُنُ اسْرِفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْطُؤْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (زمرہ ۶)

اے میرے وہ بند و جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: النَّاسُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔" یہی سبب ہے کہ آنحضرت نے گنہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف رحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الہی کی بشارت سنائی، ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑ آئے تو صحابہؓ نے کہا اللہ اس کو رسوا کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے آنحضرت نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا "تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو پیا کرتا ہے۔" اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گنہگار پر بددعا نہ کی جائے، ماعز بن مالک ایک صاحب تھے جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے تاہم انہوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی آنحضرت نے کئی دفعہ ان کی درخواست رد کی لوگوں سے تحقیق کی یہ پاگل تو نہیں سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا وہ میدان میں کھڑے کئے گئے اور ان پر سنگ باری کی گئی اور اسی حال میں انہوں نے جان دی صحابہؓ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعز کو برا کہتے تھے آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا "ماعز کے

یہ اللہ سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ۱

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آ کر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا وہ اس کے بعد آئی فرمایا بچہ کی پرورش کر لو جب بچہ دودھ پھوڑ دے تب آنا وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساس گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی پھینکیں از سر حضرت خالد بن ولید کے منہ پر پڑیں انھوں نے عورت کو برا کہا۔ آنحضرت نے سنا تو فرمایا کہ ”خالد چپ رہو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ ہی ہے کہ اگر شاہی محصور لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔“ ۲

ترک ہوئی:

آنحضرت کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے یعنی یہ کہ اگر وہ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیے ہے تو وہ نیک نہیں اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں مھوئی ہے ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ہوی سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا ہی ہے جس کے لیے وہ کام کرتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دین حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر اغراض نفسانی اور خواہش و مھوئی کے بت چھپے ہیں قرآن نے فرقان اور جاہلہ و سورتوں میں متنبہ کیا۔

﴿اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ الْاِلٰهَ هَوٰهُ﴾ (جاہلیہ ۳)

اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا الہ بنا رکھا ہے۔

اسی لیے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لیے شریعت محمدی نے ترک ہوی کا طریقہ پیش کیا بودھ کی تعلیم کا اصل اصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے لیکن محمد رسول اللہ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے کیونکہ انسان اگر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا اسی لیے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں بلکہ ہر بری خواہش ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے وحی محمدی نے فرمایا۔

﴿وَمِنْ اَصْلٍ مَّمَّنْ اَتَّعَ هَوٰهُ بَغْیْرِ هٰذِیْ مِنْ اِلٰهٍ﴾ (نقص ۵)

۱ صحیح مسلم کتاب اللہ و۔

۲ صحیح مسلم کتاب اللہ و۔

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے اللہ کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔
پھر فرمایا

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (ص ۲)

اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔

عدل و راستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے وہ اسی حوی کے زہر قاتل سے مر جاتی ہے فرمایا۔

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا﴾ (نساء ۲۰)

عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

ہوئے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے

پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے فرمایا:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ هَٰذَا أُوْلَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (ت ۲)

اور ایسے جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے ڈرتے ہوئے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبت الہی:

دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے خاص کر وہ محبت اور پیار جو اللہ کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے عقائد کے باب میں محبت الہی کے زیر عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو راقۃ اور انجیل میں بھی ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے مختصر ایہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعی خیر کی پیروی محبت الہی کا ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا۔

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران ۳)

کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اس لیے آنحضرت کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قنوت نہیں کی ہے بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ اللہ کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو اللہ کی محبت کا ذریعہ ہیں حسن خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھین جاتی ہے بد اخلاقی اور بد کرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں۔

﴿وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران ۱۰)

اور اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (بقرہ ۲۳۷ و ما مدہ ۳)

اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ﴾ (بقرہ ۲۸)

اللہ توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (آل عمران ۱۷)

اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۱۰ و ۶۰ حجرات ۷)

اللہ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (توبہ ۱)

اللہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ (آل عمران ۱۵)

اور اللہ صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ﴾ (توبہ ۱۳)

اور اللہ پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ﴾ (صف ۱)

اللہ ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان آیات پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبت الہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں ایمان، احسان، توبہ، توکل،

انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبت الہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں۔

﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾ (آل عمران ۴)

تو اللہ کافروں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (بقرہ ۲۴)

اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾ (نساء ۶)

اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو اترانے والا ہو، شخی مارنے والا ہو۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا﴾ (نساء ۱۶)

اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار اور گنہگار ہو۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْهَائِئِينَ﴾ (نہ ۷)

اللہ خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ حَوَّالٍ كَفُورٍ﴾ (ج ۵)

اللہ کسی خیانت کارنا شکرے کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ (نقص ۸)

اللہ اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ﴾ (نقص ۸)

اللہ فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ (انعم ۱۷)

اللہ فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ﴾ (نحل ۳)

اللہ مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (شوری ۴)

اللہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (بقرہ ۲۸)

اللہ ناشکر گنہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔

کفر، بد گوئی، بد لہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جاتے 'فخر'، 'غرور'، 'شیخی'، 'خیانت'، 'نا شکری'، 'فساد'، 'اسراف'، 'ظلم'، 'گنہ' وہ

بد اخلاقیات ہیں جو انسان کو محبت الہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبت الہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔



تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عمداً بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر آراستہ و پیراستہ بنانا اسی ہے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (بقرہ ۱۲۹) وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک و صاف کر کے نکھارتا ہے۔

اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ

﴿وَأَنَا نَعِثُ مُعَلِّمًا﴾ (ابن ماجہ باب فضل العلماء)

اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فساد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چرہ کی پرورش ہو اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے اور نہ فساد گوشت پوست کی جلد تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا، مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے۔ قریش کی ایک بی بی چوری کے جرم میں پکڑی گئی، بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گنہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتی تھیں اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے حکام ہال جاتے تھے۔ ۱

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہؓ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا کہ تم سختی کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں یہ نجاست کے لیے موزوں نہیں یہ اللہ کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو۔ ۲

۱ صحیح بخاری باب قول النبی یسروا ولا تعسروا۔

۲ صحیح بخاری کتاب الجہود۔

۳ صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا کتاب الطہارۃ صحیح مسلم۔ وحسن عمل رسول۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہو گئی اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ کے پاس لے چلو انھوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا تو وہ اکیلا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا فرمایا ایک غلام آزاد کر دے عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں فرمایا دو مہینے لگا تا روزے رکھو عرض کی روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا فرمایا تو اچھا سا ٹھہ مسکینوں کو کھانا کھلا دے عرض کی ہم تو خود کنگال ہیں فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقے سے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تمہارے گھر والے حرم میں وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور نے کتنی نرمی کی۔ ا

یہ اور اسی قسم کے واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدود الہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل و رذائل کا موقع ہوتا تھا آپ ﷺ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے۔

ع قاهرى باوليرى پنجهبرى است

اخلاقی فضائل و رذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے، کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم الہی بتا کر کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمان الہی کی صورت اختیار کی اور کہا۔

﴿ثُمَّ أَمَرَ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَابْتِغَاءِ دِي الْقُرْبَىٰ وَبَهْزِ عَنِ الْمَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ
وَالنَّفْيِ يَعْظُمُ لِعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (نمل ١٣)

بیشک اللہ مدد اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور نا پسندیدہ بات اور سرشی سے منع کرتا ہے تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور ان سے بچو تمام انسانوں کا جو اس قادر مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری تعمیل کریں اس تعمیل میں بندوں کے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور ذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور ذائل سے روگرداں ہو جائے مثلاً اللہ کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ کھٹ (بقرہ ۳۶) یہ نیکی ایک دانہ ہے زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ اللہ کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے قرآن

منے اس کو یوں ادا کیا کَمَثَلِ صَفْوَانٍ (بقرہ ۳۶) ”اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہہ گئی اور چٹان دھل کر صاف ہو گئی اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا

بے ایمانی سے قیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ”جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔“ (نساء ۱) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی ”کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔“ (حجرات ۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے آنحضرت ﷺ نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے ”جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے۔“ اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بد اخلاقی کی ہو سکتی ہے۔ قبیحہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آ کر عدالت نبوی میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی حضور نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کئے جانے کا حکم دیا جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ ”اس کو دیکھو کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا“ لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا۔ حضور ﷺ یہ سن کر خاموش رہے تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی مٹی آپ ﷺ نے پکارا کہ فلاں فلاں صاحب کہاں ہیں انہوں نے کہا ہم یہ ہیں یا رسول اللہ! فرمایا اترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناؤنی بات ہے۔ ۱

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لیے اس سے زیادہ موثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجے کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا ”مسلمانو! شراب جو اور پانے کے تیرنا پاک ہیں شیطان کے کام شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔“ (مائدہ ۱۲) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پہنچتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً غفور و رگزر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا۔

﴿اِنْ تُبْذُواْ خَيْرًا اَوْ تُخْفُواْ اَوْ تُعْفُواْ عَنْ سُوءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا﴾ (نساء ۲۱)

اگر تم کوئی بھائی ظاہر کرو یا اس کو چھپا دیا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرتے والا قدرت والا۔
 قدرت کے باوجود غفور اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔
 حلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ یک صلی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس سے
 اپنے اچھے اور سیکھ کے ہوں اس کا جو تا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے فرمایا نہیں۔
 ﴿إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ وَيُحِبُّ الْحَمَالَ﴾ (صحیح مسلم و ترمذی)
 اللہ جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

اس لیے بندوں کو بھی چاہئے کہ اپنے طور و طریق و لباس میں سیکھ اور جہاں کالی ظاہر کھیں۔
 مسد نون میں عز و استقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا۔
 ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (احزاب ۳)
 تمہارے لیے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

حق کے مقابلہ میں ماں باپ رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ کے نمونہ سے دی گئی۔
 ﴿فَدَكَ سَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي سِرْهِمْ وَنَدْبِهِمْ﴾ (نمل ۱)
 تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔
 ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور ان
 کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا۔
 ﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ﴾ (بنی اسرائیل ۳)
 بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی
 جہاں مہربوں کے ذہن نشین کر دی جا بر بن سلیمہؓ ایک صلی دربار نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں
 نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجاتے ہیں میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے
 کہا یہ اللہ کے رسول ہیں یہ سن کر میں نے دوا فقہ کہا ہے اللہ کے رسول آپ پر سلام (علیک السلام) آپ چپ رہے پھر
 فرمایا عیک السلام نہ کہو یہ مردہ کا سلام ہے السلام علیک کہو میں نے کہا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ
 کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور اس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ مانگ
 دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لائق و وقاب نشان بنجر میں ہو تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے تم دعا کرتے ہو تو وہ اس و

تمہارے پاس ہوتا دیتا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کسی کو برائے نہ ہو جا برہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا۔ آپ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کیے جاؤ اور تم کو چاہئے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمہارا چہرہ کھلتا رہے یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدمی پنڈلی تک اپنی رکھو اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے کیونکہ تہبند بہت نیچے تک ایکانا غرور کی نشانی ہے ۱۔ اور اللہ غرور و پسند نہیں فرماتا اور اگر تمہیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے تم کو اس کی عار دلائے تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ لاؤ کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا۔ ۲۔

اس طریقہ تعلیم کی بدانت پر غور کیجئے کہ آپ ﷺ نے بدوی کو اللہ کے آگے جھکنے اور اس سے ڈر کر اکر مانتے کے وہی موقع یاد دلائے جو اس کی زندگی میں اللہ جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضور اقدس ﷺ سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرنے یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پاتا چلا جائے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر اس نے کئی دفعہ اپنا سواں دہرایا آپ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر ۳۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی اس لیے آپ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا جس کو وہ باہمی النظر میں معموں سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی لیکن آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے فرمایا اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے پنھنہ کر سکوں؟ فرمایا تو کسی نیکی کی مدد کرو یا کسی بد سلیقہ کا کام کر دو پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکتے فرمایا کہ شریعت لوگوں کو یہی بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو (ابو المفرد بخاری صفحہ ۴۳ مصر)

کبھی آپ ﷺ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے آپ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا ایک دفعہ صبح آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو منفس

۱۔ عرب ام المذخر غرور کے لیے ایسا کرتے تھے جسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر تھپت رچھن اور سی قوموں میں غرور کی نشانی تھی

۲۔ سنن ابی داؤد باب فی اسبال الازار۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب الحدیث من الغصب و التزندی باب ما جاء فی اثرات الغضب۔

کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو نہ سامان ہو فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گونماز روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا لیکن کسی نے اس کو گالی دی ہوگی اس پر تہمت لگائی ہوگی اس کا مال کھا گیا ہوگا اس کا خون بہایا ہوگا اس کو مارا ہوگا تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور اس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ۱

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو لوگوں نے کہا جس کو لوگ کشتی میں پھنسا نہ سکیں فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔ ۲

اس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں صبر کی تلقین کرنی تھی تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم کس کو کہتے ہو صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچے نہ ہو فرمایا وہ بے اولاد نہیں ہے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی۔ ۳ (احادیث میں ہے کہ جو بچے کسی میں مرجائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے) اس طریقہ ۱۱ نے کس خوبی سے یہ دل میں بیٹھا دیا کہ بے اولاد غم کی چیز نہیں بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگوں کے نام لیں گے) آپ ﷺ نے دوسری بار یہی سوال کیا پھر تیسری بار پوچھا ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ فرمائیے ارشاد ہوا تم میں سب سے اچھا وہ جس سے اچھائی کی امید کی جائے اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اور تم میں سب سے برا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو۔ ۴

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ ”مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں ابو ہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں گن ہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے اللہ نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسنا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے۔ ۵ (یعنی دل کی صلاحیت جاتی

۱۔ صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم۔

۲۔ ایضاً باب فضل من یسک نفعہ عن الغضب۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ترمذی شریف کتاب الفتن۔

۵۔ جامع ترمذی ابواب الزہد۔

رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا ”کون مجھ سے اپنے دو جیزوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔“ ۱۔ کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیے اٹھے ہوں گے ان دو فقروں کی بااعنت پر غور کرو دونوں جیزوں کے بیچ میں زبان ہے جو ہر قسم کی قوی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بد کاریوں کی جگہ ہیں ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے

ایک دفعہ فرمایا کہ کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں آپ ﷺ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا میں اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو چنانچہ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ ۲

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے جبہ الوداع میں آنحضرت منیٰ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا لوگو! آج کونسا دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں عرض کی اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں سب نے کہا جی ہاں پھر پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے پھر سب چپ رہے سمجھے کہ آپ اس کا نام پچھ اور بتائیں گے فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں سب نے کہا جی ہاں پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے پھر سب خاموش رہے کہ آپ کوئی اور نام بتائیں گے فرمایا کہ یہ بلد الحرام نہیں ہے سب نے کہا جی ہاں ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا مسلمانوں کا خون مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمھارے لیے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن اس مقام میں اور اس مہینہ میں۔ ۳

کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے حضرت ابوذر غفاری کو یا فطرۃ تارک دنیا تھے بڑے ہی زاہد و عابد تھے ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر ان سے فرمایا اے ابوذر! جہاں رہو اللہ سے ڈرتے رہو برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مناذا لو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ماکرو۔ ۴

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے آنحضرت ﷺ کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا ”تمھارا اپنے بھائی سے ملنے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے راستہ سے پتھر ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا

۱۔ صحیح بخاری باب حفظ اللسان۔

۲۔ مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۵۔

۳۔ صحیح بخاری الخطبہ فی لیام منیٰ۔

۴۔ ترمذی باب ما جاء فی معاشرۃ الناس۔

بھی صدقہ ہے۔^۱

صدقہ کی جواہریت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھادی۔

کبھی آپ ﷺ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی بدکاری نہ کریں گی اپنی اوراد کو نہ مار ڈالیں گی بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسوں کی نافرمانی نہ کریں گی (سورہ بقرہ: ۴)

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ”ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل و انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“^۲

یہی عبادہ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا آنحضرت ﷺ نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی ”ہم اللہ کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے نوٹ مار نہیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔“^۳ اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور ایک سوال کرتے تھے سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں خواہی جواب دے دیتے تھے دریافت فرمایا کہ افتراء کس کو کہتے ہیں پھر خود ہی فرمایا وہ ”چغلی ہے“ لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا“^۴ ایک بار ارشاد ہوا کہ ”تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں“ لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے فرمایا ”تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو“ کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو ہو غیبت ہے ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔^۵ ایک موقع پر ارشاد ہوا میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ فرمایا ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دے پھر فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج، شخی خور

۱۔ ترمذی فی منافع المعروف۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۱۸۔

۳۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۵ کتاب ادبیات۔

۴۔ صحیح مسلم باب تحریم التعمیمہ۔

۵۔ صحیح مسلم باب تحریم العیبہ۔

مغرور۔ ۱

کبھی آنحضرت ﷺ آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہاتے حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ایک دفعہ خود سے فرمایا ”اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا اللہ کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا“ صحابہؓ نے مشتقاً نہ پوچھا ”کون یا رسول اللہ! فرمایا جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا۔ ۱ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ”دینداری اخلاص کا نام ہے دینداری اخلاص کا نام ہے دینداری اخلاص کا نام ہے“ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کس کے ساتھ فرمایا ”اللہ کے ساتھ“ اس کے کتاب کی ساتھ اس کے رسول کے ساتھ مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ۔ ۲



۱ صحیح مسلم باب جہنم۔

۲ مشکوٰۃ باب الشفقة علی الخلق بحوالہ صحیحین۔

۳ مشکوٰۃ باب الشفقة علی الخلق بحوالہ صحیح مسلم و صحیح بخاری۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول اللہ کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے 'حقوق' فضائل و رذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھرا کر ادا کرنا ضروری ہے یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے مثلاً بیچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔ تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے اس کو آداب کہتے ہیں مثلاً اٹھنے، بیٹھنے اور کھانے، پینے کا طور و طریق۔ ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی:

حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ حَیْثُ﴾ (بقرہ ۳)

اللہ نے تمہارے (کام) کے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

اس لیے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے ایک گوند لگاؤ ہے اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں اللہ نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے اسی ذمہ داری کا نام حق ہے جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے ارشاد ہوا۔

﴿وَمِنْ اَمُوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (۱۱ بیت ۱)

اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

﴿وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمُوَالِهِمْ حَقٌّ مِّمَّا مَعْنُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (معارف ۱)

اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

﴿وَاِنَّ دَانَ الْقُرْآنِی حَقٌّ وَالْمَسْكِیْنِ وَالسَّیْلِ﴾ (نور ۱۳)

اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

﴿فَاتَّخَذَ اللَّهُ ذَاتُ الْقُرُونِ حَقَّهُ وَالْمُسْكِينُ وَابْنُ السَّبِيلِ﴾ (روم: ۴۰)
تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں پھر غریب، پھر مسافر ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے۔

﴿وَأَنْتُمْ حَقُّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا﴾ (انعام: ۱۴)
اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں سے ان کو بھی کچھ دے جن کو یہ نعمت نہیں ملی اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع محل کو نقصان پہنچاتا ہے۔
حدیث میں آتا ہے۔

﴿إِنْ لَزُو حَتَّ عَلَيْكَ حَقًّا وَلَزُورُكَ عَلَيْكَ حَقًّا﴾ (بخاری: صوم)
تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔
﴿وَلَا هَلَكَ عَلَيْكَ حَقًّا﴾ (بخاری: صوم)
تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے۔ (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿فَإِنْ لَفَسَكَ عَلَيْكَ حَقًّا﴾ (بخاری: صوم)
بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔

﴿فَإِنْ لَحَسَدَكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَلِعَيْنَيْكَ عَلَيْكَ حَقًّا﴾ (صحیح بخاری: کتاب صوم)
تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے

حقوق کی وسعت:

جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں

سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضہ محبت کو ایسا جلائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے۔ اس کا ہر عضو جس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسبت طور سے وہ کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں، لیکن انسان کے علاوہ اس کائنات ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیح مقصد کے لیے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے حقوق انسان پر ہیں، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشوونما پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرنے بلکہ اس کے مناسبت اسباب فراہم کرے اور اس کے مناسبت غذا سیرابی اور آرام کی فکر رکھے یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ:

﴿حَتَّىٰ كُنْتُمْ مِثْلَىٰ الدَّارِ حَتَّىٰ كُنْتُمْ مِثْلَىٰ الدَّارِ﴾ (۳۰)

زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیے پیدا کیا۔

کے صریح نتیجے ہیں کہ جب انسان کے لیے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کے لیے وہ بنائی گئیں اور اس لیے تاکہ وہ وقت مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں ان کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

”مختصر تفسیر“ نے ص ۳۰ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ ”ایک دفعہ ایک آدمی نیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعۃً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں“ لے میں تو کھیتی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔“ اور اسی لیے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا کہ ”جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے“ لے اسی سبب سے پھل دار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے۔ لے ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لیے بخش گیا کہ اس نے ایک پیاز سے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچی تھی، اور ایک اور شخص پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی، ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔ لے

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیے بھی بیان کئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ

۱۔ صحیح بخاری باب الحرث و المزارعة جلد اول صفحہ ۳۱۲۔

۲۔ صحیح بخاری مسلم باب مذکور۔

۳۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکورہ جلد خاص صفحہ ۷ مصر۔

۴۔ یہ دونوں واقعات صحیح بخاری میں ہیں۔

تناو سچ ہے وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلے ہوئے جن کی تفصیل پہلے آئی ہے۔ آئے گی۔

حقوق کی ترتیب:

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ و انجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف ”محبت کرنا“ کہہ دینا کافی نہیں بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہئے جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو“۔ ۱۔ اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال و ملکیت کے لیے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے چاہتا اور پسند کرتا تو توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے لیکن اسلام میں یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلیمات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری و نزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیرو بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔ ۲۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان و حیوان کے اور پھر انسانوں میں اہل ملک قوم قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پاسکتا ہے یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برترانہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری

۱۔ صحیحین کتاب الایمان۔

۲۔ سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصیت۔

ہو جاتی ہے مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے ایک غریب اور بیمار باپ ہے ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے پھر اسی حالت میں اس کا ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی مدد کرنی چاہئے یہی وہ موقع ہے جس میں مذہبی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں پھر باپ کے ہیں پھر بھائی کے ہیں پھر پڑوسی کے ہیں پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے، یہ ایسا نہیں بلکہ ظلم ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مزاحمت گوارہ کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہوا کر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا شریعت محمدی نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے۔

﴿وَسَالُوا الدِّينَ إِحْسَانًا وَبَدَىٰ أَقْرَبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْحَارِدَى الْقُرْنَىٰ وَالْحَارِ الْجُحْبُ وَالصَّاحِبِ بِالْجُحْبِ وَالْبِئْسَ السَّبِيلُ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (نور۔ ۶)

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ داروں پڑوسی کے ساتھ اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلْيُوَدِّعُوا الدِّينَ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَالْبِئْسَ السَّبِيلُ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ (بقرہ۔ ۲۶)

اے پیغمبران سے کہہ دو کہ تم جو خیر چاہو وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو اللہ اس سے آگاہ ہے۔

﴿وَإِذَا الدَّقُّرُ حَقَّ وَالْمَسْكِينُ وَالْبِئْسَ السَّبِيلُ وَلَا تَنْدَرُ تَنْدِيرًا﴾ (ی۔ ۳۰)

اور رشتہ دار کا حق ادا کرو اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کرو۔

عام طور سے اکثر مذہبیوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے۔ تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے۔

”تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو“ (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے۔

”تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے“ (احبار ۱۹-۳)

انتہایہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ:

”اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے“ (احبار ۲۰-۹)

”اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا“ (خروج ۲۱-۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعیم نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:-

”کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے، پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر ہو اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا“^۱

نبوت محمدی جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے اس نے تورات و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

۱۔ اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو بھٹی خوش برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اسکی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِضْلُهُ فِئَ عَامِينَ﴾ (عنان ۲)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی، اسکی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس تک دودھ پلایا۔

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ (احقاف ۲)

اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نکلی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اسکی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر در یافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے عرض کی، پھر کون، فرمایا تیری ماں، تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا، تیرا باپ۔^۲ ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور

۱۔ اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں تورات کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹-۱۹، مرقس ۷-۱۰، ۱۰-۱۹، لوقا

۱۸-۲۰۔

۲۔ صحیح بخاری ج ۲ کتاب الادب۔

فرمایا: تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔ لے ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! میں نے یہ بہت بڑا گنہہ کیا ہے، کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں۔ دریافت کیا حال ہے؟ اشارش کی، ہے فرمایا "تو اس پر نیسی کر"۔ یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ! میں نے جہاں میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا، فرمایا کہ تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔ ۱

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنس لطیف کی ہی ایک صنف تو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کامنوں ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں، وہ خالق اکبر کی علت فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں، لیکن باپ کی مادی طہیت چند محوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابل برداشت تکلیف کو لمبی خوشی برداشت کیا پھر اس نو پید امضغہ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور پر داشت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی ٹار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لیے شریعت محمدی نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اسکی سزاوار ہے۔

۲۔ ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و نگین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اسکی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتا ہے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی "عزت" کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت ان کی اطاعت ان کی امداد اور ان کی ولد ہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر افسانہ نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر تعلیم، توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی مدت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا۔

﴿وَإِذَا حُدَّ مِثَاقُ سِی اسْرَائِیلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ إِحْسَانًا﴾ (۱۔ ۲۔)

۱۔ صحیح بخاری ج ۲ کتاب الادب۔

۲۔ جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

۳۔ ترمذی و ترمذی مندرجہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ بحوالہ ابن ماجہ، نسائی، حاکم۔

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ”نیکی کرنے“ کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے اور ہر قسم کی خدمت اطاعت اور عزم کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔ اسی سورت میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے۔

﴿قُلْ مَا أَمَرْتُمْ مَنْ حَبِرَ مِنْهُنَّ الدِّينَ وَلَا قُرْبَىٰ﴾ (۲۶، ۲۷)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کیلئے

سورہ نہ میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے۔

﴿وَاَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (۱۰، ۱۱)

اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم و خیال اور رسم و رواج سے حلالی و حرام کی ہزاروں رسمیں و خیالی باتیں پیدا کر لی تھیں اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آنا۔

﴿قُلْ نَعْبُدُ اللَّهَ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ إِلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (۱۹، ۲۰)

کہہ (اے پیغمبر!) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سنوں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

معراج کے احکام و اذکار وہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کیساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا۔

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ مَا يُلْفِظُ عِنْدَكَ الْكُفْرَ أَحَدُهُمَا

أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَوْفٍ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۖ وَاحْفَظْ لَهُمَا حَاجَ

الذَّل مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي ضَعِيرًا﴾ (بیۃ ایل-۳)

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو، اور نہ ان پر غصا ہو، اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ، اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں۔ بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو

ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے، ارشاد ہوا۔

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (عنکبوت ۱)
اور ہم نے انسان کو بتا دیا کہ ماں باپ کیساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف انکی دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے، فرمایا

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمْدَهُ أَثَمًا ۚ وَهَمًّا عَلٰی وَهَبٍ وَفَضْلُهُ فِیْ غَآمِیْنِ ۚ اِنْ اَشْكُرْ لِّیْ وَنُوْدِیْثِ الْیَمِّ الْمَصِیْرُ ۚ ۝۱۱ ۚ وَاِنْ جَاهَدَكَ عَلٰی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبِهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوفًا﴾ (لقمان ۲)

اور ہم نے انسان کو بتا دیا کہ اپنے ماں باپ کیساتھ نیکی کرو۔ اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا، کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آتا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو انکا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کیساتھ بھلائی سے گزران کر۔

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے، مگر دوسری باتوں میں انکا ادب انکی اطاعت اور انکی خدمت کا وہی عالم رہے۔
حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً انکی دعا سے مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسن خاتمہ پر مرے۔

﴿رَبِّ اَعْفِرْ لِّیْ وَلِیِّ الذِّیْ﴾ (براہیم ۶)

اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی۔

﴿رَبِّ اَعْفِرْ لِّیْ وَلِیِّ الذِّیْ﴾ (نوح ۲)

میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

اس لیے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے، آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجالاتے ہیں اور ان کے لئے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو

عطا فرماتا ہے۔

﴿وَوَضَّيْنَا لِلْإِنْسَانِ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا خَمَلْتَهُ أُمَّهُ كُرَّهَا وَوَضَعْتَهُ كُرَّهَا وَحَمَلَتْهُ وَفَضَّلَتْهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَتِ أَوْزَعِي أَلْ أَشْكُرُ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلَحَ لِي فِي دُرِّيَّتِي ۖ إِنَّنِي كُبْتُ الْبَيْتَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۖ أُولَئِكَ الَّذِينَ تَقْبَلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَحَاوِرُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْحَنَّةِ وَعَدَ الصَّدُوقُ الْبَدِيُّ كَانُوا يُؤْغِذُونَ ﴿٢﴾﴾ (تحف ۲)

اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اسکی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور میں مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ پھڑانا، یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا، اس نے کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ کام کروں جس کو تو پسند کرے اور میری اول و نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں، یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول، اور ان کے برے کاموں سے درگزر کرتے ہیں یہ جنت والوں میں ہونگے یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت و اطاعت و رضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد و مل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی منشاء الہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کہیں فرمایا ہے کہ ”ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے“۔ کبھی ارشاد ہوا ”رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے“۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، گزارش کی پھر کون؟ چوتھی بار فرمایا، تیرا باپ اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے۔ ایک دفعہ حضور انور ﷺ مجلس قدس میں تشریف فرما تھے، جان نثار حاضر تھے فرمایا وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، صحابہ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا، وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔ ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا (جہاد)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت موثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضا را ایک چٹان اوپر سے اسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بیچارگی اور اضطراب و بیقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربار الہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک

نے بہار جی تو جانتا ہے کہ میرے والدین روزھے تھے اور میرے چھوٹے چچہ نے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دھو کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں داتا تھا جب وہ پی چکے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا، لونا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں ضل آجاتا اور نہ ہٹاتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لیے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوند! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس چنان کو اس غار کے منہ سے ہٹا دے، یہ ہٹا تھا کہ چنان کو خود بخود جنبش اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی اس کے بعد باقی مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو پتہ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت نزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر بھٹیلی پر رہ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو اس کی خدمت نزاری کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا۔ اسی لیے ابھی اوپر زور چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت نزاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر خدمت اقدس میں شرکت جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں، عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضہ جہاد ادا کرو۔

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے احادیث میں بھی وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ ”تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے“۔ ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کی، ضرور یا رسول اللہ! فرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے ”اور جھوٹی گواہی“۔ ۱

توراة میں حقوق والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے۔ وحی محمدی نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراة کا یہ حکم تھا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تاہم مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ

۱۔ یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکور ہیں خصوصیت کے ساتھ دیکھو بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلة، جامع ترمذی کتاب البر والصلة مشکوٰۃ باب مذکور۔

ہوگا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے قتل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے تا آنکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔^۱

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، تو رات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل بے قدر کر دیا ہے، لکھا ہے:

اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے طار ہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے (پیدائش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو کو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی، اور اسی لیے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰-۷-۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابل حل اختلاف ہو، اور اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے، اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے، مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت ﷺ نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں۔



۱۔ فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے بچہ زکروذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہر یہ کہ اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا غشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر فقہاء نے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الا یہ کہ دلائل وقرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

اولاد کا حق

اصول تعلیم:

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیار حاصل تھے مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے یہ متن ان سب پر محیط ہے فرمایا۔

﴿نِیسَ مِمَّا مَلَإَتْ أَرْحَامُ صَغِيرٌ مَّا وَلِمَ یُوقِرُ کَبِیرًا﴾ (ترمذی)

جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں بڑوں افسروں ماتحتوں آقاؤں نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناواری اور آزر دگی پیدا نہ ہونے پائے جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔ حکموں اور مقصودوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے شرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانون کا بارگراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشوونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو بڑے بڑے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد:

عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا، اور لڑکیوں کو زندہ گاز دینا تھا یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب

تھے ایک تو مذہبی تھا یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے۔
 منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ ۱۔ کی قربانی کریں گے یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی
 بت پرست قوموں میں جاری تھی رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا
 اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا۔ ۲۔ اور سب سے زیادہ ہندوستان کے راجپوتوں
 میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی سستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی
 صورت میں رائج تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لیے ان معصوموں کی جانیں بہت
 آسانی سے لی جاتی تھیں قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا
 ہے۔ ۳۔

﴿وَكَذَلِكَ زَيْنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادَهُمْ شُرَكَاءُهُمْ لِيُرْذَوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ
 دِينَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾ (انعام ۱۶)

جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں اللہ برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ نکالیا ہے اسی طرح بہت سے
 مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوبصورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں تاکہ یہ دیوتا ان کو
 (میشہ کے لیے) ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان مشرکوں کو
 اور جو کچھ وہ اللہ پر افتر کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ایسا حکم دیا ہے اس کو چھوڑ دے۔
 اسی سلسلہ میں آگے چل کر اللہ فرماتا ہے۔

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام ۱۶)
 کھانے میں ہیں وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جا قتل کیا۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے
 کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے نبوت محمدی
 نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ اللہ ہی
 ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے۔

﴿وَمَا مِنْ ذَاتِ نَفْسٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ (حود ۱۱)
 اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض اللہ ہی پر ہے۔
 اس لیے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی۔

- ۱۔ سیرۃ ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک
 باب مالا يجوز من النذور فی معصية الله۔
- ۲۔ لکھی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۲۳۰۔
- ۳۔ کشاف زحشری تفصیل آیت ذیل۔

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ حَشِيَّةً بِمُلَاقٍ ۖ سَخِرَ نَزْرُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنْ قَتَلْتُمْ كَانَ حَطًّا كَبِيرًا﴾
(۱۰۰-۱۰۱)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالنا کروہم ہی میں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو پہ پہلو جگہ دی گئی۔
- مختصر یہ کہ حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں بتا دو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

﴿فَلْيَسْأَلُوا أَهْلَ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَا تُنْشِرُ كُؤَامَهُ شَيْفًا وَمَالُوا الدِّينَ احْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا
أَوْلَادَكُمْ مِمَّا حَرَّمَ مَلَأَ ۖ سَخِرَ نَزْرُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ﴾ (نہا-۱۹)

لہذا اسے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے؟ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالوہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک پوچھا اس کے بعد فرمایا والدین کی نافرمانی پھر عرض کی اس کے بعد فرمایا یہ کہ "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی"۔ یہ جواب حقیقت میں آیت ہمارا کی تفسیر ہے انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پر توفیق نے دلوں میں یہ یقین پیدا کیا کہ رازق اللہ ہے اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو گئی۔

اولاد کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابل افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی لڑکیاں ہیں قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور اللہ کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے۔

﴿وَأَنْتُمْ أَحْذَرُكُمْ بِمَا صَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ضَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ (زفر-۲)

اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوشخبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے اللہ پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردہ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکر کرتے قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

﴿وَأَنْتُمْ أَحْذَرُكُمْ بِالْأَنْفَى ضَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۖ يَتَوَارَى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ

صحیح بخاری کتاب التوہید و تفسیر سورہ بقرہ و سورہ فرقان کتاب الادب و کتاب الحیٰ بن و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

مَا تُشْرِبُهُ أَيْمِسْكُهُ عَلَى هَوٍّ أَمْ يَدْمُمُهُ فِي الثَّرَابِ ﴿٢٠﴾ (ن-س)

اور جب ان میں سے کسی کوڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا ہے کہ آیا ذلت اٹھ کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے (یعنی زندہ دفن کر دے)

یوں تو اس رسم بدکار و اراج تمام عرب میں تھا، مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کار و اراج سب سے زیادہ تھا، بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت ﷺ سے اقرار کیا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے، یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرتاً ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کے سامنے خود اپنی بچی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم ﷺ بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر خدمت اقدس میں عرض کی کہ ”یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے اور اوماد کو مار ڈالتے تھے میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا وہ اباباہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی، رحمت کو نہیں دیکھا اس پر درد افسانہ کو سن کر آنسو ضبط نہ کر سکے ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو غمگین کر دیا“ فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے پھر ان صاحب سے فرمایا ”ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ“ انھوں نے دوبارہ پھر بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہو گئی پھر فرمایا ”جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔“

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں۔ فرمایا اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو۔ عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس اونٹ ہیں، فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو"۔ ۴۷

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں، مائیں خود اپنی

۱۔ مجمع الـمـثـال کرمـانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۴۸ وکتب مجمع الامثال میدانی جداول صفحہ ۲۸۷ مطبوعہ خیر یہ معزز بر مثل فضل من مؤلف۔

۲ ابن جریر ابن کثیر و در منشور سیوطی بحوالہ سخن بہی و سند بزار، مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورہ تکوید۔

۳۔ سنن داری صفحہ اول 'یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں' لیکن اس لیے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے۔

تفسیر ابن جریر در حدیث بروایت قزوینی و تاجی تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبد رزاق و ابن ماجہ و مشکوٰۃ و سیوطی و عوالم مسند و روضہ و ابن کثیر فی

الشفن زیر سورۃ الشمس کورت۔

لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھیں، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے۔

مالقی الموؤد من ظلم أمیه
کمالقیت ذهل جمعاً و عامر

زندہ دفن ہونے والے بچے نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل نے اور عامر نے اٹھائی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں ایک عورت نے آ کر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی، فرمایا: ”ایسا نہ کرو بلکہ کفارہ دے دو“

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا اصعبہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تو عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا؟ فرمایا: ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا، کہ اللہ نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔ اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثت نبوی سے پہلے دین ابراہیمی کے پیرو تھے وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوش شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں، چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو، یہ شخص کو ششیں تھیں جو ملک میں بار آور نہ ہوئیں، لیکن بعثت محمدی کی رحمت عام کی جب بہار آئی، تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لیے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوت محمدی نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجات اخروی کا ذریعہ بن گئیں، فرمایا: ”جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی“، نیز فرمایا: ”جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں، تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا“، غور کیجئے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہد محمدی میں آ کر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لیے آپ ﷺ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی، صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (ممتحنہ) کہ ”وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی“۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت نے عورتوں سے خصوصیت کے

۱۔ موطا امام مالک باب النبی عن اللہ ورفی مصیۃ اللہ

۲۔ تفسیر درمنثور بحوالہ طبرانی۔ تفسیر اذالغفس کورت

۳۔ صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اول صفحہ ۵۴۰

۴۔ صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح مسلم کتاب البر

۵۔ مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی صفحہ علی الخلق۔

ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورت مرد جو ق در جوق اسلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے تو آپ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا اور انھوں نے اقرار کیا^۱۔ عید کے اجتماع عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ تشریف لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد لے لیا کہ وہ قتل اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتون دربار رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لے لیا جاتا تھا بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں ان میں ایک چیز یہ بھی تھی چنانچہ بیعت عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ”وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔“^۲

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ گے چوری نہ کرو گے بدکاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ اللہ پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو اللہ کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے۔“^۳ صحابہ سے فرمایا کہ ”اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے۔“^۴

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصری آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں ان تمام سنگدلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں۔ قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں غضب الہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں۔

﴿وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۖ بِأَنَّى ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ (تکویر)

یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔

کس درجہ بلیغ اور موثر طرز ادا ہے اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں سید الشہداء، حمزہ کی یتیم بچی امہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے حضرت علیؑ ہاتھوں میں اٹھالیتے اور حضرت فاطمہؑ ہر اکے حوالہ کرتے ہیں

۱۔ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۲۶ تفسیر سورہ ممتحنہ صحیح مسلم باب بیعة النساء

۲۔ صحیح بخاری جلد اول ص ۱۳۳ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید

۳۔ ترمذی و نسائی وابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیرہ بنت رقیقہ و سلمی بنت قیس

۴۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۴۴۳ بر حاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۶۲۴ علی شرط مسم

۵۔ صحیح بخاری کتاب الایمان و باب وفود الانصار و مسلم کتاب احمد و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۱۸

۶۔ صحیح بخاری کتاب الادب و کتاب فی الاستقراض و صحیح مسلم باب النبی عن کثرة مسائل۔

کہ یہ دہمبارے چچا کہ بیٹی ہے حضرت علیؑ کے بھائی حضرت جعفر طیارؑ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے۔ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے حضرت زیدؑ آئے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہئے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے حضرت علیؑ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے آنحضرت ﷺ اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ بہہ کر اس کی خالہ کے گود میں دے دیتے ہیں کہ ”خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔“

کیا یہ وہی جنس نہ تھی کہ جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا اب یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لیے دفعہ چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَرْوَاحِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ﴾ (لقان-۶)

(جنت ان کو بھی ملے گی جو) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا۔

﴿غدا الناس مذقّام النبی الحواریا﴾

غیر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔

رضاعت و حضانت:

اولاد کے جینے کا حق تسیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ وائدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار پایا اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے۔

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَنْ الْمَوْلُودِ

لَهُ رِقْنُهُنَّ وَكَسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (بقہ-۳۰)

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں یہ مدت اس کے لیے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری رہے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے فرمایا

﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّائِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ (نہ ۴)

اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور پکڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے پکڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے اور باپ نہ ہو تو دادا پر اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے۔

تعلیم و تربیت:

ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (تہ ۱)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچنا بزرگ خاندان کا فرض ہے یہ آگ جہنم کی آگ ہے مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”بار الہی! تو ان کو ظاہر و باطن کا حسن صورت و سیرت کی خوبی اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا“ فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَرْوَاحِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ﴾ (فقا ۶)

اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرمایا۔

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی و سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہئے ایک سورہ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا

کرتے ہیں۔

﴿وَأَصْحٰبُ لٰی فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِیُّیْ تُبٰثُ الْبَیْثُ وَاِیُّیْیِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ (انفال ۲)

اور (اے اللہ!) میرے لیے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنائے اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس باب میں وحی الہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پاکر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا:

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی میں آیا حضور ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے اس کو یہ

بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی اس نے کہا کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں میرے دس بچے ہیں، میں نے ان

میں سے کسی کو پیار نہیں کیا حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی پھر فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا اے دوسری

روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ”اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

۲۔ ان دونوں کا مشاہدہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہئے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم

نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی اس کے ساتھ اس کی

دو لکسن بچیاں بھی تھیں اس وقت کا شانہ نبوی میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا ام المؤمنینؓ نے وہی ایک کھجور اس

کے نذر کر دی۔ ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھا لے اور ان ننھی جانوں کو اس سدر متق سے محروم رکھے اس نے

اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس

منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا حضور نے سن کر فرمایا ”جب کسی کو لڑکیوں کی

کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بن جائیں گی۔“ نیز یہ

بھی ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص دوا لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہو

گا کہ وہ اور میں (دوا لڑکیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔“ ۳۔ اس رتبہ کی بندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا

ہے؟ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے ایک دفعہ یہ فرمایا

کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔ ۴

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے ارشاد ہوا

کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ

۱۔ یہ روایت صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الوالدین میں نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولده۔

۲۔ یہ روایت صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الوالدین میں نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولده۔

۳۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الاحسان الی البنات۔

۴۔ ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفعل بعض ولده فی التحل۔

اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ ۱۔ باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی میں قائم نہیں؛ اسی لیے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں؛ کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے؛ یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا؛ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا؛ اور چاہا کہ اس پر آنحضرت کی شہادت ہو؛ انہوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی؛ دریافت کیا کہ تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؛ عرض کی نہیں؛ فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ ہوں گا۔ ۲۔

اس سے اس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائیداد کا مالک بنے؛ یا اس کا کوئی ترجیحی حق ہو؛ اصلاح کر دی گئی؛ اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا؛ اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔



۱۔ ترمذی کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی ادب الولد۔

۲۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال عیالہ۔

حقوق زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن و شوکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوزھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا اسی طرح حقوق زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کے لیے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا ہندوستان میں بودھ جین ویدانت جوگ اور سادھوپن کے تمام پیروا ہی نظریہ کے پابند تھے عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا اسلام نے آ کر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس تجرد میں ہو سکتی ہے اس سے بدرجہا تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے جو کسی کا شوہر نہ ہو جو کسی کی بیوی نہ ہو جو کسی کا باپ نہ ہو جو کسی کی ماں نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو نہ کسی سے رشتہ ناظر رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری مواقع مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے نہ ہی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا

حکم ہوا۔

﴿وَأَسْكُنُوا الْآيَامِي مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ الْفُقَرَاءَ يُعْطِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ غَنِيمٌ﴾ (نور)

اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا رائد) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحین کا نکاح کر دیا کرو اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ ”اگر وہ غریب و تنگ دست ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا“ یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے نہ ہی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا اور دنیاوی لحاظ سے دوسبوں نے ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے اس فلسفہ کار ازاہل دولت نہیں غریب ہی سمجھ سکتے ہیں خصوصاً مزدور اور کاشتکار دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکلے سے نکلے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے اس لیے جو بے کاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے خصوصاً اس لیے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کر دے گی جس کے لیے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہو سکتا آخر میں فرمایا کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے اس کی

منجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے غیب کا علم اسی کو ہے اس لیے اس کا یہ حکمت سے خالی نہیں۔
پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو
تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کر لے فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكَحِ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمَنْ مِمَّا مَنَكْتُ إِيْمَانُكُمْ
مَنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِكُمْ بِنَفْسِكُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾ (نہ ۲۰)

اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں
سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہو اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔
آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو
کسی با ایمان باندی ہی سے نکاح کر لو اب یہاں سے دو شبے پیش آتے ہیں ایک یہ کہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں
کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ
اچھا اور اللہ کے نزدیک قبول ہے دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نو مسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم مرتبہ کیسے ہوں گی تو فرمایا یہ
تفریق بھی غلط ہے ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمام بیان اس لیے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان دوسووں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہو
گا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقہ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا
﴿اتزوج النساء فمن رغب عن سنتي فليس مني﴾ ۱۔

میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے
اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے چنانچہ زن و شو کے باہمی اخلاص و محبت کو اللہ نے
اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے فرمایا:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْتَكِرُونَ﴾ (روم ۳)

اور اس (اللہ کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے
پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیارا اور مہر پیدا کر دیا بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں۔

قرآن پاک نے ایک لفظ ”سکون“ سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے
فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں
امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے اس لیے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواہی ہونی چاہئے کہ اس سے اس
تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے اللہ نے اس زن شوہر کے تعلق کو اپنے عجیب و غریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے

پورے ہوں یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر و محبت اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے جو زن و شو کے باہمی میل جول اور مہر و محبت میں فرق ڈالیں فرمایا۔

﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَرَوْحِهِ - - مَالَهُ هِيَ الْأَحْرَةُ مِنْ خَلْقٍ﴾ (بقہ ۱۲)
تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرق ڈالتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے زن و شو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گویا برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں فرمایا۔

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَإِذَا ضَلَّتْ فَنُتِ تَحْفَظُتْ لِلْعَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ﴾ (نساء ۶)

مرد عورتوں کے سردھرے ہیں اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تو نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے۔

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلاف فطرت ہے۔

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ایک دوسرے کی پردہ پوش ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (بقہ ۱۲)

عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں تم ان کے ستر پوش ہوؤ تمہارے لیے تم ان کی زینت ہوؤ تمہاری تم ان کی خوبصورتی ہوؤ تمہاری تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہوؤ تمہاری، یہی نکاح کے اغراض ہیں

اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق زوجین کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے فرمایا ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (نساء ۱) اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا اس اللہ کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطہ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے مُحْصِينَ غَيْرِ مُسَافِحِينَ (مائدہ ۱) ”پاکدامنی کے لیے نہ شہوت رانی کے لیے“ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا ”اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو وہ نکاح کر لے کہ اس سے نکاحیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے (ابن ماجہ نکاح)

نکاح کے ان اغراض کو پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یکجہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو نہیں لگنے کا ڈر ہو باہم صلح کے لیے آمادہ رہنا چاہئے اور اصلاح حال کے لیے دونوں کو برابر کوشش کرنی چاہئے اسی لیے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے فرمایا اِنْ ارَادُوا إِصْلَاحًا (بقرہ ۲۲۸) اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں اِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا (نساء ۱۲۹) اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو۔ کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے۔

﴿إِنْ يُقِیمَا حُدُودَ اللَّهِ﴾ (بقرہ ۲۹)

یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں مجبور ہیں محمد رسول اللہ نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو

فرمایا:

﴿وَلَا تَجْعَلُوا الَّتِي عَرَضَتْ لَأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَسْرُوا وَتَنْفُوا وَتُضْلِحُوا نِسَ الْنَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (بقرہ ۲۸)

اور اللہ کو اپنی قسموں کا جھگڑا نہ بناؤ کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن و شو کے معاملہ سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بر) پر ہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں۔

﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ﴾ (نساء-۶)

تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر (کے مال و دولت اور عزت و آبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار ہیں ان کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت ان کے سپرد ہے پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت و آبرو کی جو خود ان کی اپنی عزت و آبرو ہے شوہر کی غیر ضروری میں بھی حفاظت کریں مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض اطاعت، سیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں" کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔" (ابن ماجہ، نکاح)

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی "لو کوا عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں اگر ایسا کریں تو ان کو خواہ گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو تو اگر تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو بیشک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں جن کا آنا تم کو پسند نہیں اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔" (ابن ماجہ، کتاب النکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آ کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے فرمایا! جب خود کھائے تو اس کو کھلائے جب خود پہنے تو اس کو پہنائے نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے (ابن ماجہ ایضاً) دوسری طرف آپ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں یہاں تک فرمایا کہ "اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے

شوہر کو سجدہ کرے۔“ آپ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لیے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپ نے فرمایا۔

﴿خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لَا هَلْه﴾ (ترمذی و دارمی و ابن ماجہ)

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔

﴿خَبِيرُكُمْ خَبِيرُكُمْ لِنِسَاءِهِمْ﴾ (ترمذی)

تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہیں۔

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، آنحضرت نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا۔

﴿وَلَزَوْحَكَ عَلَيْكَ حَقًّا﴾ (بخاری، کتاب النکاح)

وہ تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی قصوروں پر ماری پٹنی جاسکتی تھیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار قطار میں نہیں سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارنے اور ان کے حق مقرر کئے۔“

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا، اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی، ارشاد ہوا۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (آۃ ۵-۲۸)

اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر وہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر، اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل

ہے۔

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، یہ اس لیے ہے تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گویا اپنی گھر کی عداالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور کرنے کے سلسلہ میں ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو

اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزاز کی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں، قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتادی ہیں

فرمایا۔

﴿الرِّحَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ نِعْمَتَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾

(نساء - ۶)

مرد عورتوں کے نگران ہیں اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنا مال خرچ کیا۔

یعنی مردوں کی اس اعزاز کی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے ہم بدم اس کی تائید میں ہیں اس لیے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃ مناجا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہربان و نفقہ اور پرورش و مادہ وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ و اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے تاکہ گھر کا نظم درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواہی قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ نیڑھ نکال دیں، آپ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ ”عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پہلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی نیڑھاپن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے“۔ آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع و راضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا فرمایا ”اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی“۔ یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے۔

﴿وَعَاشِرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ تَكَرَّهُوا شَيْنًا وَيُحِبِّلِ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا

كثِيرًا﴾ (نساء - ۳)

۱۰ بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گزراں کرو اگر تم کو وہ نہ بھائے تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور اللہ نے اس میں بہت خوبی رکھی ہے۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیوں کو، حصوں میں بانٹ دیا ہے خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیوں کا بار گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور

صحیح بخاری، مسلم، نکاح۔

صحیح بخاری، مسلم، کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء۔

بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، مواصلات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے۔ اور اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں آ کر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں فرمایا ”تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو“۔^۱

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے جن کی تفصیل ایک دفتر میں ساکتی ہے فرمایا ”تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا تمہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی۔ مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی“ (بخاری اول ۷۷۹ باب قُواْ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِبْكُمْ) نبوت کے ان دو معجزانہ فقرہوں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے؟

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے وہ آیت یہ ہے۔

﴿وَالَّذِي تَحَاوُونَ يُشْوِرُهُمْ فِعْظُوهُمْ وَافْضِرُوهُمْ فِي الْمَصَاجِعِ وَاصِرُوا لَهُمْ فَإِنْ أَطَعَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِمْ سَبِيلًا﴾ (نساء۔ ۱)

اور جن بیویوں کے ”نشوز“ کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور خوابکا ہوں میں ان سے علیحدگی برتو اور ان کو مار دو تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔

لغت میں ”نشوز“ کے معنی ”اٹھ جانے“ کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

﴿وَمَعْنَى دَالَتْ اِدَارَ اَيْتَمَ مَعْنَى مَا تَحَاوُونَ اَنْ يَشْرُونَ عَنْكُمْ مِنْ نَظَرِ اَيْ مَا لَا يَسْعَى لَهُمْ

۱۔ اس اختیار کی تشریح میں فقہاء مختلف ہیں تفصیلات کے لیے فقہی کتابوں میں کتاب النفقہ، کچھ چاہئے نیز دیکھو نیل لاوی، شوکانی جلد ۶ ص ۲۶۳ مصر۔

۲۔ صحیح بخاری باب اذا الم ينفق الرجل صفحہ ۸۰۸۔

ل یطرون ابیہ و بدحس و یحرجن و استرتم^۱ نامرہن ﴿۳۸﴾ (تفسیر طبری ۵- مصر ۳۸)
اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے "نشوز" کا ڈر ہو یعنی ادھر دیکھنا
جدھر ان کو دیکھنا نہیں چاہئے اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔

﴿عس محمد بن کعب القرطبی ادارای الرجل تقصیرہامی حقہ فی مدحلہا و محرجہا
قال یقول لہا بلسانہ قد رایتک منک کذا و کذا فانتهی﴾ (ایضاً)

محمد بن کعب قرطبی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی
ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی یہ دیکھی تو اب باز آ جا۔

فقہ کی کتابوں میں ہے۔

﴿الاشزہ ہی الحارجۃ عن مرن روحہا اماعۃ نفسہا مہ﴾ (عالمگیری تفہات)

نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔

کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے اس

کا ضم نہ مانے اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغض رکھے (تفسیر ابن شہ)۔

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل

جاتے ہیں آیت مذکور پوری یہ ہے۔

﴿یَٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَنِ نِّسَاءٍ مَّا فُصِّلَ لَکُمْ عَنْہُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِکُمْ

وَلَا تَصِحُّ فِیْہِ اَنْتُمْ حِفْظٌ تَعِیْبٌ مَّا حَفِظَ اللّٰہُ وَاَنْتُمْ تَحَافُوْنَ نَشُوْرَہُمْ فَعَصُوْہُمْ

وَاٰخِرُوْہُمْ فِی الْمَصَاحِیْ وَاضْرُوْہُمْ فَاِنْ اَضَعْتُمْ فَلَا تُنْعَوْا عَلَیْہُمْ سَبِیْلًا﴾ (نساء ۶)

مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور (دوسرے) اس لیے کہ مرد اپنا

مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور

عزت و آبرو کی) حفاظت کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوز کا تم کو

ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو خوابگا ہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو مار دو تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش

نہ کرو۔

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو

اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں اس کے بعد ہے کہ

اصل متن تفسیر میں و مستتر تم غلط چھپا ہے

اس آیت کی تفسیر قرآن پاک کے رسالت اور حدیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ پیش نظر رہے کہ یہ خاگی را

مرد مشتبہ حالات میں عورت کی اصداح سے لیے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگ ساری یا تازیانہ ہے جس کا اجرا

قاضی کا فرض ہے۔

اب جس عورت سے تمہیں ”نشوز“ کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کر دیا اس سے بات کرنا چھوڑ دو اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر یہ بتایا جا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے پھر یہ بھی کہا جا سکتا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبرداری ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھریا زماں و دولت اور عزت و آبروی کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ کر دو اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھریا زماں و عزت و آبروی کی حفاظت جو عورت ان دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کو تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

”شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت“ کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے آپؐ نے فرمایا سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

جذہ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت ﷺ کے جوفقرے ہیں ان میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے صحیح مسلم میں ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ فِي السَّاءِ فَإِنَّهُ عَدَّكُمْ عَوَانٍ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُوَصِّيهِنَّ فَرَشَكُمْ أَحَدًا تَكَرُّهُنَّ فَإِنْ فَعَلْنَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبْرَحٍ﴾ (مسلم)

عورتوں کے بارہ میں اللہ سے ڈرو کہ وہ تمہارے بس میں ہیں تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ روندوائیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو اگر وہ ایسا کریں تو ان کو تھارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں۔

﴿اسْتَوْصُوا النِّسَاءَ حَبِيراً فَإِنَّهُ عَدَّكُمْ عَوَانٍ بَیْسَ تَمْسُكُولٍ مَعَهُنَّ شَبَاباً غَیْرَ دَلِثٍ لَا أَسَانِیْسَ بِمَاحِشَةٍ مَّیْبَةِ فَإِنْ فَعَلْنَ فَاضْرِبُوهُنَّ وَ هُنَّ فِی الْحَصَاحِیْ وَ حَرَامٌ عَلَیْكُمْ مَرْحَاجٌ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَیْهِنَّ مَبِیلاً﴾ (کتاب النکاح)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں تو اگر ایسا کریں تو ان کو خوابگا ہوں میں عیحدہ کر دو اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنہ یہ اس طرف ہے کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور ”کھلی بے حیائی“ سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپ نہیں لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع

کی ہے یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشہ مبہ کی تغیر میں داخل کیا ہے (تفسیر سورہ نساء رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرح کی تصریح ہے کہ یہ ”ضرب عیسر مخرج“ یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے (تفسیر طبری جلد ۵ صفحہ ۴۱ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آ سکتی ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے ایسا بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حکم دیا کہ ”اللہ کی بند یوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو“ تو حضرت عمرؓ نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہو گئیں تو آپ نے مارنے کی رخصت عطا کی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبوی کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا ”آل محمد کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹی رہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں“ (ابوداؤد وابن ماجہ و دارمی)

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا آپ نے فرمایا ”وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا“۔ لے یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابی نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ میری بیوی بد زبان ہے فرمایا طلاق دیدو عرض کی اس سے میری واد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے فرمایا ”تو اس کو سمجھایا کرو اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی“ لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو“۔ ۱۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا ”کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو“۔ ۲۔



- ۱۔ صحیح مسلم المصنفہ مثلاً۔
- ۲۔ مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرة النساء بحوالہ ابوداؤد۔
- ۳۔ مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرة النساء بحوالہ صحیح بخاری و مسلم۔

اہل قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شو کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام ”صلہ رحم“ ہے، محمد رسول اللہ کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحی محمدی میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا۔

﴿فَاتِّبِ دَالِقُرْبٰنِیْ حَقَّہٗ﴾ (روم-۳)

تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبٰنِیْ حَقَّہٗ﴾ (س-۳)

اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کرو۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اللہ کی مرضی کے لیے تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

﴿وَآتِی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰنِیْ﴾ (بقرہ-۲۲)

(اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے) اور مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔

والدین کے بعد اہل قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا۔

﴿قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلّٰہِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ (بقرہ-۲۶)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اللہ تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا۔

﴿وَالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَذِی الْقُرْبٰنِیْ﴾ (بقرہ-۱۰)

(اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ اللہ ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔

سورہ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِتَّآیْ دِی الْقُرْبٰنِیْ﴾ (نحل-۱۳)

بے شک اللہ انصاف اور حسن سلوک اور قرابت دار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا۔

﴿قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلّٰہِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ﴾ (بقرہ-۲۶)

کہہ دے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ، قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے۔

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے

روک لیں، ارشاد ہوا۔

﴿وَلَا يَأْتِلْ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولَى الْقُرْبَى وَالْمَسْكِينِ﴾ (نور-۳)
 اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔
 اللہ کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسری چیز اہل قرابت کے ساتھ نیکی
 ہے فرمایا۔

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَى﴾ (نور-۶)
 اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔
 حق قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلام اپنی ان تمام مختلف زحماتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں
 کا جو تبلیغ اور دعوت حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا
 بدلہ معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے
 لطف و محبت سے پیش آؤ فرمایا۔

﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ (شری-۳)
 کہہ دے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ تاتے میں محبت اور پیار کرو۔
 عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم
 (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات
 اور حقوق محبت و امانت کی اصلی گرہ ہے یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہمسائیگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم
 پیشی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط
 رہنے کے لیے جانین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے لیکن ان تمام بندھ کر نوٹ جانے والے
 اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحم مادر ہے یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق
 انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے اس
 لیے اس نے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحی محمدی نے ”فاسق“ کا خطاب دیا ہے اور ان کو
 ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے۔

﴿وَمَا يُصَلُّ بِهِ إِلَّا الْعَاسِقُ ۖ الدَّيْسُ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا
 أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ﴾ (بقرہ-۳)

اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو عہد نہیں مانتے، جو اللہ کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں اور اللہ نے جس کے جوڑنے کو کہا
 اس کو کاٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے
 کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے اس لیے محبت والے اللہ نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ”جس نے تجھ

کو ملایا اس کو میں نے ملایا جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا“ ۱۔ اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت نے یوں ادا فرمایا کہ ”رحم انسانی عرش الہی کو پکڑ کر کہتا ہے کہ جو مجھے ملائے اس کو اللہ ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو اللہ کاٹے“ ۲۔ ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے اللہ کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا اللہ نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں“ ۳۔ یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے رحم (و کرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک محبت کے معنوی اشتراک کے مجید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے سورہ نساء میں فرمایا۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ﴾ (نساء: ۱)

اور جس اللہ کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیت پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت سے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے فرمایا اللہ کی بندگی کرو کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ نماز پوری طرح ادا کرو زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق (صلہ رحم) ادا کرو۔ ۴

جسیر بن مطعمؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ ”جو صلہ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا“ (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہو لے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)

حضرت ابو ہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے“ ۵۔ اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ ضرورت مندرشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے دوسری یہ کہ اللہ کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے پہلے کا نتیجہ اللہ کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی

۱۔ صحیح بخاری کتاب البر والصلة۔

۲۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلة۔

۳۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلة۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلہ الرحم۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب من سئل فی الرزق لصلہ الرحم۔

صورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح، دی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت چمھ اس کے لیے اضمحل، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ صلہ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں، ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمّ نیت خاطر رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے ”صلہ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے“

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلہ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلہ رحم کا جواب صلہ رحم سے دے بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلہ رحم کیا جائے، یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں، ان کا حق ادا کیا جائے۔



ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موانعت پر قائم ہے اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری کرے ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نھم کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے پیچیدہ اور بجائے خود مستقل ہے اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اور دن سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے تاکہ برائیوں کا سد باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر مسیحی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور کار کا موجب تھا اور اس لیے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا اسلام نے آ کر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔

وحی محمدی نے ہمسایہ کے پہلو پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے جیسے ایک سفر کے دور فتنے ایک مدرسہ کے دو طالب علم ایک کارخانہ کے دو ملازم ایک استاد کے دو شاگرد ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام ہر فاقہ اور صحبت ہے ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا ہمدردی کا یا کوئی اور دہر تعلق بھی ہو قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے ارشاد ہے۔

﴿وَالْحَارِ دِی لِقُرْبٰی وَالْحَارِ النُّحْبِ وَالصَّاحِبِ سَحْبِ﴾ (۹۰۰۰)

(اور اللہ نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نبی کا حکم دیا ہے)

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے ایک کہتا ہے کہ "قریب کے" معنی رشتہ

دار و عزیز اور ”بیگانہ“ کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں دوسرے کی رائے ہے کہ ”تزدیک“ کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور ”دور“ سے مطلب دوسرے مذاہب والے ہیں جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ۔^۱ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف ہے معنی ہے تعلیم محمدی کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو یا ہم مذہبی ہو یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو بہر حال حق کے ساتھ دوسرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دلشیں انداز سے فرمایا ”اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا“۔ جان نثاروں نے پوچھا ”کون یا رسول اللہ؟“ فرمایا ”وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں۔“^۲ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا جو اللہ اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔^۳ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا ”جو شخص اللہ اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔“^۴

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الہی کا ذریعہ ظاہر کیا ارشاد فرمایا ”اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے۔“^۵ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ ”جبریل نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلا دیں۔“^۶ حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے آنحضرت ﷺ خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا ”یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں؟“ فرمایا ”جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو۔“^۷

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو

۱ ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔

۲ صحیح بخاری کتاب الادب الاہم من لایا من جاہرہ بوائقہ۔

۳ صحیح بخاری کتاب الادب۔

۴ صحیح بخاری کتاب الادب۔

۵ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی حق البخار۔

۶ صحیح بخاری کتاب الادب۔

۷ صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الیواب۔

نصیحت فرمائی کہ ”اے ابوذر! جب شور باپکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو۔“^۱
 ان تحفوں کے بھیجنے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے اس لیے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ”اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو حقیر نہ سمجھے اگر چہ بکری کی کھری ہی کیوں نہ ہو۔“^۲ یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اس کی حقارت کرے۔

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔“^۳
 برائی برائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ پڑوسن کے مکان میں چوری کرنا کتنا برا ہے بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے اسی لیے توراۃ میں یہ حکم تھا۔

”تو اپنے پڑوسی پر جموٹی کو اسی مت دے تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر تو اپنے پڑوسی کی جو رو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر۔“
 (خروج ۲۰-۱۷)

”تو اپنے پڑوسی سے دعا بازی نہ کر نہ اس سے کچھ چھین لے۔“ (احبار ۱۹-۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبرؐ کی زبان حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی جن میں تورات کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برا کر کے دکھایا ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔
 ”زنا حرام ہے اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے چوری حرام ہے اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے۔“^۴

دو صحابہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں دن کو روزے رکھتیں صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں مگر زبان کی تیز تھیں زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں ان کو دوزخ کی سزا ملے گی پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں اور معمولی صدقہ

۱۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی حق الجوار

۲۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب لا تحزن جارة لجارتها

۳۔ مشکوٰۃ از تہذیب و ادب الفرد امام بخاری باب لا تشفع دون حارہ۔

۴۔ ادب الفرد امام بخاری باب حق الجار۔

دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں، فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی۔

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو (مفسر ۱۲-۳۰)
آنحضرتؐ نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے، تند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ
کرے اس کی سب سے بڑی دولت، یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے
”تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا
ہے۔“^۱

”اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا جس کو یہ
پسند ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے
پڑوسی کا حق ادا کرے۔“^۲ اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہ الہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش
ہوں گے جو پڑوسی ہوں گے،^۳ انسان کی خوش خلقی اور بد خلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے
سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صبح بے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا؟
فرمایا: جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو، اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے
ہو۔“^۴

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کر دے مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے
ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میرا
پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا جاؤ صبر کرو، اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہ عرض کی، فرمایا
جا کر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا، آنے جانے
والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انھوں نے حقیقت حال بتائی، سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ
ہوا کہ وہ ان کو من کر پھر گھر میں واپس آیا، اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے گا۔^۵

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے
دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا ٹوٹھرا لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین، گوشت کھانے کو جی
چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو؟
کیا یہ آیت یاد نہ رہی۔^۶

۱۔ ادب المفرد امام بخاری باب لا یؤذی جارہ۔

۲۔ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

۳۔ مشکوٰۃ الزیہی۔

۴۔ احمد بن حنبل، مسند عقبہ بن عامر۔

۵۔ ادب المفرد بخاری باب شکلیۃ الجار و ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار۔

۶۔ موطا امام مالک باب ما جاء فی اکل اللحم۔

﴿يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ لَكُمْ عَذَابُكُمْ طَيِّبٌ﴾
(تخاف؟)

اور جس دن کافروں پر پیش ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور اس سے قائدہ اٹھا چکے۔

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے جس کے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا کیونکہ میں نے رسول اللہ کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنادیں گے۔ ا



یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایہ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے اس کو پیار کرے اس کی ہر طرح خدمت کرے اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیہ کی من سب فکر کرے یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔

عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بد امنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی مگر جیسا کہ چاہئے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا قرآن پاک میں ان کی اس بد سلوکی کا ذکر بار بار ہے۔

﴿ارَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۖ فَذَلِكِ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ﴾ (۱۰۷)

کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو بھٹاتا ہے سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

﴿كَلَّا نَلَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۖ وَلَا نَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۖ وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاثِ الْكُلًّا

لُعْمًا ۖ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ (انجیر-۱)

نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کے رکھتے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے کہ ”شہر کے پھانک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں“ (استثنا ۱۳-۲۹ و ۲۶-۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا وحی الہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلادیا

﴿أَلَمْ يَجْعَلْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۖ ۝ ۲ ۖ ۝ ۳ ۖ ۝ ۴ ۖ ۝ ۵ ۖ ۝ ۶ ۖ ۝ ۷ ۖ ۝ ۸ ۖ ۝ ۹ ۖ ۝ ۱۰ ۖ ۝ ۱۱ ۖ ۝ ۱۲ ۖ ۝ ۱۳ ۖ ۝ ۱۴ ۖ ۝ ۱۵ ۖ ۝ ۱۶ ۖ ۝ ۱۷ ۖ ۝ ۱۸ ۖ ۝ ۱۹ ۖ ۝ ۲۰ ۖ ۝ ۲۱ ۖ ۝ ۲۲ ۖ ۝ ۲۳ ۖ ۝ ۲۴ ۖ ۝ ۲۵ ۖ ۝ ۲۶ ۖ ۝ ۲۷ ۖ ۝ ۲۸ ۖ ۝ ۲۹ ۖ ۝ ۳۰ ۖ ۝ ۳۱ ۖ ۝ ۳۲ ۖ ۝ ۳۳ ۖ ۝ ۳۴ ۖ ۝ ۳۵ ۖ ۝ ۳۶ ۖ ۝ ۳۷ ۖ ۝ ۳۸ ۖ ۝ ۳۹ ۖ ۝ ۴۰ ۖ ۝ ۴۱ ۖ ۝ ۴۲ ۖ ۝ ۴۳ ۖ ۝ ۴۴ ۖ ۝ ۴۵ ۖ ۝ ۴۶ ۖ ۝ ۴۷ ۖ ۝ ۴۸ ۖ ۝ ۴۹ ۖ ۝ ۵۰ ۖ ۝ ۵۱ ۖ ۝ ۵۲ ۖ ۝ ۵۳ ۖ ۝ ۵۴ ۖ ۝ ۵۵ ۖ ۝ ۵۶ ۖ ۝ ۵۷ ۖ ۝ ۵۸ ۖ ۝ ۵۹ ۖ ۝ ۶۰ ۖ ۝ ۶۱ ۖ ۝ ۶۲ ۖ ۝ ۶۳ ۖ ۝ ۶۴ ۖ ۝ ۶۵ ۖ ۝ ۶۶ ۖ ۝ ۶۷ ۖ ۝ ۶۸ ۖ ۝ ۶۹ ۖ ۝ ۷۰ ۖ ۝ ۷۱ ۖ ۝ ۷۲ ۖ ۝ ۷۳ ۖ ۝ ۷۴ ۖ ۝ ۷۵ ۖ ۝ ۷۶ ۖ ۝ ۷۷ ۖ ۝ ۷۸ ۖ ۝ ۷۹ ۖ ۝ ۸۰ ۖ ۝ ۸۱ ۖ ۝ ۸۲ ۖ ۝ ۸۳ ۖ ۝ ۸۴ ۖ ۝ ۸۵ ۖ ۝ ۸۶ ۖ ۝ ۸۷ ۖ ۝ ۸۸ ۖ ۝ ۸۹ ۖ ۝ ۹۰ ۖ ۝ ۹۱ ۖ ۝ ۹۲ ۖ ۝ ۹۳ ۖ ۝ ۹۴ ۖ ۝ ۹۵ ۖ ۝ ۹۶ ۖ ۝ ۹۷ ۖ ۝ ۹۸ ۖ ۝ ۹۹ ۖ ۝ ۱۰۰ ۖ ۝ ۱۰۱ ۖ ۝ ۱۰۲ ۖ ۝ ۱۰۳ ۖ ۝ ۱۰۴ ۖ ۝ ۱۰۵ ۖ ۝ ۱۰۶ ۖ ۝ ۱۰۷ ۖ ۝ ۱۰۸ ۖ ۝ ۱۰۹ ۖ ۝ ۱۱۰ ۖ ۝ ۱۱۱ ۖ ۝ ۱۱۲ ۖ ۝ ۱۱۳ ۖ ۝ ۱۱۴ ۖ ۝ ۱۱۵ ۖ ۝ ۱۱۶ ۖ ۝ ۱۱۷ ۖ ۝ ۱۱۸ ۖ ۝ ۱۱۹ ۖ ۝ ۱۲۰ ۖ ۝ ۱۲۱ ۖ ۝ ۱۲۲ ۖ ۝ ۱۲۳ ۖ ۝ ۱۲۴ ۖ ۝ ۱۲۵ ۖ ۝ ۱۲۶ ۖ ۝ ۱۲۷ ۖ ۝ ۱۲۸ ۖ ۝ ۱۲۹ ۖ ۝ ۱۳۰ ۖ ۝ ۱۳۱ ۖ ۝ ۱۳۲ ۖ ۝ ۱۳۳ ۖ ۝ ۱۳۴ ۖ ۝ ۱۳۵ ۖ ۝ ۱۳۶ ۖ ۝ ۱۳۷ ۖ ۝ ۱۳۸ ۖ ۝ ۱۳۹ ۖ ۝ ۱۴۰ ۖ ۝ ۱۴۱ ۖ ۝ ۱۴۲ ۖ ۝ ۱۴۳ ۖ ۝ ۱۴۴ ۖ ۝ ۱۴۵ ۖ ۝ ۱۴۶ ۖ ۝ ۱۴۷ ۖ ۝ ۱۴۸ ۖ ۝ ۱۴۹ ۖ ۝ ۱۵۰ ۖ ۝ ۱۵۱ ۖ ۝ ۱۵۲ ۖ ۝ ۱۵۳ ۖ ۝ ۱۵۴ ۖ ۝ ۱۵۵ ۖ ۝ ۱۵۶ ۖ ۝ ۱۵۷ ۖ ۝ ۱۵۸ ۖ ۝ ۱۵۹ ۖ ۝ ۱۶۰ ۖ ۝ ۱۶۱ ۖ ۝ ۱۶۲ ۖ ۝ ۱۶۳ ۖ ۝ ۱۶۴ ۖ ۝ ۱۶۵ ۖ ۝ ۱۶۶ ۖ ۝ ۱۶۷ ۖ ۝ ۱۶۸ ۖ ۝ ۱۶۹ ۖ ۝ ۱۷۰ ۖ ۝ ۱۷۱ ۖ ۝ ۱۷۲ ۖ ۝ ۱۷۳ ۖ ۝ ۱۷۴ ۖ ۝ ۱۷۵ ۖ ۝ ۱۷۶ ۖ ۝ ۱۷۷ ۖ ۝ ۱۷۸ ۖ ۝ ۱۷۹ ۖ ۝ ۱۸۰ ۖ ۝ ۱۸۱ ۖ ۝ ۱۸۲ ۖ ۝ ۱۸۳ ۖ ۝ ۱۸۴ ۝ ۱۸۵ ۖ ۝ ۱۸۶ ۖ ۝ ۱۸۷ ۖ ۝ ۱۸۸ ۖ ۝ ۱۸۹ ۖ ۝ ۱۹۰ ۖ ۝ ۱۹۱ ۖ ۝ ۱۹۲ ۖ ۝ ۱۹۳ ۖ ۝ ۱۹۴ ۖ ۝ ۱۹۵ ۖ ۝ ۱۹۶ ۖ ۝ ۱۹۷ ۖ ۝ ۱۹۸ ۖ ۝ ۱۹۹ ۖ ۝ ۲۰۰ ۖ ۝ ۲۰۱ ۖ ۝ ۲۰۲ ۖ ۝ ۲۰۳ ۖ ۝ ۲۰۴ ۖ ۝ ۲۰۵ ۖ ۝ ۲۰۶ ۖ ۝ ۲۰۷ ۖ ۝ ۲۰۸ ۖ ۝ ۲۰۹ ۖ ۝ ۲۱۰ ۖ ۝ ۲۱۱ ۖ ۝ ۲۱۲ ۖ ۝ ۲۱۳ ۖ ۝ ۲۱۴ ۖ ۝ ۲۱۵ ۖ ۝ ۲۱۶ ۖ ۝ ۲۱۷ ۖ ۝ ۲۱۸ ۖ ۝ ۲۱۹ ۖ ۝ ۲۲۰ ۖ ۝ ۲۲۱ ۖ ۝ ۲۲۲ ۖ ۝ ۲۲۳ ۖ ۝ ۲۲۴ ۖ ۝ ۲۲۵ ۖ ۝ ۲۲۶ ۖ ۝ ۲۲۷ ۖ ۝ ۲۲۸ ۖ ۝ ۲۲۹ ۖ ۝ ۲۳۰ ۖ ۝ ۲۳۱ ۖ ۝ ۲۳۲ ۖ ۝ ۲۳۳ ۖ ۝ ۲۳۴ ۖ ۝ ۲۳۵ ۖ ۝ ۲۳۶ ۖ ۝ ۲۳۷ ۖ ۝ ۲۳۸ ۖ ۝ ۲۳۹ ۖ ۝ ۲۴۰ ۖ ۝ ۲۴۱ ۖ ۝ ۲۴۲ ۖ ۝ ۲۴۳ ۖ ۝ ۲۴۴ ۖ ۝ ۲۴۵ ۖ ۝ ۲۴۶ ۖ ۝ ۲۴۷ ۖ ۝ ۲۴۸ ۖ ۝ ۲۴۹ ۖ ۝ ۲۵۰ ۖ ۝ ۲۵۱ ۖ ۝ ۲۵۲ ۖ ۝ ۲۵۳ ۖ ۝ ۲۵۴ ۖ ۝ ۲۵۵ ۖ ۝ ۲۵۶ ۖ ۝ ۲۵۷ ۖ ۝ ۲۵۸ ۖ ۝ ۲۵۹ ۖ ۝ ۲۶۰ ۖ ۝ ۲۶۱ ۖ ۝ ۲۶۲ ۖ ۝ ۲۶۳ ۖ ۝ ۲۶۴ ۖ ۝ ۲۶۵ ۖ ۝ ۲۶۶ ۖ ۝ ۲۶۷ ۖ ۝ ۲۶۸ ۖ ۝ ۲۶۹ ۖ ۝ ۲۷۰ ۖ ۝ ۲۷۱ ۖ ۝ ۲۷۲ ۖ ۝ ۲۷۳ ۖ ۝ ۲۷۴ ۖ ۝ ۲۷۵ ۖ ۝ ۲۷۶ ۖ ۝ ۲۷۷ ۖ ۝ ۲۷۸ ۖ ۝ ۲۷۹ ۖ ۝ ۲۸۰ ۖ ۝ ۲۸۱ ۖ ۝ ۲۸۲ ۖ ۝ ۲۸۳ ۖ ۝ ۲۸۴ ۖ ۝ ۲۸۵ ۖ ۝ ۲۸۶ ۖ ۝ ۲۸۷ ۖ ۝ ۲۸۸ ۖ ۝ ۲۸۹ ۖ ۝ ۲۹۰ ۖ ۝ ۲۹۱ ۖ ۝ ۲۹۲ ۖ ۝ ۲۹۳ ۖ ۝ ۲۹۴ ۖ ۝ ۲۹۵ ۖ ۝ ۲۹۶ ۖ ۝ ۲۹۷ ۖ ۝ ۲۹۸ ۖ ۝ ۲۹۹ ۖ ۝ ۳۰۰ ۖ ۝ ۳۰۱ ۖ ۝ ۳۰۲ ۖ ۝ ۳۰۳ ۖ ۝ ۳۰۴ ۖ ۝ ۳۰۵ ۖ ۝ ۳۰۶ ۖ ۝ ۳۰۷ ۖ ۝ ۳۰۸ ۖ ۝ ۳۰۹ ۖ ۝ ۳۱۰ ۖ ۝ ۳۱۱ ۖ ۝ ۳۱۲ ۖ ۝ ۳۱۳ ۖ ۝ ۳۱۴ ۖ ۝ ۳۱۵ ۖ ۝ ۳۱۶ ۖ ۝ ۳۱۷ ۖ ۝ ۳۱۸ ۖ ۝ ۳۱۹ ۖ ۝ ۳۲۰ ۖ ۝ ۳۲۱ ۖ ۝ ۳۲۲ ۖ ۝ ۳۲۳ ۖ ۝ ۳۲۴ ۖ ۝ ۳۲۵ ۖ ۝ ۳۲۶ ۖ ۝ ۳۲۷ ۖ ۝ ۳۲۸ ۖ ۝ ۳۲۹ ۖ ۝ ۳۳۰ ۖ ۝ ۳۳۱ ۖ ۝ ۳۳۲ ۖ ۝ ۳۳۳ ۖ ۝ ۳۳۴ ۖ ۝ ۳۳۵ ۖ ۝ ۳۳۶ ۖ ۝ ۳۳۷ ۖ ۝ ۳۳۸ ۖ ۝ ۳۳۹ ۖ ۝ ۳۴۰ ۖ ۝ ۳۴۱ ۖ ۝ ۳۴۲ ۖ ۝ ۳۴۳ ۖ ۝ ۳۴۴ ۖ ۝ ۳۴۵ ۖ ۝ ۳۴۶ ۖ ۝ ۳۴۷ ۖ ۝ ۳۴۸ ۖ ۝ ۳۴۹ ۖ ۝ ۳۵۰ ۖ ۝ ۳۵۱ ۖ ۝ ۳۵۲ ۖ ۝ ۳۵۳ ۖ ۝ ۳۵۴ ۖ ۝ ۳۵۵ ۖ ۝ ۳۵۶ ۖ ۝ ۳۵۷ ۖ ۝ ۳۵۸ ۖ ۝ ۳۵۹ ۖ ۝ ۳۶۰ ۖ ۝ ۳۶۱ ۖ ۝ ۳۶۲ ۖ ۝ ۳۶۳ ۖ ۝ ۳۶۴ ۖ ۝ ۳۶۵ ۖ ۝ ۳۶۶ ۖ ۝ ۳۶۷ ۖ ۝ ۳۶۸ ۖ ۝ ۳۶۹ ۖ ۝ ۳۷۰ ۖ ۝ ۳۷۱ ۖ ۝ ۳۷۲ ۖ ۝ ۳۷۳ ۖ ۝ ۳۷۴ ۖ ۝ ۳۷۵ ۖ ۝ ۳۷۶ ۖ ۝ ۳۷۷ ۖ ۝ ۳۷۸ ۖ ۝ ۳۷۹ ۖ ۝ ۳۸۰ ۖ ۝ ۳۸۱ ۖ ۝ ۳۸۲ ۖ ۝ ۳۸۳ ۖ ۝ ۳۸۴ ۖ ۝ ۳۸۵ ۖ ۝ ۳۸۶ ۖ ۝ ۳۸۷ ۖ ۝ ۳۸۸ ۖ ۝ ۳۸۹ ۖ ۝ ۳۹۰ ۖ ۝ ۳۹۱ ۖ ۝ ۳۹۲ ۖ ۝ ۳۹۳ ۖ ۝ ۳۹۴ ۖ ۝ ۳۹۵ ۖ ۝ ۳۹۶ ۖ ۝ ۳۹۷ ۖ ۝ ۳۹۸ ۖ ۝ ۳۹۹ ۖ ۝ ۴۰۰ ۖ ۝ ۴۰۱ ۖ ۝ ۴۰۲ ۖ ۝ ۴۰۳ ۖ ۝ ۴۰۴ ۖ ۝ ۴۰۵ ۖ ۝ ۴۰۶ ۖ ۝ ۴۰۷ ۖ ۝ ۴۰۸ ۖ ۝ ۴۰۹ ۖ ۝ ۴۱۰ ۖ ۝ ۴۱۱ ۖ ۝ ۴۱۲ ۖ ۝ ۴۱۳ ۖ ۝ ۴۱۴ ۖ ۝ ۴۱۵ ۖ ۝ ۴۱۶ ۖ ۝ ۴۱۷ ۖ ۝ ۴۱۸ ۖ ۝ ۴۱۹ ۖ ۝ ۴۲۰ ۖ ۝ ۴۲۱ ۖ ۝ ۴۲۲ ۖ ۝ ۴۲۳ ۖ ۝ ۴۲۴ ۖ ۝ ۴۲۵ ۖ ۝ ۴۲۶ ۖ ۝ ۴۲۷ ۖ ۝ ۴۲۸ ۖ ۝ ۴۲۹ ۖ ۝ ۴۳۰ ۖ ۝ ۴۳۱ ۖ ۝ ۴۳۲ ۖ ۝ ۴۳۳ ۖ ۝ ۴۳۴ ۖ ۝ ۴۳۵ ۖ ۝ ۴۳۶ ۖ ۝ ۴۳۷ ۖ ۝ ۴۳۸ ۖ ۝ ۴۳۹ ۖ ۝ ۴۴۰ ۖ ۝ ۴۴۱ ۖ ۝ ۴۴۲ ۖ ۝ ۴۴۳ ۖ ۝ ۴۴۴ ۖ ۝ ۴۴۵ ۖ ۝ ۴۴۶ ۖ ۝ ۴۴۷ ۖ ۝ ۴۴۸ ۖ ۝ ۴۴۹ ۖ ۝ ۴۵۰ ۖ ۝ ۴۵۱ ۖ ۝ ۴۵۲ ۖ ۝ ۴۵۳ ۖ ۝ ۴۵۴ ۖ ۝ ۴۵۵ ۖ ۝ ۴۵۶ ۖ ۝ ۴۵۷ ۖ ۝ ۴۵۸ ۖ ۝ ۴۵۹ ۖ ۝ ۴۶۰ ۖ ۝ ۴۶۱ ۖ ۝ ۴۶۲ ۖ ۝ ۴۶۳ ۖ ۝ ۴۶۴ ۖ ۝ ۴۶۵ ۖ ۝ ۴۶۶ ۖ ۝ ۴۶۷ ۖ ۝ ۴۶۸ ۖ ۝ ۴۶۹ ۖ ۝ ۴۷۰ ۖ ۝ ۴۷۱ ۖ ۝ ۴۷۲ ۖ ۝ ۴۷۳ ۖ ۝ ۴۷۴ ۖ ۝ ۴۷۵ ۖ ۝ ۴۷۶ ۖ ۝ ۴۷۷ ۖ ۝ ۴۷۸ ۖ ۝ ۴۷۹ ۖ ۝ ۴۸۰ ۖ ۝ ۴۸۱ ۖ ۝ ۴۸۲ ۖ ۝ ۴۸۳ ۖ ۝ ۴۸۴ ۖ ۝ ۴۸۵ ۖ ۝ ۴۸۶ ۖ ۝ ۴۸۷ ۖ ۝ ۴۸۸ ۖ ۝ ۴۸۹ ۖ ۝ ۴۹۰ ۖ ۝ ۴۹۱ ۖ ۝ ۴۹۲ ۖ ۝ ۴۹۳ ۖ ۝ ۴۹۴ ۖ ۝ ۴۹۵ ۖ ۝ ۴۹۶ ۖ ۝ ۴۹۷ ۖ ۝ ۴۹۸ ۖ ۝ ۴۹۹ ۖ ۝ ۵۰۰ ۖ ۝ ۵۰۱ ۖ ۝ ۵۰۲ ۖ ۝ ۵۰۳ ۖ ۝ ۵۰۴ ۖ ۝ ۵۰۵ ۖ ۝ ۵۰۶ ۖ ۝ ۵۰۷ ۖ ۝ ۵۰۸ ۖ ۝ ۵۰۹ ۖ ۝ ۵۱۰ ۖ ۝ ۵۱۱ ۖ ۝ ۵۱۲ ۖ ۝ ۵۱۳ ۖ ۝ ۵۱۴ ۖ ۝ ۵۱۵ ۖ ۝ ۵۱۶ ۖ ۝ ۵۱۷ ۖ ۝ ۵۱۸ ۖ ۝ ۵۱۹ ۖ ۝ ۵۲۰ ۖ ۝ ۵۲۱ ۖ ۝ ۵۲۲ ۖ ۝ ۵۲۳ ۖ ۝ ۵۲۴ ۖ ۝ ۵۲۵ ۖ ۝ ۵۲۶ ۖ ۝ ۵۲۷ ۖ ۝ ۵۲۸ ۖ ۝ ۵۲۹ ۖ ۝ ۵۳۰ ۖ ۝ ۵۳۱ ۖ ۝ ۵۳۲ ۖ ۝ ۵۳۳ ۖ ۝ ۵۳۴ ۖ ۝ ۵۳۵ ۖ ۝ ۵۳۶ ۖ ۝ ۵۳۷ ۖ ۝ ۵۳۸ ۖ ۝ ۵۳۹ ۖ ۝ ۵۴۰ ۖ ۝ ۵۴۱ ۖ ۝ ۵۴۲ ۖ ۝ ۵۴۳ ۖ ۝ ۵۴۴ ۖ ۝ ۵۴۵ ۖ ۝ ۵۴۶ ۖ ۝ ۵۴۷ ۖ ۝ ۵۴۸ ۖ ۝ ۵۴۹ ۖ ۝ ۵۵۰ ۖ ۝ ۵۵۱ ۖ ۝ ۵۵۲ ۖ ۝ ۵۵۳ ۖ ۝ ۵۵۴ ۖ ۝ ۵۵۵ ۖ ۝ ۵۵۶ ۖ ۝ ۵۵۷ ۖ ۝ ۵۵۸ ۖ ۝ ۵۵۹ ۖ ۝ ۵۶۰ ۖ ۝ ۵۶۱ ۖ ۝ ۵۶۲ ۖ ۝ ۵۶۳ ۖ ۝ ۵۶۴ ۖ ۝ ۵۶۵ ۖ ۝ ۵۶۶ ۖ ۝ ۵۶۷ ۖ ۝ ۵۶۸ ۖ ۝ ۵۶۹ ۖ ۝ ۵۷۰ ۖ ۝ ۵۷۱ ۖ ۝ ۵۷۲ ۖ ۝ ۵۷۳ ۖ ۝ ۵۷۴ ۖ ۝ ۵۷۵ ۖ ۝ ۵۷۶ ۖ ۝ ۵۷۷ ۖ ۝ ۵۷۸ ۖ ۝ ۵۷۹ ۖ ۝ ۵۸۰ ۖ ۝ ۵۸۱ ۖ ۝ ۵۸۲ ۖ ۝ ۵۸۳ ۖ ۝ ۵۸۴ ۖ ۝ ۵۸۵ ۖ ۝ ۵۸۶ ۖ ۝ ۵۸۷ ۖ ۝ ۵۸۸ ۖ ۝ ۵۸۹ ۖ ۝ ۵۹۰ ۖ ۝ ۵۹۱ ۖ ۝ ۵۹۲ ۖ ۝ ۵۹۳ ۖ ۝ ۵۹۴ ۖ ۝ ۵۹۵ ۖ ۝ ۵۹۶ ۖ ۝ ۵۹۷ ۖ ۝ ۵۹۸ ۖ ۝ ۵۹۹ ۖ ۝ ۶۰۰ ۖ ۝ ۶۰۱ ۖ ۝ ۶۰۲ ۖ ۝ ۶۰۳ ۖ ۝ ۶۰۴ ۖ ۝ ۶۰۵ ۖ ۝ ۶۰۶ ۖ ۝ ۶۰۷ ۖ ۝ ۶۰۸ ۖ ۝ ۶۰۹ ۖ ۝ ۶۱۰ ۖ ۝ ۶۱۱ ۖ ۝ ۶۱۲ ۖ ۝ ۶۱۳ ۖ ۝ ۶۱۴ ۖ ۝ ۶۱۵ ۖ ۝ ۶۱۶ ۖ ۝ ۶۱۷ ۖ ۝ ۶۱۸ ۖ ۝ ۶۱۹ ۖ ۝ ۶۲۰ ۖ ۝ ۶۲۱ ۖ ۝ ۶۲۲ ۖ ۝ ۶۲۳ ۖ ۝ ۶۲۴ ۖ ۝ ۶۲۵ ۖ ۝ ۶۲۶ ۖ ۝ ۶۲۷ ۖ ۝ ۶۲۸ ۖ ۝ ۶۲۹ ۖ ۝ ۶۳۰ ۖ ۝ ۶۳۱ ۖ ۝ ۶۳۲ ۖ ۝ ۶۳۳ ۖ ۝ ۶۳۴ ۖ ۝ ۶۳۵ ۖ ۝ ۶۳۶ ۖ ۝ ۶۳۷ ۖ ۝ ۶۳۸ ۖ ۝ ۶۳۹ ۖ ۝ ۶۴۰ ۖ ۝ ۶۴۱ ۖ ۝ ۶۴۲ ۖ ۝ ۶۴۳ ۖ ۝ ۶۴۴ ۖ ۝ ۶۴۵ ۖ ۝ ۶۴۶ ۖ ۝ ۶۴۷ ۖ ۝ ۶۴۸ ۖ ۝ ۶۴۹ ۖ ۝ ۶۵۰ ۖ ۝ ۶۵۱ ۖ ۝ ۶۵۲ ۖ ۝ ۶۵۳ ۖ ۝ ۶۵۴ ۝ ۶۵۵ ۖ ۝ ۶۵۶ ۖ ۝ ۶۵۷ ۖ ۝ ۶۵۸ ۖ ۝ ۶۵۹ ۖ ۝ ۶۶۰ ۖ ۝ ۶۶۱ ۖ ۝ ۶۶۲ ۖ ۝ ۶۶۳ ۖ ۝ ۶۶۴ ۖ ۝ ۶۶۵ ۖ ۝ ۶۶۶ ۖ ۝ ۶۶۷ ۖ ۝ ۶۶۸ ۖ ۝ ۶۶۹ ۖ ۝ ۶۷۰ ۖ ۝ ۶۷۱ ۖ ۝ ۶۷۲ ۖ ۝ ۶۷۳ ۖ ۝ ۶۷۴ ۖ ۝ ۶۷۵ ۖ ۝ ۶۷۶ ۖ ۝ ۶۷۷ ۖ ۝ ۶۷۸ ۖ ۝ ۶۷۹ ۖ ۝ ۶۸۰ ۖ ۝ ۶۸۱ ۖ ۝ ۶۸۲ ۖ ۝ ۶۸۳ ۖ ۝ ۶۸۴ ۖ ۝ ۶۸۵ ۖ ۝ ۶۸۶ ۖ ۝ ۶۸۷ ۖ ۝ ۶۸۸ ۖ ۝ ۶۸۹ ۖ ۝ ۶۹۰ ۖ ۝ ۶۹۱ ۖ ۝ ۶۹۲ ۖ ۝ ۶۹۳ ۖ ۝ ۶۹۴ ۖ ۝ ۶۹۵ ۖ ۝ ۶۹۶ ۖ ۝ ۶۹۷ ۖ ۝ ۶۹۸ ۖ ۝ ۶۹۹ ۖ ۝ ۷۰۰ ۖ ۝ ۷۰۱ ۖ ۝ ۷۰۲ ۖ ۝ ۷۰۳ ۖ ۝ ۷۰۴ ۖ ۝ ۷۰۵ ۖ ۝ ۷۰۶ ۖ ۝ ۷۰۷ ۖ ۝ ۷۰۸ ۖ ۝ ۷۰۹ ۖ ۝ ۷۱۰ ۖ ۝ ۷۱۱ ۖ ۝ ۷۱۲ ۖ ۝ ۷۱۳ ۖ ۝ ۷۱۴ ۖ ۝ ۷۱۵ ۖ ۝ ۷۱۶ ۖ ۝ ۷۱۷ ۖ ۝ ۷۱۸ ۖ ۝ ۷۱۹ ۖ ۝ ۷۲۰ ۖ ۝ ۷۲۱ ۖ ۝ ۷۲۲ ۖ ۝ ۷۲۳ ۖ ۝ ۷۲۴ ۖ ۝ ۷۲۵ ۖ ۝ ۷۲۶ ۖ ۝ ۷۲۷ ۖ ۝ ۷۲۸ ۖ ۝ ۷۲۹ ۖ ۝ ۷۳۰ ۖ ۝ ۷۳۱ ۖ ۝ ۷۳۲ ۖ ۝ ۷۳۳ ۖ ۝ ۷۳۴ ۖ ۝ ۷۳۵ ۖ ۝ ۷۳۶ ۖ ۝ ۷۳۷ ۖ ۝ ۷۳۸ ۖ ۝ ۷۳۹ ۖ ۝ ۷۴۰ ۖ ۝ ۷۴۱ ۖ ۝ ۷۴۲ ۖ ۝ ۷۴۳ ۖ ۝ ۷۴۴ ۖ ۝ ۷۴۵ ۖ ۝ ۷۴۶ ۖ ۝ ۷۴۷ ۖ ۝ ۷۴۸ ۖ ۝ ۷۴۹ ۖ ۝ ۷۵۰ ۖ ۝ ۷۵۱ ۖ ۝ ۷۵۲ ۖ ۝ ۷۵۳ ۖ ۝ ۷۵۴ ۖ ۝ ۷۵۵ ۖ ۝ ۷۵۶ ۖ ۝ ۷۵۷ ۖ ۝ ۷۵۸ ۖ ۝ ۷۵۹ ۖ ۝ ۷۶۰ ۖ ۝ ۷۶۱ ۖ ۝ ۷۶۲ ۖ ۝ ۷۶۳ ۖ ۝ ۷۶۴ ۖ ۝ ۷۶۵ ۖ ۝ ۷۶۶ ۖ ۝ ۷۶۷ ۖ ۝ ۷۶۸ ۖ ۝ ۷۶۹ ۖ ۝ ۷۷۰ ۖ ۝ ۷۷۱ ۖ ۝ ۷۷۲ ۖ ۝ ۷۷۳ ۖ ۝ ۷۷۴ ۖ ۝ ۷۷۵ ۖ ۝ ۷۷۶ ۖ ۝ ۷۷۷ ۖ ۝ ۷۷۸ ۖ ۝ ۷۷۹ ۖ ۝ ۷۸۰ ۖ ۝ ۷۸۱ ۖ ۝ ۷۸۲ ۖ ۝ ۷۸۳ ۖ ۝ ۷۸۴ ۖ ۝ ۷۸۵ ۖ ۝ ۷۸۶ ۖ ۝ ۷۸۷ ۖ ۝ ۷۸۸ ۖ ۝ ۷۸۹ ۖ ۝ ۷۹۰ ۖ ۝ ۷۹۱ ۖ ۝ ۷۹۲ ۖ ۝ ۷۹۳ ۖ ۝ ۷۹۴ ۖ ۝ ۷۹۵ ۖ ۝ ۷۹۶ ۖ ۝ ۷۹۷ ۖ ۝ ۷۹۸ ۖ ۝ ۷۹۹ ۖ ۝ ۸۰۰ ۖ ۝ ۸۰۱ ۖ ۝ ۸۰۲ ۖ ۝ ۸۰۳ ۖ ۝ ۸۰۴ ۖ ۝ ۸۰۵ ۖ ۝ ۸۰۶ ۖ ۝ ۸۰۷ ۖ ۝ ۸۰۸ ۖ ۝ ۸۰۹ ۖ ۝ ۸۱۰ ۖ ۝ ۸۱۱ ۖ ۝ ۸۱۲ ۖ ۝ ۸۱۳ ۖ ۝ ۸۱۴ ۖ ۝ ۸۱۵ ۖ ۝ ۸۱۶ ۖ ۝ ۸۱۷ ۖ ۝ ۸۱۸ ۖ ۝ ۸۱۹ ۖ ۝ ۸۲۰ ۖ ۝ ۸۲۱ ۖ ۝ ۸۲۲ ۖ ۝ ۸۲۳ ۖ ۝ ۸۲۴ ۖ ۝ ۸۲۵ ۖ ۝ ۸۲۶ ۖ ۝ ۸۲۷ ۖ ۝ ۸۲۸ ۖ ۝ ۸۲۹ ۖ ۝ ۸۳۰ ۖ ۝ ۸۳۱ ۖ ۝ ۸۳۲ ۖ ۝ ۸۳۳ ۖ ۝ ۸۳۴ ۖ ۝ ۸۳۵ ۖ ۝ ۸۳۶ ۖ ۝ ۸۳۷ ۖ ۝ ۸۳۸ ۖ ۝ ۸۳۹ ۖ ۝ ۸۴۰ ۖ ۝ ۸۴۱ ۖ ۝ ۸۴۲ ۖ ۝ ۸۴۳ ۖ ۝ ۸۴۴ ۖ ۝ ۸۴۵ ۖ ۝ ۸۴۶ ۖ ۝ ۸۴۷ ۖ ۝ ۸۴۸ ۖ ۝ ۸۴۹ ۖ ۝ ۸۵۰ ۖ ۝ ۸۵۱ ۖ ۝ ۸۵۲ ۖ ۝ ۸۵۳ ۖ ۝ ۸۵۴ ۖ ۝ ۸۵۵ ۖ ۝ ۸۵۶ ۖ ۝ ۸۵۷ ۖ ۝ ۸۵۸ ۖ ۝ ۸۵۹ ۖ ۝ ۸۶۰ ۖ ۝ ۸۶۱ ۖ ۝ ۸۶۲ ۖ ۝ ۸۶۳ ۖ ۝ ۸۶۴ ۖ ۝ ۸۶۵ ۖ ۝ ۸۶۶ ۖ ۝

اس گھائی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ ظلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے۔

﴿وَأَوْطَعَامَ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ، يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ (بد۔ ۱)
یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھلاتا۔

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو

﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا﴾ (۱۔ ۲)
اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی سورہ نساء میں اس یکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے ان کو وراثت کا حق دلایا گیا اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے ان سے کہا گیا۔

﴿وَاتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمُ الَّتِي آمَوَ الْكُفْرُ أَنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا﴾ (نساء۔ ۱)

اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دیدو اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلنا نہ کرو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مالی کھا جاؤ یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔

دولت مند یتیم لڑکیوں کو ان کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے اور بے والی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے اس پر حکم آیا۔

﴿وَإِنْ جَفَنُمْ وَلَا تُقْسَطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مِمَّا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ (نساء۔ ۱)
اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کو چھوڑو اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کرلو۔

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہئے اور نہ جب تک ان کو پورا شعور آئے وہ ان کے سپرد کیا جائے بلکہ ان کے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ان کی عقل کو دیکھ بھل کر ان کی یہ امانت ان کو واپس کی جائے فرمایا۔

﴿وَلَا تَوْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَمًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ (۱۔ ۲)
وَابْتَغُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا تَلَفُوا الْبِكَاحِ فَإِنْ نَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ﴾ (نساء۔ ۱)

اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے نہ پکڑاؤ اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہو اور یتیموں کو جانچتے رہو جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو۔

ان آیات پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناجائز یتیموں

کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو اور آیت کے آخر میں جہاں بوج اور سن رشد کے بعد متولیوں کو قییموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے وہاں اس مال کی نسبت قییموں کی طرف کی گئی کہ ”تم ان کا مال ان کو واپس کر دو“۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک نیک تک تک چن کر واپس کیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں متولیوں کو جو قییموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضہ نہ کر سکیں اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی۔

﴿وَلَا تَاْكُلُوْهَا سِرَافًا وَبِدَارًا اَنْ يَّكْبُرُوْا﴾ (نساء۔۱۱)

اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔

صاحب جائیداد قییموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو ان کے لیے ان قییموں کی جائیداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلاف اخلاق قرار دیا گیا اور اگر تنگ دست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی۔

﴿وَمَنْ كَانَ عَسِيًّا فَيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَيُكْلُ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (نساء۔۱۱)

اور جو (متولی) بے نیاز ہے سو چاہئے کہ پتھر ہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی۔

﴿وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰی بِالْقِسْطِ﴾ (نساء۔۱۹)

اور یہ کہ قییموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔

سورہ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی غنا ہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی ان میں ایک یہ ہے کہ

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتٰمٰی اِلَّا بِالَّتٰمٰنٰی هٰی اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدُّهُ﴾ (انعام۔۱۹)

اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔

سورہ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائیداد قییموں کی جائیداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکتا چاہئے اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچا رکھنا چاہئے (۱۷۔۱۸)۔

یہ تو صاحب جائیداد قییموں کی نسبت تعلیم ہے جو یتیم غریب و مفلس ہوں ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ نساء، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی و انسبی و احساکیں خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث امت کے سرپرست نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی و وارث قییموں کے کفیل ہوں خود اپنے برابر جگہ دی فرمایا ”میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو

انکلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔^۱ یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشش کے لائق نہ ہو۔"^۲ نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھائی کی جارہی ہے اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسوئی کی جاتی ہو۔"^۳

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی وہی دل جو ہمیں و ناتواں یتیموں کے لیے پھر سے زیادہ سخت تھے وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لیے اپنے آغوشِ محبت کو پیش کرنے لگا۔^۴ بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشہ رسولِ فاطمہؑ بتول اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی ہے۔^۵ حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان کے اور انصار کے وغیرہ کے یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دس و جان سے پالتی ہیں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔^۶

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دوست کی تولیت اور نگرانی میں دیا ننداری برتنے لگے بلکہ ان کی جائیدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیرِ چشمی کا پورا ثبوت دیا ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپ نے وہ نخلستان مدعی علیہ کو دلا دیا وہ یتیم اس پر رو پڑا آپ کو رحم آیا اور اس مدعی علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو اللہ تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا ابوالوحد اح صحابی حاضر تھے انھوں نے اس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو اس نے آم دگی ظاہر کی انھوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔^۷

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں مگر اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ محمد رسول اللہ سے پہلے بھی یہ بد قسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ

۱۔ صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیم و صحیح مسلم باب فضل الاحسان و یتیم۔

۲۔ ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲ و ص ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح)۔

۳۔ ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۳۲ و ص ۱۳۳ بحوالہ ابن ماجہ و ابی داؤد باب من یعول یتیم۔

۴۔ صحیح بخاری باب عمرۃ القضا۔

۵۔ بوداؤد باب مواضع قسم النفس۔

۶۔ موطا امام مالک کتاب زکوٰۃ و زکوٰۃ اموال الیثمی و زکوٰۃ الحلی و کتاب المطلاق۔

۷۔ مسند احمد جلد ۶ ص ۲۶۹۔

۸۔ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی و مسند جلد ۶ ص ۳۲۔

۹۔ ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیم۔

۱۰۔ استیعاب ابن عبد البر تذکرۃ ابوالوحد اح۔

کی دادرسی کی 'عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے ان کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے جائیدادیں وقف کیں اور دنیا میں ایک نئے ادارے کی طرح ڈالی اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی و سرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں ان کی جائیدادوں کی نگرانی ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے اور لندن کے لارڈ میریا آفس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔



۱۔ تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔

۲۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی له (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔ قاضیوں کو جو شاہی فرائض تقرر کے وقت ملتے تھے ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

بیوہ کے ساتھ حسن سلوک

قیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنسِ لطیف کے ان افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے اب وہ بے یار و مددگار اور بے مونس و غمخوار ہیں نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ ان کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے عورت جس کو اللہ نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی اب وہ ناچار ان سے دوچار ہے اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعات کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کر سکا ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہئے اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزار دے عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریادیں ہوئی اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور صرف اتنی مدت تک کے لیے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی صلہ تو نہیں اس کے لیے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی اور اس کا نام عدت رکھا یعنی ”شمار کے دن“ اس مدت کے گزر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دے دی اس کا دین مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اول ضروری ٹھہرایا پھر اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلویا عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع و قمع کر دیا اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہو گئی ہے وہ اس کو پھر عطا کیا جائے قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا۔

﴿وَأَنكِحُوا الْيَامَىٰ مِنْكُمْ﴾ (نور)

اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت نے اس یکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور میں اس وقت جب ایک نو جوان کے تمام دو لے برا بیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نو جوان سے نو جوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً عورتوں سے نکاح کئے جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینبؓ، ام المہکینؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔

یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا با آسانی کر سکتا ہے فرمایا۔

﴿الشَّاعِي عَلَى الْارْمَلَةِ وَالْمَسْكِينِ كَالشَّاعِي فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاحْسِبْهُ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا يَفْطُرُ وَكَالصَائِمِ لَا يَفْطُرُ﴾

بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا اللہ کی راہ میں دوڑنے والا (اور راوی کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

﴿الشَّاعِي عَلَى الْارْمَلَةِ وَالْمَسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَكَالَّذِي يَصُومُ السَّهَارَ وَبِقَوْمِ اللَّيْلِ﴾ (کتاب الادب)

بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اللہ کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں یہ فرمایا ”میں اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے

صحیح بخاری و صحیح مسلم موطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ باب الشفقة والرحمة علی الخلق۔

رہے یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا مرجائیں۔^۱ اسی مقصد کو ابو یعلیٰ کی مسند میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ ”قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے میں پوچھوں گا تو کون ہے تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے۔“^۲



۱۔ سنن ابوداؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیمًا۔

۲۔ حاشیہ سنن ابی داؤد تفسیر ابی الحسنات محمد بن عبدالقادر ابن نور الدین پنجابی مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے اس لیے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے۔

﴿فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (ذاریات۔ ۱)

اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔

﴿فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّقْضُومٌ، لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (معارج۔ ۱)

اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف ”بھیک منگے“ کے لینا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی مالی مدد کا خواستگار ہو محروم کی تشریح میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے بعض اس کو محروم کہتے ہیں جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو کوئی حشمت کے معنی لیتا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو اسی معنی کی تائید اہل لغت اور بعض اہل تفسیر کے بیان اور قرآن پاک سے ہوتی ہے۔ ۱

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے یا عام صدقہ مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق ”حق“ کا بیان ہے مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق ”حق“ کا نہیں بلکہ ”مقررہ حق“ کا بیان ہے ”زکوٰۃ“ مراد ہو کیونکہ ”مقررہ حق“ کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے۔

﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (ضحیٰ۔ ۱)

اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکانہ کر۔

یہاں ”سوال کرنے والے“ کے معنی اغنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں

۱ دیکھو لسان العرب لفظ محروم الحارف اور تفسیر ابن جریر میں سورہ ذاریات و معارج کی آیت مذکورہ اور سورہ قلم میں اصحاب الجنہ

کے فتنہ میں محرومون اور سورہ واقعہ میں مل نحن محرومون کے معنی۔

مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواست گار ہو خواہ وہ جسمانی ہو مالی ہو بھی ہو۔ ! یہاں تک کہ کوئی ننگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿مَنْ يَشْمَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْمَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْبِلًا﴾ (نساء ۱۱)

جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طوقر قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا ایسا ہی برے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہوتا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (۱۰۰ سورہ آل عمران ۲۰)

اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور اللہ سے بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہئے آنحضرت ﷺ نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

﴿مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَحِيهِ كُنْ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ﴾ اس طرح عن مسلمہ کربہ فرج اللہ عنہ کربہ من کرمات يوم القيامة ﴿﴾ (صحیحین)

جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا۔

﴿وَاللَّهُ فِي عَوْنِ عَمَدِهِ مَا كَانَ الْعَدُوُّ فِي عَوْنِ أَحِيهِ﴾ (ترمذی ۲۰۰۰، ابی داؤد ۲۰۰۰، ترمذی ۲۰۰۰)

طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے وہاں سے سنو کہ دی حاجت فلا سہر مجھڑی نے کشف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد ظالمین لیا ہے۔

اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔
 صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صی بہ سے فرماتے کہ
 تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔^۱ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر تمہیں اور نہ ہو سکتے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا
 کرو۔^۲ یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔^۳ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص
 راستہ چلتے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا
 ہے۔^۴



۱ صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المؤمنین و باب قول اللہ من شفع شفاعة حسنة۔

۲ ایضاً باب کل معروف صدقہ۔

۳ ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

۴ ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے بیماروں اور مریضوں کا ہے یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال خدمت غمخواری اور تیمارداری بھی انہیں نیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں ”عبادت“ ہے۔ لے ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے ان کو یک قسم معاف یا مکر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لیے ایک کلی اصول بنا دیا ہے۔

﴿وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾ (نور-۸)

اور نہ بیمار پر کوئی سختی ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾ (نور-۱۲)

نہ اندھے پر سختی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) نہ ننگڑے پر اور نہ بیمار پر۔

﴿لَيْسَ عَلَى الضَّعْفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى﴾ (توبہ-۱۲)

نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے، وان ٹخنہ مرضی (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) (مائدہ ۲) اسی طرح ان سے تہجد کی بھی نمازیں معاف ہیں، علیہ ان سسکون منکم مرضی (اللہ کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) (مزل ۲) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی، فمن كان مريضاً (تو تم میں جو بیمار ہو) (بقرہ ۲۳) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو سیت کر عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ مریض کے معنی صرف بیمار پر ہی ہے جس میں کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا نہیں، مگر یہاں بیماری کی عیادت کے معنی بیمار پر ہی ہے بھی ہیں اور اس کی تیمارداری و خدمت گزاری کے بھی ہیں۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معنوں میں سے ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی تیمارداری کرے اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی تیمارداری و خدمت گزاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو حج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے۔

مما شحالك وفامت العواد

ذهب الرفاد فما بحمس رقاد

تجھے جو غم پہنچا اس سے خیند چلی گئی تو خیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی راتیں ٹٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے ورنہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مرجاتا ہے تو پھر ان پر میند گزاری ہوتی ہے ورنہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر ”عیادت“ کے معنی صرف بیمار پر ہی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ”عیادت“ انہیں خدمت گزاری اور تیمارداری سے ہے بیمار پر ہی تک سارے مہارت داخل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کو دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب تھا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا۔

نماز کی رخصت دی گئی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیئے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہئے۔

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنا

دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے۔^۱

آنحضرت نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے اس کے آداب تعلیم کئے ہیں اس کی دعا میں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا اللہ اس کے غم کو ہلکا کرے گا اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرنے کے لیے صبح کے پہلے کہتے ہیں کہ حضور نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے۔^۲ ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہ الہی میں دعا کرتے ہیں^۳ یہ بھی آیا ہے کہ جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ وہاں تک کہ وہ جنت کے میوے چننا رہتا ہے۔^۴ فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور داس دے اور اس کو شفا پانے کے لیے اللہ سے دعا کرے۔^۵ آنحضرت اور آپ کی تعلیم سے صبح کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی آپ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے۔^۶ منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں^۷ اور اسی سے عمار نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔^۸

۱۔ صحیح مسلم باب ثواب المؤمن فیما یصبہ و سنن ابی داؤد و اوائل کتاب الجنائز۔

۲۔ ابو داؤد کتاب الادب فی المعویۃ للمسلم۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔

۶۔ صحیح مسلم باب عیادۃ المریض بطریق مختلفہ۔

۷۔ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔

۸۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ مجمع البحار علامہ طاہر فتی لفظ عیادۃ۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپؐ نے ان کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تا کہ بار بار ان کی عیادت کی جاسکے۔ ۱۔ رفیدہؓ ایک صبیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں ان کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا تا کہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں۔ ۲۔ غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی یہمیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ ۳۔ آپؐ نے اپنے پیروؤں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ ”بھوکے کو کھلاؤ“ قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو“ ۴۔

ایک دفعہ آنحضرتؐ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ ”اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی“ وہ کہے گا ”اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا پروردگار ہے میں تیری عیادت کیونکر کرتا“ فرمائے گا ”کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی“ اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ ۵۔ تعلیم کی یہ طرز ادا بیمار پرستی بیماروں کی تیمارداری اور غمخواری کی کیسی دشمن تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرھانے کھڑا اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ان بیماروں کی خدمت کر کے اللہ کا قرب پاتے ہیں۔



۱۔ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز

۲۔ سیرۃ ابن ہشام غزوہ بنی قریظہ و ادب المفرد بنی باب کیف السمک و اصحاب ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھئے۔

۳۔ صحیح مسلم غزوہ النساء۔

۴۔ مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۴۔

۵۔ صحیح مسلم باب فضل عیادۃ الریض۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے۔ ہم کو ان کی تاریخ و نسب سے معلوم ہے کہ یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے۔ یعنی خود بادشاہ بن کر ہمیشہ راحت و آسائش اور حکومت و شہنشاہی کے کام کئے اور مفتوح افراد سے کان کنی کا شکار کیا اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام سے ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں۔ مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی۔ رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے اور عربوں میں بھی ان کے ساتھ یہی برتاؤ تھا۔ بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم و بے قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تحت مشق تھا۔ کیوں کہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی۔ چنانچہ غلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔

اسلام زیر دستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا۔ نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جس معاہدہ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیر دستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے۔ اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنینہوں نے لبیک کہا۔ چنانچہ زید بن حارثہ، خباب بن الارت، بلال حبشی، یاسر الحبشی، عمار، صہیب رومی، ابو طلحہ، عامر بن فہیرہ و رسالہ غلاموں میں، اور لبنہ، زبیرہ، نہدیہ، ام عیسیٰ اور سمیہ وندویوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں اور زید بن حارثہ کے سوا جو آنحضرت ﷺ کے سایہ میں پرورش پڑے تھے سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت ٹریاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جز بنایا تھا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا۔ سورہ بقرہ میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو ”گھائی“ بتایا گیا ہے ان میں ایک عت رفقہ۔ گردن سے غلامی کی رسی کھولنا بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہ، حضرت ابو بکر اور دوسرے اہل ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

مدینہ آ کر اس تحریک نے اور فروغ پایا۔ تحریر رفقہ۔ یعنی گردن کو آزاد کرنا بہت سی فروگذاشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا۔ صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا چھوٹ چھوٹ ہو گئی۔ حضرت حکیم بن حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں اسلام کے بعد سو غلام آزاد کئے۔ حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ ۱۔ شرک کی

۱۔ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

۲۔ جلد دوم کتاب الآداب باب المعرقہ۔

۳۔ یہ دونوں تعدادیں امیر سمائل نے شرح بوخاریہ کتاب العقیق میں نقل کی ہیں۔

ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے ان بندوں میں سرفہرست جن لوگوں کے نام ہیں ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے فرمایا

﴿وَاَعْلُوْا لِلّٰهِ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا وَالَّذِيْنَ اٰخَسَانَا وَاٰدَى الْقُرْبَى وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسْكِيْنَ وَالْحَارِ دِی الْقُرْبٰی وَالْحَارِ الْحَبِی وَالصّٰحِبِ بِالْحَبِی وَاٰسِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾ (نساء-۶۱)

اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے رفیق کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فحاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی آنحضرت نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو عبد نہ کہے بلکہ فتائی میرا جوان کہے اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں بلکہ مولیٰ کہیں۔^۱ اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا اور فرمایا کہ یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے پس جس کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دے دو جو اس پر بھاری ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔^۲

حضور کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی۔^۳ ان بے خانم افراد کو ان کے آقاؤں کے گھر وں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا کر رکھا کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے علقہ مندوں (موالی) میں شمار ہوگا۔^۴ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں۔^۵ ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے جس کی تفصیل آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

۱ صحیح بخاری کتاب العتق۔

۲ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الاداب باب ما یمنی عن السباب۔

۳ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الاداب باب ما یمنی عن السباب۔

۴ حدیث میں ہے انما الولد لمن احق والہ کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔ دوسری حدیث میں آتی ان غیر موالیہ فعلیہ لعنہ اللہ

الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت انا منووی شرع میں لکھتے ہیں اس سے حصہ کس حصہ سے یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولہ کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے (صحیح مسلم کتاب العتق)۔

۵ کتاب الاموال ابی عبیدہ قاسم بن سلام التوفی ۲۲۳ھ مطبوعہ مصر ص ۲۳۵۔

(۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے اسی ہے حضرت ابراہیمؑ نے ایک مونا تازہ پھڑا

ذبح کیا۔

(۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہئے ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہئے اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے

ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے۔

(۷) مہمانوں کے کھانے سے سرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہئے کیوں کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ

کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے تاکہ وہ کھانا

ان کے اور ان کے اہل و عیال کے کام آئے اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیمؑ نے اس کو

نا پسند کیا اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں غذر کرنا چاہئے اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں

کھاتے تو آپ کو خوفزدہ نہ ہونا چاہئے کیوں کہ ہم لوگ کھاپی نہیں سکتے بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی

بشارت دینے آئے ہیں۔

سورہ حجر میں حضرت لوطؑ کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسائش

کے ساتھ میزبان مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے اس لیے کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو

میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیوں کہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے اسی لیے

جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوطؑ نے کہا۔

﴿قَالَ اِنَّ هٰؤُلَاءِ صٰٓئِفٰی فَلَا تُفٰصِحُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّكُمْ لَعٰیۤرٌ وَّ نٰجِرٌ ۝۵﴾ (۵۔ ۶)

کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فصحیت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے لیکن رسول اللہ نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر

اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا اور فرمایا کہ ”جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے

کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ

عزت کے ساتھ دے۔“ کہا گیا کہ یا رسول اللہ! اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ”ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تمہیں دن

کی ہے اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا۔“ نیز فرمایا کہ ”جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ

اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو

جوڑے رکھے۔“ ۱

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا مجھے یہ خبر ملی ہے

کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو انھوں نے کہا بے شک فرمایا ایسا نہ کرو نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی روزہ

۱ بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ

۲ بخاری کتاب الادب باب ابرام الضیف وخدمتہ یا مفسدہ وقلہ تعالیٰ ضیف ابراہیم لکنز میں۔

بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے تمہاری آنکھ کا حق ہے تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے۔ ۱۔ ایک حدیث میں ہے کہ ”ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے چاہے وہ لے لے چاہے چھوڑ دے۔“ ۲۔

چونکہ کہیں مہمان ہوتا میزبان کے لیے بہر حال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے چنانچہ احادیث میں تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے ہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے کیوں کہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا۔ ۳۔ اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی جس کو خود غیور اور خود دار مہمان پسند نہ کرے گا۔



۱۔ بخاری کتاب الادب باب حق الضیف۔

۲۔ ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔

۳۔ بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف و خدمتہ ایاہ و نفعہ۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیا سا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا ایک ایک خون کا بدلہ کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا جس نے مدت کے پھڑوں کو ملا دیا دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی و قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھل دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُوا إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ. وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ (آل عمران-۱۱)

اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ تم مرو لیکن مسلمان اور اللہ کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم مل کر ایک نہیں کر سکتا تھا۔

﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (انفال-۸)

اور اللہ نے مسلمانوں کے دل ملا دیئے اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا لیکن اللہ نے ملا دیا بیشک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا ہے اور مصلحت جاننے والا ہے۔

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں اور سب مل کر اللہ کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں کیوں کہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں فرمایا۔

﴿وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَسَارِعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ (انفال-۶)

اور اللہ اور رسول کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہوگا تو) ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

یہی باہمی اتفاق و اتحاد ملت اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آ جائے تو اس

کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں اللہ و رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں۔

﴿فَإِنْ تَدْرَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ (ساءہ۔ ۸)

تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے

لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدس و انصاف سے ان میں صلح کرادیں۔

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى

فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (انما المؤمنون إخوانه فاصلحوا بَيْنَ اِخْوَانِكُمْ) (حجرات۔ ۱)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے سے ٹرؤ

یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو تو اگر وہ رجوع کرے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف

کرؤ اللہ مفسدوں کو دوست رکھتا ہے مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرادو۔

آیت کے اخیر لکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی

نہیں کٹتا انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿أَنْصُرُ اِذَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُومًا﴾ (بخاری مظالم)

تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر

کی جائے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو جس وقت اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور شریعت اسلامی

کو قبول کیا دفعۃً ہمارا مذہب ہی بھائی ہو گیا اللہ نے فرمایا۔

﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ﴾ (توبہ۔ ۲)

تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے مذہب ہی بھائی ہیں۔

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا اگر اس کے باپ کا نام و نسب

نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے فرمایا۔

﴿فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ﴾ (احزاب۔ ۱)

تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے

جذبہ رحم کی تحریک فرماتا ہے۔

﴿فَمَنْ عَفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ﴾ (بقرہ۔ ۲۴)

تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے کیونکہ

﴿أَيُّحُثُّ أَخَذُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَحِبِّهِ مَيْتًا﴾ (جرات-۲)

کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

تیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا متولیوں کا فرض ہے اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے کنبہ کا جز بنالیں اور ملا جلا کر خرچ کریں تو یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں جن کی خیر خواہی ان کا فرض ہے فرمایا:

﴿وَإِنْ تَحَالَطُواهُمْ فَأَخَوَانُكُمْ﴾ (بقرہ-۲۷)

اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں وہ

یوں کہتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِأَخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾ (ح-۱)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے، معاف کر۔

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے جس کے دور کرنے کے لیے

اللہ سے گڑگڑا کرو عا مانگنی چاہئے اور کہنا چاہئے۔

﴿وَلَا تَحْجَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (ش-۱)

اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے۔

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں اللہ نے مدح

فرمائی۔

﴿رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (فتح-۸)

وہ (مسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں۔

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

﴿أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (مائدہ)

مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت و محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ نے اپنی زبان فیض

ترجمان سے یوں فرمائی ہے ”مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی

طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے

ہیں۔^۱ صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا ”سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔“^۲ مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں اگر کوئی تکلیف ہو یا دکھ درد ہو تو سارے اعضاء اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہئے۔ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہئے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے“^۳ بخاری میں ہے کہ یہ بہرہ کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے اس تمثیل میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابلِ تخریب حصن و حصار بنتی جاتی ہے اسی طرح جماعت اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملے ہوئی ہے جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھٹک جائے گی تو پوری دیوار وحم سے زمین پر آ جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرنے نہ اس کو سب مدم چھوڑنے اور نہ اس کی تحقیر کرے..... انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرنے مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے اس کا خون اس کا مال اور اسکی آبرو۔“^۴ صحیح مسلم کی روایت ہے ابو داؤد میں سے کہ فرمایا ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو وہ نہ اس پر ظلم کرنے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرنے جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔“^۵

ابو داؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا ”جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔“^۶

فرمایا ”مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں“^۷ صحیح بخاری کی ایک روایت میں

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۳ کتاب الادب صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹ کتاب البر والصلة والآداب مصر۔

۲۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹ مصر کتاب البر والصلة والآداب۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۹۰ صحیح مسلم کتاب البر والصلة والآداب ج ۲ صفحہ ۳۸۹ مصر۔

۴۔ صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۸۲ مصر۔

۵۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۳ ص ۱۹۰۔

۶۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۳۔

۷۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۔

ہے دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے اچھا مسلمان کون ہے فرمایا "جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔" ۱۔ یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریر بن عبد اللہ بکلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ سے تین باتوں پر بیعت کی نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔" ۲۔ کئی روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا اللہ کی نافرمانی (فسوق) ہے اور اس سے لڑنا (قتل) اللہ کا انکار (کفر) ہے" ۳۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ اللہ کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں اللہ کا انکار ہی ہے چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا دی رکھی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے فرمایا "کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے" ۴۔ آیہ کہ نسطی سے ایسا ہو جائے۔

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَبَدًا فِيهَا وَعَصَبُ النَّارِ عَلَيْهِ وَلَعْنَةُ وَعَدْلُهُ عَذَابًا عَظِيمًا﴾ (ساء-۱۳)

اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے وہ اس میں پڑا رہے گا اور اللہ اس پر خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔

حجۃ اوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا پھر فرمایا "دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔" ۵۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ "جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔" ۶۔ جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گنہ ہے فرمایا "سب سے بڑا یا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔" ۷۔ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے شخص میں گرفتار ہو جس میں اسکی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے ارشاد ہوا "جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑ دے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو تو اللہ بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو اللہ بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔" ۸۔

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت ﷺ نے تین روز سے

۱۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶، صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱

۲۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳

۳۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲ ج ۲ ص ۸۹۳

۴۔ صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳

۵۔ صحیح بخاری کتاب اللہیات ج ۲ ص ۱۵۰ کتاب الفتن ج ۲ ص ۱۰۳۰

۶۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۸۹

۷۔ ایضاً۔

زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ ”کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتداء کرے۔“^۱ ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ”آپس میں کینہ نہ رکھو حسد نہ کرو اور ایک دوسرے کو پیٹنے پیچھے برائے کہو“ اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ہلن چلن چھوڑ دے۔“^۲ ایک مسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہار اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَىٰ إِلَيْكُمْ السَّلَامَ نُسْتَمِينَا﴾ (نساء: ۹۳)

اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا۔ اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا مگر اس پر بھی ان صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی آپ نے ان کو ہار کر دریافت کیا انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا آپ نے اس میںغ انداز میں فرمایا ”تم اس کے لا الہ الا اللہ کے ساتھ کیا کر دے۔“ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا ”کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا۔“^۳

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ”مومن کو اجازت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔“^۴ اے یہ بھی فرمایا کہ ”جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا۔“^۵ یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔ جان ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے ارشاد ہوا کہ ”جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو اللہ اس کے لیے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔“^۶

فرمایا ”ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں سلام کا جواب دینا اس کے چھینکنے پر اللہ تم پر رحمت کرے کہنا اس کی دعوت کو قبول کرنا بیمار ہو تو عیادت کرنا اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا۔“^۷ یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے ارشاد ہوا کہ ”جب کوئی مسلمان

۱۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۹۲۱ و سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۹۶۔

۳۔ پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقت اور کتاب لدیات میں ہے دوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح

حدیث مذکور۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲۔

۵۔ ایضاً ص ۹۰۱ صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۳۳ مصر۔

۶۔ صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۵ مصر۔

اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے۔“ ۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ ”جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے تو اس کو ثواب کی دورتی (قیراط) ملتی ہے جن میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ برابر ہوگی۔“ ۲۔ یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا اس برادرانہ الفت و محبت کے فروغ میں جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا اسی لیے آنحضرتؐ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔“ ۳۔ الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے ابو داؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔“ ۴۔ دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شگستہ نہ رہیں جیسی آج ہیں ہر جماعت انہیں اصولوں پر دنیا میں بنی ہے اور آئندہ بھی بنے گی۔



۱۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۲۰۱۔

۲۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۴ کتاب ابرو الصلۃ۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقہ-۱)

اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے اس لیے ارشاد ہوا۔

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ ۤأَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ (مائدہ-۲)

اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے یہ آیت پاک انسان کے اسی مادہ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے۔

ابو ہریرہؓ اور انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحْسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا ۚ وَكُفُّوا عَنَّا ۚ اَللّٰهُ اَعْلَمُ﴾ (بخاری-۳)

آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن جاؤ۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں۔

﴿لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحْسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا ۚ وَكُفُّوا عَمَّا اَلٰهُمَّ اٰخِوَانًا﴾ (بخاری)

ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو نہ ایک دوسرے پر حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھيرو اور اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے

بھری ہوئی دنیا دفعۃً جنت بن جائے فرمایا۔

﴿مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يَرْحَمْ﴾ (بخاری)

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ رحم نہیں کرتا یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ”تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا“۔^۱ یہ حدیث رحمۃ للعالمین کی تعلیم کی شان رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ”جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا“۔ (بخاری) اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب دیا صحابہؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول کہ کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے فرمایا ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے۔^۲ (بخاری) اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ذرؓ سے ارشاد فرمایا ”جہاں بھی ہو اللہ کا خیال رکھو ہرائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو منادو گے اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ“۔ (باب ما جاء فی معاشرۃ الناس صفحہ ۳۳۱) ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور نے پانچ باتیں گنائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ﴿وَاحْتِ لِلنَّاسِ مَآئِئَةَ لَفْسَتْ﴾ یعنی تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔^۳ اللہ کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہا ہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ”تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو“۔ بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی تو رات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ”تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو“۔ اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہئے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ و خیرات کے باب میں گو فقراء اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڑھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی

۱ سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲ تیسرے فقرہ کے مطلب میں شرحین کا اختلاف ہے۔

۲ مستدرک حاکم کتاب ابواب الصلۃ ج ۳ ص ۱۵۹۔

۳ یہ حدیث صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب میں ہیں۔

ضرورت پوری کرنے اور اپنی عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں، حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اس کو بچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوا یا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو اللہ کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں قرآن میں صدقہ کی اجازت فقراء اور مساکین کے لیے ہے، فقراء تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب میں ہیں ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔^۱

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں، آنحضرت نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا، ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن نے ۲ "اسیر" کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے ابو یسرہ اور عمرو بن میمون اور عمرو بن شریبل صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا،^۳ اور خود حضور نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی۔^۴ تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلاف کی بناء پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری۔^۵

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ هُدُوءٌ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُفْقُوا مِنْ حَيْرٍ فَلَا نَفْسُكُمْ﴾

(بقرہ-۳۷)

ان کو راہ پر لے آتا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے اور جو بھلائی سے خرچ کرو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہر حال ملے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا

﴿لَا يَأْمُرُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا يَحِبُّ لِنَفْسِهِ وَحَتَّى يَحِبَّ الْمَرْءُ لَا يَحِبُّ إِلَّا

اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ﴾ (جد ۳ ص ۲۷۲)

تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف اللہ کے لیے پیار نہ کرے۔

اس حدیث میں محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

۱۔ ترمذی ابواب الزہد غریب۔

۲۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۲ معمر۔

۳۔ سورہ دہر۔

۴۔ کتاب الاموال امام ابو عبیدہ صفحہ ۶۱۳، ۶۱۴ معمر بخاری کتاب الجمعہ۔

۵۔ مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقرین۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر مرادیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھا جاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا جو رک جاتا وہ ہار جاتا یہ سب جانور دوست و احباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مرجاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے بلکہ ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے اسی طرح بچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گزر رہا تو وہ لوگ بھاگ گئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسول اللہ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے سلسلے سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے گوبان اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے رسول اللہ نے مدینہ میں آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے بلکہ یہ ایک خاص صورت تھی لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔

بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا ۱۰ ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو اللہ اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے ۱۱ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارتا جائز نہیں سُنن نسائی

۱۔ طبری۔

۲۔ ترمذی ابواب الصيد باب ما جاء فی کرہۃ اکل المصورۃ ص ۲۵۵۔

۳۔ بخاری کتاب الذبائح والصيد باب ما یکرہ من المثلۃ و المصورۃ والجمۃ۔

۴۔ ترمذی ابواب الصيد باب ما جاء ما قطع من الی فیہ میت۔

۵۔ بخاری کتاب الذبائح والصيد باب ما یکرہ من المثلۃ و المصورۃ والجمۃ۔

۶۔ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۴۴۔

میں ہے کہ ”جو شخص کنجشک کو بلا ضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن اللہ کے یہاں فریاد کرے گی کہ فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا“۔ جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے ان کا مارنا بھی جائز نہیں چنانچہ آپ نے خاص طور پر حیوانی شہد کی مکھی ہڈ بد اور مرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔^۱ جو جانور ضرورہ مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ تم پر رحم کرے گا“۔^۲ یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی“۔^۳ کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے کنکر پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے“۔^۴ مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے اس لیے رسول اللہ نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی نہ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی ہوئی مر گئی“۔^۵ بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں اس لیے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گنہگار ہیں چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بد سلوکیاں کرتے ہو اگر اللہ ان کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے۔ ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین میں یاد رخت پر حیوانیوں کا سوراخ تھا یہ دیکھ کر آپ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ یہ میں نے کیا ہے آپ نے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ“۔^۶ (غرض یہ تھی کہ ان حیوانیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل نہ جائیں)

- ۱۔ مشکوٰۃ کتاب الصيد والذبايح صفحہ ۲۵۰۔
- ۲۔ نسائی کتاب النحی یا صفحہ ۶۷۹۔
- ۳۔ مشکوٰۃ کتاب الصيد والذبايح صفحہ ۳۶۶۔
- ۴۔ مسلم کتاب الصيد والذبايح باب الامر باحسان الذبح والقتل وحده يده المضرۃ۔
- ۵۔ مسند ابن فضال صفحہ ۳۳۶۔
- ۶۔ نسائی صفحہ ۶۷۳ بخاری کتاب الذبايح والصيد باب المخذف والبيدۃ۔
- ۷۔ بخاری کتاب النبی صفحہ ۳۹۵۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چوٹی نے کاٹ لیا انھوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا پھر تمام چوٹیوں کو آگ سے جلادیا اس پر اللہ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چوٹی کو کیوں نہیں جلایا۔ یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چوٹی تھی جس نے کاٹا تھا تمام چوٹیوں کا قصور نہ تھا ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی رسول اللہ قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے واپس آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے اس کے بچوں کو چھوڑ دو صحابہ کرام نے چوٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلادیا تھا دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے اسی عدم واقفیت کی بناء پر ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں ان پر بھولے بسکے اونٹ بھی آ جاتے ہیں اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیا سے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔^۱

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کچڑ چاٹ رہا ہے اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا اللہ کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور اللہ نے اس کو بخش دیا صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے^۲ صرف جانداروں ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چرایا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے۔^۳ اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے یعنی

(۱) جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہئے چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں^۴ نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ اللہ نے ان کو تمہارا فرمان بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے تمہارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے اپنی ضرورتیں اسی

۱۔ مسند ابن فضال جلد ۶ صفحہ ۴۴۱۔

۲۔ مسند ابن فضال ج ۱ ص ۲۹۶ عن عبد اللہ بن مسعود۔

۳۔ بخاری جلد اول کتاب الخلق صفحہ ۴۶۷۔

۴۔ ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء۔

پر پوری کر ڈالے اگرچہ رسول اللہ نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہئے۔

(۲) جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہئے چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچو اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو ان کو تیزی کے ساتھ چلاؤ تاکہ قحط کی وجہ سے ان کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔

ایک بار آپ نے ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ کو دیکھ کر بلبلا یا اور آب دیدہ ہو گیا آپ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ میرا یا رسول اللہ! فرمایا اس جانور کے بارے میں جس کا اللہ نے تم کو مالک بنایا ہے اللہ سے نہیں ڈرتے اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔

(۳) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔

(۴) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔



۱ بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والمہائم۔

۲ بخاری ابواب الحرث والمز ارعہ باب فضل الزرع والغرس اذ کل منہ۔

۳ بخاری ابواب الحرث والمز ارعہ باب استعمال البقر لحرث۔

۴ مسند کتاب الامارۃ باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطريق۔

۵ ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب والمہائم۔

فضائل اخلاق

اخلاق حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک امہات اخلاق اور دوسری فروع اخلاق، امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوت علمی، قوت شہوانیہ، قوت غصبیہ، قوت علمی کے اعتدال کا نام حکمت، قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوت غصبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے اور انہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلاف مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیم محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہئے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیش نظر اخلاق کی عمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے، کیونکہ اس کا منشاء انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں، بلکہ انسان کو فضائل اخلاق کا عامل بنانا اور رذائل اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لیے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اپنی تعلیم میں اس نے اہل فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور ہر وہ کام برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلق اللہ کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بناء پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں، وہ اخلاق جن کو اللہ پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے رذائل ہیں، ہم نے اوپر ”اخلاق اور محبت الہی“ کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو اللہ پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں جا بجا ان کی تصریح ہے، لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہئے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتاب الہی اور پیام نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور و فکر کرنے والوں میں اس

بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست:

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشائش کا وعدہ فرمایا ہے قرآن پاک اور احادیث نبوی میں جابجا ان کی تفصیل ہے جیسے

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ أَلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَنَعَتْ أَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنْ أَتَعَىٰ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (مومن۔)

ایمان والے مراد کو پہنچ گئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں جو بیکار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے کہ ان پر کوئی الزام نہیں تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں یہی اصلی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں: نیکی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاکدامنی، امانت داری اور ایقانے عہد ایک دوسری جگہ ہے۔

﴿وَلِكُلِّ الْبَرِّ مَنَ أَمْنٌ بِاللَّهِ وَالْيَوْمَ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةُ وَالْكَتَبُ وَالسَّيِّئِينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ۝ دَوَّ الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۝ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۝ وَالصَّابِرِينَ فِي النَّسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ﴾ (آۃ ۲۳۔۲۴)

اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی اور اپنے قول کو جب انھوں نے اقرار کر لیا پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے بل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں: سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا، اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔ سورہ آل عمران میں ہے۔

﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَنِتَّةِينَ وَالْمُنْفِقِينَ﴾ (آل عمران۔ ۱۳)

ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے والے اور (اللہ کی) فرماں برداری کرنے والے اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو اللہ کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاطِبِينَ الْعَبْطَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران-۳: ۱۳۴)

جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (اللہ کے نام) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیک کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، غفور و گذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے سورہ معارج میں ہے۔

﴿وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ، لِّلنَّاسِ لِّلْمَحْرُومِ، وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بَيِّتِ الدِّينِ، وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ، إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ، وَالَّذِينَ هُمْ لِمَنْزِلِهِمْ حَفِظُونَ، إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ، فَمَنْ أَتَىٰ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَدُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ لِأَعْتَابِهِمْ رَاعُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ﴾ (معارج-۱)

اور جن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شبہ ان کے رب کا عذاب نذر ہونے کی چیز نہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

ان آیتوں میں سخاوت، نفس، عفت و عصمت، امانت داری، ایقائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔

سورہ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشائش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے۔

﴿وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّابِئِينَ وَالصَّابِئَاتِ وَالْخَفِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْخَفِظَاتِ﴾ (احزاب-۵)

اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں، صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عجزی کرنے والے اور عجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔

ان میں سچائی، صبر، عجزی اور عصمت و عفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورہ فرقان میں اللہ کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے۔

(۱) ﴿وَعَسَاؤُ الرُّحُصِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هُونَ، وَإِذَا حَاطَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ (ن-۶)

(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہو لے چلتے ہیں اور جاہل جب ان سے (جہالت کی) باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت رہیے۔

(۲) ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾
(۲) اور جب وہ خرچ کریں تو نہ توفضل خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔

﴿وَلَا يَفْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ﴾
اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾
اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جائیں۔

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی اور تیسری میں عدم ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت و سنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے سورہ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبی میں کام آئیں گی۔

﴿الَّذِينَ يُؤْفُونَ عَهْدَ اللَّهِ وَلَا يَقْضُونَ الْبَيْعَ، وَالَّذِينَ يَصْنَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَحْفَظُونَ سُوءَ الْحِسَابِ، وَالَّذِينَ صَرُّوا انْتِعَاءَ وَخَهُ رَبِّهِمْ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَالْعَقْبُ مِمَّا رَفَعْنَاهُمْ سُرًّا وَعِلَاقِيَّةً وَيَدْرُءُونَ الْحَسَةَ الشَّيْئَةَ أُولَئِكَ نَفَعْنَاهُمْ غَفْصَ الدَّارِ﴾ (ن-۲۰، ۲۱)

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں اور جس کے جوڑنے کو اللہ نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سبے رہتے ہیں اور جنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں انہی کے لئے پچھلا گھر ہے۔

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے اللہ سے کرتا ہے اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے جو اللہ کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے اور جس کے جوڑنے کا حکم ملتا ہے وہ اہل قرابت اور حقداروں کے حقوق ہیں ان دو کے سوا ان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں۔

﴿لَنْتَلِسَ الدَّارُ الْآخِرَةَ نَجْعُهَا لِمَدِينٍ لَا يُرِيدُونَ غِنًى فِي الْأَرْضِ وَلَا فُسَادًا وَالْعَاقَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (قصص-۲۸، ۲۹)

اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے اور آخر انجام پر ہیزگاروں کے

یہ ہے۔

یعنی غرور نخوت نہیں کرتے۔

﴿وَالَّذِينَ يَحْتَبِئُونَ كِبَارَ الْإِلَهِمَّ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا عَصَوْا هُمْ يَعْمُرُونَ﴾ (شری۔ ۴۰)
اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔
یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (ہـ ۶۰)

بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہئے کہ وہ اللہ کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (بقرہ۔ ۲۳)

بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گزر چکی ہے اور آگے بھی اپنی

اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے۔ اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آ جاتی ہیں۔ انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ اسی کا نام صدق یا سچائی ہے جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں ان میں سے جس ایک کو فرمائیے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں ارشاد یہ ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا جب رات زیادہ گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ چھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کنٹھیں گے اور نہیں کرتا تو بد عہدی ہوتی ہے اس خیال سے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔ صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھٹ گئیں یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسرور ہوئے۔

یہ روایت سند کی رو سے کتنی ہی کمزور ہو مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے جو سچا ہو گا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل میں نفاق نہ ہو گا، پیچھے چھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا جو کہے گا کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔

صدق صفات ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں اللہ آپ فرماتا ہے۔

﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا﴾ (نساء)

اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا ہے۔

! اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورہ ان میں کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا اخذ نہیں معلوم ہوا۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا﴾ (نہ-۱۸)

وعدہ کیا اللہ نے سچ اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔

اللہ سچا ہے اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے فرمایا۔

﴿وَأَنَا لَصَادِقُونَ﴾ (انعام-۱۸)

اور ہم ہیں سچے۔

﴿قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ (آل عمران-۱)

کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو

﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (زمر-۲۳)

اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیزگار ہیں۔

اس آخری آیت میں ”سچائی“ سے مراد اللہ کی شریعت یا کتاب ہے۔ مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے اس

سے معصوم ہوا کہ پرہیزگاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو

پکار اٹھتے ہیں۔

﴿وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (احزاب-۳)

اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔

چونکہ رسول اللہ سے علم پاتے ہیں اس لیے وہ بھی سچے ہوتے ہیں۔

﴿وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ﴾ (یسین-۴)

اور پیغمبروں نے سچ کہا۔

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے کیوں کہ ان کی ساری باتیں دعویٰ

دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیغمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے

اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت

ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكُتُبِ إِبْرَاهِيمَ - إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ (مریم-۴۷)

اور کتاب میں ابراہیمؑ کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نازد کیا ہے۔

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكُتُبِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ (مریم-۴۷)

اور کتاب میں ادریسؑ کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

حضرت مریمؑ جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ، سچے بننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا اس وصف سے ممتاز ہوئیں فرمایا گیا۔

﴿وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ﴾ (۱۔ مدہ۔ ۱)

اور ان (یعنی) کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے

﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ (یوسف۔ ۶)

یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسماعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تو اللہ سے صادق الوعد (وعدہ کا

سچا) خطاب پایا۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا﴾ (مریم۔ ۳)

اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔

اللہ کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو مے گی ان میں وہ بھی ہوں گے جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ

سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے۔

﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ﴾ (آل عمران۔ ۲)

صبر کرنے والے اور سچے۔

اللہ نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہیں ان میں اسلام و ایمان اور اللہ کی

فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ بچوں اور راست بازوں کا ہے فرمایا۔

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَبِيحِينَ وَالْقَبِيحَاتِ وَالصَّادِقِينَ

وَالصَّادِقَاتِ﴾ (الہیہ)

بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرمانبردار مرد اور عورتیں اور

سچے مرد اور سچی عورتیں.....

﴿اعْدِ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (احزاب۔ ۳۳: ۳۵)

اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔

س سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا اور وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی قیامت کی

نسبت ہے۔

﴿هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ﴾ (مائدہ۔ ۱۶)

یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔

س امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا

فرمائے گا چنانچہ فرمایا۔

﴿لِيَحْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ﴾ (احزاب-۳)

تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ و رابطہ رکھو اور انہیں کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو۔ کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے اللہ فرماتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (توبہ-۵)

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت ﷺ اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں جن کی سچائی کا بار ہا امتحان ہو چکا تھا۔ مگر بہر حال آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے۔

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں جن کے لحاظ سے اس کے اندر اکیسے قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے امام غزالی نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن وحدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ بات میں سچائی ارادہ اور نیت میں سچائی عزم میں سچائی عزم کو پورا کرنے میں سچائی عمل میں سچائی اور دینداری کے مقدمات اور مراتب میں سچائی لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آ جاتی ہیں یعنی زبان کی سچائی دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی:

یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول و قرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے سورہ احزاب میں ایک آیت ہے۔

﴿لَسَجَرِي أَنَّهُ الضَّادِقِينَ مُصَدِّقِهِمْ وَنَعَذَّبُ الْمُنَافِقِينَ﴾ (احزاب-۷۰-۷۱)

تاکہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے۔

اس آیت پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صادق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے صفوان بن سلیم تابعی سے

ہیں۔ اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہہ سے نہیں نکلا۔ منافق رسول اللہ کی خدمت میں آ کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی۔ لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿وَمَنْ يَشْهَدْ أَنَّ الْمُسْلِمِينَ لَكَذِبُونَ﴾ (مائدہ - ۱)

اور اللہ بتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے جس کی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے اور ہر ایک اپنے علم و دوست اور جان بازی کے کارنامے بیان کرے گا۔ لیکن ان کا رناموں کو سن کر اللہ کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے۔ یہ کارنامے اگرچہ نیک بیان نہیں کئے گئے تھے تاہم چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا کہ ان کے ان کارناموں کی حقیقی غرض اللہ کی خوشنودی نہ تھی بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا اللہ کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی:

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو یا یوں کہے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے اس کے باطن میں وہ خشوع و خضوع نہیں ہے اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے اس بناء پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں اس لیے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے اللہ نے فرمایا۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (حجرات - ۲)

مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (دشہ) نہیں کیا اور اللہ کے رستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا یہی سچے لوگ ہیں۔

یہ سچے اس لیے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار

کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کر دی۔

اس صدق عمل کے کئی مرتبے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اس میں کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو۔ مثلاً ایک شخص احکام الہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے کیونکہ عدم یقین کی بناء پر وہ دس کے بودے ہوتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

﴿وَيَقُولُ الْكَافِرُ إِنِّي آمَنُ بِالْوَلَاءِ لَوْلَا نُنَزِّلُ الْسُّورَةَ فَاذْكُرْ فِيهَا الْفِتْنَةَ وَذُكِّرْ فِيهَا الْفِتْنَةَ رَأَيْتُ الْكَافِرَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُنْظَرُونَ إِلَيْكَ بِصِرَاطٍ مُعْتَمِدٍ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَئِكَ لَمْ يَصَاحِقُوا فِي قَوْلِهِمْ فَاذْكُرْ فَنُصَدِّقُوا اللَّهُ لَكَ إِن كَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (محمد ۳)

اور سچے مسلمان تو یہ تمنّا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو پھر جب کوئی سورت اترتی ہے اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو تو ان پر تفت ہو (رسول کی) فرماں برداری چاہیے اور صاف و صحیح جواب دینا چاہیے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ اللہ سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کر لے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو اس لیے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عموماً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے اللہ نے ان کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا اس کی سلامتی کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملے تو اپنی جاں بازی کے جوہر دکھاؤں گا چنانچہ اس کے بعد غزوہ احد میں شریک ہوئے اور نیزے لٹکوا اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی ایسے عزم کی یہ بہترین مثال تھی اس لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی۔ ۱

﴿مَنْ الْمُؤْمِنِينَ رَجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْصَرُ وَمَا نَدَّلُوا تَبْدِيلًا لِّيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا﴾ (احزاب-۳)

مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے ساتھ انہوں نے (جان نثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت

کے) غنظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی تو رد و بدل نہیں کیا تا کہ اللہ چوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگرچہ ہے یا ان کو معاف کر دے لے بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

صدق عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ سے کہا کہ ”میں اللہ پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں“ آپ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے ”میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرش الہی کو دیکھ رہا ہوں گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہیں گویا میں دوزخیوں کو اویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں“۔ ارشاد ہوا کہ ”تم نے جان لیا اسی پر قائم رہو۔“ ۱

صحابہ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ کی خاص صحبتوں میں ان کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدیؓ حضرت ابو بکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے انہوں نے پوچھا حنظلہؓ کیا بات ہے؟ بولے میں منافق ہو گیا ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں لیکن جب پٹ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے اب دونوں بزرگ رسول اللہ کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آ جاتی ہے۔ ۲

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے فرمایا۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ﴾ (نکات)

ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے۔

﴿لَيْسَ السُّرُّ أَنْ تُولُؤُوا وَجُوهَكُمْ قُلُ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ السُّرُّ مِنْ أَمْسِ بَالِهٍ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّ وَانِّي أَعْلَمُ عَلَى خُبِّهِ دَوَى الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ
وَأَسْ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامِ الصَّلَاةَ وَانِّي الرِّكَاةَ وَالْمُؤَقُونَ بَعْدَهُمْ ادا

۱ یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرما دے۔

۲ اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالک۔

۳ ترمذی الجواب الزہد۔

عَاهِدُوا وَلَقَسْرُنِ فِي السَّاءِ وَمُضَرَّاءَ وَحِينَ لَسَّسَ أُولَئِكَ لَدَيْهِ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۲۲﴾ (۲۲۔۲۱)

نبی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ نبی تو ان کی ہے جو اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حب پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) آزادوں (کے بچھڑانے) میں (ایسا) اور نماز پڑھتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور جب (کسی بات کا) اقرار کر یا تو اپنے قوں کے پورے ورثی و تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور سچی ہیں پرہیزگار۔

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں اول ان کے ایمان کا کمال دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا اور جو لوگ علم اور عمل کے ان تمام فضائل کے درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا صدیق کہتے ہیں ۱۔ جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبہ کمال ہے چنانچہ آیت ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہم راہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے۔

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ لَهُمْ هُدًى مِنَ اللَّهِ إِنَّهُمْ فِي الْبُصْرَةِ وَالصَّدِّيقِينَ وَشُهَدَاءَ وَالْمُضْلِحِينَ وَحَسَنٌ وَثَنٌ رَفِيقًا﴾ (۲۱۔۱۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام عطا فرمایا ہے اور صدیق اور شہید اور (۱۱۔۱۰) نیک بندے اور یہ لوگ (یہاں) جیسے ساتھی ہیں۔
سورہ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے۔

﴿وَلَدَيْهِ أَمْثَلُ سُنَّةٍ وَرُسُلُهُ أُولَئِكَ هُمُ الصَّدِّيقُونَ﴾ (۲۰۔۱۹)

اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہو سکتا یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ”انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے“۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے۔
اس تفصیل سے اندازہ ہو گا کہ رسول اللہ کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے زبان کی سچائی دل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے۔ سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے، اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے، اور ان سب کا منشاء یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور غلط ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۃ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔

﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ (بقرہ: ۱)

اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں، (تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور) بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی کہ کیا دی گئی، پھل کے مویشی کے سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعین نہیں کی گئی، اللہ نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہئے جس کو یہ نہیں ملا، یا ضرورت سے کم کم ملا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں، یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے، اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔ ۱۔

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوق انہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی سس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا، اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایاتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۃ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا حُلَّةَ وَلَا شِعَاعَةَ وَالْكَافِرُونَ هُمْ الظَّالِمُونَ﴾ (بقہ ۲۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے نہ دوستی ہے نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم۔

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روز جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے اللہ کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے یا یہ کہ وہ کافر نعمت ہے جو اللہ کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پر تاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں اللہ کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خریدو فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی سفارش سے کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے خرچ کر کے اللہ کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

اللہ کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اس میں خلوص نیت ہو اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنون احسان بنانا ہو اور نہ اس کا الالہنا دینا ہو خود رسول کو فرمایا ﴿وَلَا تَنْسُوا نَسْكَكُمْ﴾ (مذکر) اور احسان نہ کر (احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدہ چاہے۔ اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری اللہ دے گا اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا ارشاد ہے۔

﴿الَّذِينَ يَنْفَقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (بقہ ۲۶)

جو اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ الالہنا دیتے ہیں ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دناوت ظاہر ہوتی ہے فرمایا گیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْقُوا مِنْ طَيِّبٍ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَحْرَخْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيْمَمُوا الْحَبِثَ مِنْهُ تُعْطُونَ وَلَسْتُمْ بِأَحْبِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ﴾ (بقہ ۳۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو اس میں سے بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو حالانکہ تم اب اس کو لینے والے نہیں مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو اس کا دینا بھی پسند کرو جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جو ہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آ سکتا صاف فرمایا:

﴿نَسْأَلُكَ الرَّحْمَنَ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا نَحْنُ بِشَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَالِمٌ﴾ (آئینہ ۱۰)

ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے اور جو بھی تم خرچ کرو اللہ جانتا ہے۔

یعنی اللہ دل کے حال سے خبردار ہے کہ کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو اس کی حقیقت اور اس سے چھپی رہے تو چھپی رہے مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اسی لیے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے اور اس طرح نیکی کے کام جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا فرمایا۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُفْسِدْكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا اتِّعَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ (بقرہ ۲۷۰-۲۷۱)

اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے اور جو بھی تم خرچ کر دو وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهُ أَصْفَاً كَثِيرَةً﴾ (بقرہ ۲۷۲)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهُ وَهُوَ أَجْرٌ كَرِيمٌ﴾ (حدید ۲۰)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تو وہ اس کو اس کے واسطے دو گنا کرے اور ہے اس کے لیے عزت کی

مزدوری۔

آگے چل کر پھر فرمایا۔

﴿إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَقَرْضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ جَزَاءٌ كَرِيمٌ﴾ (حدید ۲۰)

بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو چھا قرض ان کو دو گنا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔

کہیں حکم کی صورت میں ہے۔

﴿وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (زل ۲)

اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو نہ اس پر احسان دھرا جائے نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو بنی اسرائیل سے اللہ نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور

اس کے بعد آخری بات یہ ہے۔

﴿وَقَرْضْتُمْ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۳-۵۰-۱)

اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

﴿لَا كَفْرُكُمْ عَلَيْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَا ذُنُوبُكُمْ حَتَّىٰ تَخْرُجُوا مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (۳-۵۰-۱)

تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے اور خوش نصیبی کے ساتھ کار خیر میں خرچ کرتے تھے اللہ

نے ان کی تعریف فرمائی۔

﴿وَمَنْ لَا عَرَابَ مِنْ يُثُومٍ بَالِغَةَ الْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرْبًا عِنْدَ اللَّهِ وَصَلَاتُ

الرَّسُولِ﴾ (توبہ-۱۲)

اور جسے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں اللہ سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔

اللہ نے ایسے نیکو داناؤں کو خوشخبری دی۔

﴿إِنَّمَا لَهُمْ قَرُنٌ لَّهُمْ سَيِّئَاتُهُمْ إِنَّهُ فِي رَحْمَتِهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (توبہ-۱۲)

ہاں وہ ان کے حق میں نزدیک کی کا سبب بنے ن کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

متقی بنحوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی

منادی کی ہے۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَعْرِفَةِ مَنْ رَزَقْتُمْ وَحَبِطَ عَرْصُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ أَعَدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ (آل عمران-۱۳)

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو اللہ کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ

ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہوگا دور ہو جاتا ہے فرمایا۔

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَعًا سَابِلٌ فِي كُلِّ سُورَةٍ

مَرَّةٍ حَبَّةٌ وَاتَّةٌ يَضَعُ لَهَا ثَمَرًا وَمَنْ يَشَاءُ اللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (۳۱-۰۰)

ان کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی سی ہے جس سے سات بائیس اگتی ہیں ہر بال

میں سوداے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ شامش و ، ہے سب جانتا ہے۔

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے

اللہ نجاش اور کشش والا ہے اس کے ہاں ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہیں ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے مٹی اچھی نیت سے یہ دیا ہے اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں ایسے اور مثال دی ہے۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِنُفْسِهِمْ مُرْصَاتٍ ۚ وَاللَّهُ وَثِيقٌ بِمَا يُمْسِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ كَمْثِلًا ۚ ذَٰلِكَ بِمَا كَانُوا لَا يَتَدَبَّرُونَ مَا لَمْ يَكُنْ لَهُمْ مَالٌ فَانْتَبَهُوا ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾
(۴۶-۴۷)

اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں ایک باغ کی سی ہے جو کسی نیلے پر ہوا اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دو گنہ دیا اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔ اس مثال میں نیلے کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت بارش سے زیادہ اور اس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا اور پھل سے ثواب مراد ہے تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی اچھی نیت سے اللہ کی راہ میں جو دیا جائے وہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و دہش اور جو د و سخا کی بند کی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورہ والیل میں بیان کیا گیا ہے فرمایا۔
﴿وَمَا مِنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنُيَسِّرُهُ يَسْرَىٰ ۖ﴾ (یل-۱)
تو جس نے (راہ اللہ میں) دیا اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا تو ہم اس کے لیے (آسانی کی) سچ بات کا راستہ آسان کریں گے۔

﴿وَسُبِّحْهَا الْإِنْفَىٰ ۖ يُؤْتِنِي مَالَهُ يَتَرَكْنِي ۖ وَمَا لَاحِدٌ عَنْهُ مِنْ تَعْمَةٍ تُخْرِنِي ۖ﴾
ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۖ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ (یل-۱)

اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیز کار بچایا جائے گا جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے اور وہ خوش ہو جائے گا۔

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہ اللہ میں دینے کی عادت، اطاعت و عبادت یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے مقلد پر جو داد و دہش کا عادی ہے دوزخ کی آگ حرام ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس جو د و سخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخصوص غرض نہ ہو بلکہ مقصود صرف اللہ ہو اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اس کا امن دل پاک ہو جائے تو اللہ بھی اس کے عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا اور جو د و سخا اور داد و دہش کی برکت تعریف اور جمع مال حرام و طمع اور

بخل کی بہت مذمت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے۔

﴿وَبَلَّ لَكُلِّ هُمْرَةٍ لُّمْرَةٍ ۖ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۚ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ﴾ (نملہ-۱۰)
پھنکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر رکھا سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے۔

﴿وَتَحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا حَمًا﴾ (النملہ-۱۱)

اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔

یہی محبت سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھین جائے گی اور میرا مال خرچ ہو جائے گا اسی وسوسہ شیطانی کو اللہ نے انفاق (اللہ کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

﴿شَيْطَرٌ يَعَذُّكُمْ الْمَقْرُوبَ بِأَمْوَالِكُمْ بِالْمُحْشَاءِ ۚ وَاللَّهُ يَعَذُّكُمْ مَعْمَرَةً مِّنْهُ وَفَصْلًا ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (نملہ-۱۲)

شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے اور اللہ تم سے اپنی طرف سے سزاہوں کی بخشش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے جو نئے والا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا۔

﴿لَنُنَزِّلَ لَكُم مِّنْ سَمَاءٍ مَّاءً ۖ وَمِنْ يَّوْتِ الْحِكْمَةِ فَقَدْ أُوتِيَ حَبِيراً كَثِيراً﴾ (نملہ-۱۳)

۱۰۱۔ دینا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہا ہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔

یعنی یہ سمجھ لینا اور شیطان کا یہ وہم دہنا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے اس کا سراسر دھوکا ہے اور اللہ کا یہ وعدہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے بہت بڑی دانتائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچ وہی مراد کو پہنچا کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی ہمارا ہوا اور جس کے اکھڑ گئے وہ ہمارا رہا۔

﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ

وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا حَبِيراً لِّأَنفُسِكُمْ وَمَنْ يُؤَقِّ شَيْئاً نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۚ

اِنْ تَقَرُّضُوا اِلَیْهِ قَرْضًا حَسَنًا یُّضَعْفُ لَكُمْ وَیُغْفَرُ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ شُكُورٌ حَلِیمٌ﴾ (احزاب-۲)

تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے تو اللہ سے ڈرو جتن ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور مانو اور (راہ اللہ میں) خرچ کرو اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی بچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ اس کو تمہارے لیے دوٹا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔

ان آیتوں میں اتفاق اور کار خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تمول کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔ سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے یہودہ خطرے ہیں۔

۱۔ میری چیز ہے میں دوسروں کو کیوں دوں۔

۲۔ دوسروں کو دوں گا تو میرے مال میں کمی ہو جائے گی جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے اس نے یہ بتایا اور اپنے پیروں و اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں وہ صرف اللہ کا ہے وہی اس کا مالک اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہئے۔

﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (حدید-۱)

اور تم کو کیا ہوا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

بخل کی برائی میں کہا۔

﴿وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ يَسْخُلُونَ سَمَاوَاتِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ أَلَيْسَ لَهُمْ بَلٌّ هُوَ شَرُّ لَهُمْ

سَيُطَوَّقُونَ مَا بَجَلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (آل عمران-۱۸)

اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق لایا جائے گا جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے۔

﴿وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے۔

﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اسی کی ہے۔

منفقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعمِ باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا تردید کی فرمایا۔

﴿هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مِنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُوا ۚ وَلَئِنَّ حِرَائِلَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْخَفِيفِينَ لَا يَفْقَهُونَ﴾ (ننتہ ۱۳)

وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کے پاس جو گڑ ہیں ان پر خرچ نہ کرو تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں! اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔

منفق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی کی کل چل رہی ہے ان کے بل بوتے سے ہے اللہ نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا فرمایا۔

﴿لَهُ مُقَابِلُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَسْطُرُ الرُّزْقَ مَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ مُخْلِ شَيْءٍ عَنِّي﴾ (شوری ۲۰)

اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی و زمین کی کنجیاں پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور ناپ دیتا ہے وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں اگر ایک میں انسان کی فیاضی مال کے عدم محبت ایثار اور جذبہ شکر کا امتحان ہے تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبہ صبر کی آزمائش ہے فرمایا۔

﴿وَإِذَا مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ عَبْدًا مَّا لَا يَسْأَلُ دَامًا سِنَّةً رَّثَةً فَآكَرْمَهُ وَنِعْمَةُ يَقُولُ رَتِي كَرَمٌ وَإِنَّمَا آدَامُ سِنَّةٌ فَقَدَرُ عَلَيْهِ رَزْقُهُ فَيَقُولُ رَتِي أَهَانٌ﴾ (نمل ۱۸)

سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی اور جب اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا یہ ساری باتیں نہیں۔

غرض روزی کی کشائش اور تنگی دونوں اللہ کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف کھٹی آرہی ہے مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے مگر تم نگاہ لوگ! دیکھتے نہیں قرآن نے اس انسانی جہت کا نقش ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے۔

﴿وَإِذَا مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ عَبْدًا مَّا لَا يَسْأَلُ دَامًا سِنَّةً رَّثَةً فَآكَرْمَهُ وَنِعْمَةُ يَقُولُ رَتِي أَهَانٌ﴾ (نمل ۱۸)

یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

باندھو نہیں ذرہ تم پر باندھا جائے گا۔“ ۱۔ یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے تو اللہ بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کر لے گا اور تم کو نہیں دے گا۔“ ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا ”تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے فرمایا تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے۔ ۲۔ ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک میں یہ آیت پڑھی اَلْهٰکُمُ النَّکَاثُ رَمَ کُومَالٍ وَدَوْلَتٍ اُوْرِنَا زِوْنَعْمَتٍ کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا۔ پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا یا کھالیا تو اس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔ ۳۔

فرمایا ”اے ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں میں کہوں گا کہ اس کو اللہ کے بندوں میں ایسے سے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو“ پھر فرمایا ”ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے سے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔“ ۴۔

فرمایا ”رشک دوسری پر روا ہے ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹ رہا ہے دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔“ ۵۔

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں جس کا مصرف صحیح نہ ہو یا جو اپنی حد سے زیادہ ہوا اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے اور جب موت سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو تھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نظارہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے۔

﴿وَالْمَقْصُودُ مِنْ مَّا رَرَقْتُمْ مِّنْ قَبْلِ رَبِّانِي اَحَدُكُمْ الْمَوْتُ فَيُقَوِّلُ رَتَّ لَوْلَا اَحْرَسِي اِلٰی اَحِلْ قَرِيْبٌ فَاَصْدُقْ وَاَتَكُنْ مِّنَ الصُّلَجِيْنَ﴾ (مفقون-۲)

۱۔ صحیح مسلم باب الحث علی الافاق۔

۲۔ صحیح بخاری جلد ۲ باب مقدم من مالہ فہولہ۔

۳۔ جامع ترمذی باب ما جاء فی الزہاد فی الدنیا۔ حدیث حسن صحیح۔

۴۔ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی ما احب ان لی مثل احد ذہبا۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب العلم۔

اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرؤ اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور ندی کہ میں خیرات کرتا اور نیکیوں میں سے ہو جاتا۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجْلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (سافات ۲۰)

اور اللہ ہرگز کسی کو مہلت اور ندے گا جب اس کا وقت آجائے اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔

اس لیے جو کچھ کرتا ہے وقت پر کرنا چاہئے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا ”یہ کہ تم صدقہ کرو اور تم تندرست ہو مال کی خواہش ہو اور جینے کی بھی امید ہو اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو حالانکہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔“
فرمایا ”اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے بُرا ہے۔“



عفت و پاکبازی

عفت و پاکبازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے اسی لیے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں چنانچہ سورہ مومنوں میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَعْتَابِهِمْ حَفِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ ۖ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَدُونَ﴾ (مومن-۱)

اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں مگر اپنی بیبیوں یا اپنے ہاتھ کی مملوک (باندیوں) سے تو ان پر کچھ الزام نہیں لیکن جو اس کے علاوہ کے طلب گار ہوں تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

سورہ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے ان میں ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَعْتَابِهِمْ حَفِظُونَ﴾ (معارج-۱)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو عقیف اور پاکدامن ہیں

﴿وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظِينَ﴾ (احزاب-۵)

اور اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاکدامنی کے لیے قرآن کی اصطلاح ”حفظ فروج“ ہے حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے کتنے لفظ ہیں جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلاء کے ہیں اور اسی لیے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو اس بناء پر یہ انسانوں کے اعضاء میں سے اس خلاء کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہو وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو اس طریقہ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے وہ کتن گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاکبازی کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہے جو حصن سے بنا ہے جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں اس سے حصان، اخصان، منحصن اور منحصر الفاظ بنائے گئے ہیں پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہیں دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے دو دفعہ حضرت مریم کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں ماضی معروف کے صیغہ میں۔

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (تحريم-۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

﴿وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا﴾ (انبیاء-۶)

اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا، لوٹڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے فرمایا۔

﴿فَإِذَا أَحْصَيْنَ﴾ (نساء-۴)

تو جب وہ نکاح کی قید میں آ چکیں۔

اسی سے اس کا قائل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے۔

﴿مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْلِفِينَ﴾ (نساء-۴)

حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔

﴿مُحْصِنَاتٍ غَيْرَ مُسْلِفَاتٍ﴾ (نساء-۴)

حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں اسی لیے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں رکھی ہوئی بیبیاں) دو معنوں میں آیا ہے ایک بیابنی عورتوں کے معنی میں جیسے

﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ (نساء-۴)

اور بیابنی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)

دوسرے شریف آزاد بیبیوں کے معنی میں جیسے۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلاً أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ (نساء-۴)

اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیبیوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے۔

﴿حَفِظْتُ لِّلْغَيْبِ﴾ (نساء-۴)

پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جز ہے نبیؐ نبی کے سلسلہ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان

باندھا تھا قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی

﴿وَمَرْيَمُ اسْتَعْصَمَ الْبَنَاتِ اسْتَعْصَمَ مَرْجُوحًا﴾ (تحیم-۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

﴿وَالَّتِي اسْتَعْصَمَ مَرْجُوحًا فَصَحَّحْنَا فِيهَا مِنْ رُؤُوسِنَا﴾ (انبیاء-۶)

اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

حضرت یوسفؑ نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی

﴿وَلَقَدْ رَآوْهُ عَنْ تَحْتِهِ فَاسْتَغْصَمَ﴾ (یوسف-۳)

اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔

اللہ نے فرمایا میں نے ایسا اس لیے کیا

﴿يَصْرِفُ عَنْ الشُّؤْمِ وَالْمُحْشَاءِ أَنَّهُ مِنْ عَادَاتِ الْمُحْصَنِينَ﴾ (یوسف-۳)

تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں وہ بے شہہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں حضرت یحییٰ کی تعریف میں فرمایا گیا۔

﴿وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَسَيِّمًا مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ (آل عمران-۴)

اور سردار ہوگا اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔

اسلام میں اہل بیت نبوی کی زندگی جس عفت و عصمت اور پاکبازی کی تصویر تھی غیب کے دانائے راز نے اس

کی گواہی ان لفظوں میں دی۔

﴿أُولَئِكَ مُرَرَّ وَنَ مَّا يَقُولُونَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ (نور-۳)

یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں ان کے لیے بخشائش ہے اور عزت والی روزی۔

عفت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فاحشۃؑ آیا ہے جس کے معنی بہت بڑی برائی کے

ہیں جیسے

﴿إِلَّا أَن يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ﴾ (نساء-۳)

مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔

﴿وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاءِكُمْ﴾ (نساء-۳)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزَّوْجَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَنْ سَاءَ سَبِيلًا﴾ (بنی اسرائیل-۳)

اس کا یہ خفا نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

اور زنا کے قریب نہ جاؤ' بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے یہ نہیں فرمایا کہ "تم زنا نہ کرنا" بلکہ یہ کہا کہ "تم زنا کے قریب نہ جانا"۔ اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے کسی غیر محرم کی طرف لپٹی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا، جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا یا دوسری غیر شریفہ حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لیے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِينَ بَعْضُوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا أْفُرُوجَهُمْ ذٰلِكَ اَرٰكُمۡ لَہُمْ اِنَّ اللّٰہَ خَبِيرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ﴾ (نور: ۳)

اے پیغمبر! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے بڑی ستھری بات ہے اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

عورتوں کی ذرا سی بیباکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے اس لیے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنکار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لیے زمین پر ہولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ پر چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے یہ تمام باتیں درحقیقت لا تَقْرُبُوا الزَّانٰی زَنَا کے قریب بھی نہ ہو، کی شرح ہیں فرمایا

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ بَعْضُصْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنْهَا وَلَا یُضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُيُوْبِهِنَّ وَلَا یُتَّبِعْنَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا بِعَوَّلَتِهِنَّ اَوْ اَبَآئِهِنَّ اَوْ اَبَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءُ یُعَوَّلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنٰی اِخْوَانِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوْ التَّابِعِیْنَ غَیْرِ اُولٰٓئِی الْاَرْبَیۃ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الْوَلَدِ الَّذِیۡنَ لَمْ یَظْہَرُوْا عَلٰی عَوْرَتِ النِّسَآءِ وَلَا یُضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِعُلْمَ مَا یُحْفَیۡنَ مِنْ زَیْنَتِهِنَّ وَتَوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اِنَّہٗ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَنَکُمْ تَفْلَحُوْنَ﴾ (نور: ۳)

اور اے پیغمبر! ایمان والی بیویوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور

اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں، مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے ۱۔ اور اپنی اوز منی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں اور اپنا سنگار نہ کھولیں، مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے شوہر کے باپ یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجیوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں ۲۔ یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں اس کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانو اللہ کے آگے توبہ کرو شاید تم بھلائی پاؤ۔

اور حسب ذیل ادب کو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کے لیے اس میں بیرونی کا

نمونہ ہے۔

﴿يَنْسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَخِدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنْ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الذِّئِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْحَاهِلِيَةِ الْأُولَى﴾ (احزاب-۳)

اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو، سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ خواہش کرنے لگے اور نیک بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کا پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔ ۳

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ﴾ (احزاب-۷)

اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدوں کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیے) داخل نہ ہو۔

گو یا حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا فحشانی کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاکدامنی ہی کے سلسلہ میں سورہ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ۚ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (نور-۳)

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو جب تک خبر نہ کر لو اور ان گھروالوں کو سلام نہ دے، لویہ بہتر ہے تمہارے حق میں شاید تم یاد رکھو۔

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زمانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہئے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ

۱۔ جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی انگوٹھی اس لیے چہرہ ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

۲۔ یعنی سہیلیاں اور خادماں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے (روح المعانی) ۱۲۔

۳۔ یعنی تم سے جرات کر کے تمہارا خواہاں ہو۔

۴۔ التبرج اظہار و الذین للناس الاحانب (لسان العرب)۔

دھڑا کر اندر گھس جائے چنانچہ کا شانہ نبوی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے۔

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ﴾ (آب-۷)

اور جب تم مانگے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے اوٹ سے اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی بڑی سترائی ہے۔

یہ حکم گوشان نزول کے لحاظ سے ازواج مطہرات کے سلسلہ سے ہے مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لیے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں تاکہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بی ہیں ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے فرمایا

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَلِكَ أَدْنَى أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ لِّجُنِّ لَمْ يَسْتِهْ الْمُتَفَقُّونَ ۚ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْجَدِيدِ لَلْغُرْبَةِ بَئِمْ ثُمَّ لَا يَحَابِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا﴾ (آب-۷)

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچی لٹکا لیں اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے اللہ بخشنے والا مہربان ہے اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکھیں تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھتے تھے اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیئے شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے بلکہ ان کو شہر بدر کیا جاسکتا ہے اور مسلمان بیبیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں اس کے لیے صورت یہ بتائی کہ جب گھروں سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس زیور اور دوسرے بتاؤ سنگار سب چھپ جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بی بی ہیں جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے عورتیں بتاؤ

سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے۔ اور نشان کے لیے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں، اسلام نے آکر ان مراسم کی اصلاح کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری۔

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَابَكُمْ عَلَى السَّعَاءِ إِنْ أَرَدْتُمْ مُحْصَاةً لِّتَتَّقُوا غِرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُكْرِهْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ أَكْرَاهِهِمْ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (نور: ۳)

اور تمہاری لوغڈیاں اگر کسی ایک کی ہو کر رہتا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری نہ کر دیا کرو اور جو ان پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

اس لیے اسلام نے اس کو حرام کماؤں میں سے قرار دیا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لیے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ اسکی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے لے کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی ہے، سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا، اور رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت چاہی، وحی الہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا

﴿الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ وَحُرْمٌ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (نور: ۱)

بدکار مرد بدکاری عورت یا مشرک عورت سے نکاح کرے گا، اور بدکار عورت سے بدکاری مرد یا مشرک نکاح کرے گا، ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آسکتا ہے اسی لیے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا۔

﴿الْحَيْثُ لِلْغَيْبِ وَالْغَيْبِ لِلْغَيْبِ وَالْغَيْبِ لِلْغَيْبِ وَالْغَيْبِ لِلْغَيْبِ﴾ (نور: ۳)

گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہوتی ہیں، اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے، اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے، اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔

اسی لیے کسی بدکار مرد کا کسی عقیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں، بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے جائز نہیں، اے اور ان کی دلیل سورہ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے جس کو

۱۔ سہمہ مطہرہ میں طرفہ کے قصیدے کا یہ شعر پڑھئے (رحیب قطاب الحبیب مہار رفیقہ۔ بحسن الدامی بصۃ المنہرہ۔

۲۔ صحیح مسلم باب تحریم مطلق الغنی وغیرہ۔

۳۔ جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر بھی جاتی ہے اس سے مراد اس کی برائی ہے یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا اسکو الا یا منیٰ مکرم اور ماسکو ایا مطاب لکم من النساء سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے۔^۱

غرض اہل ایمان جن کی شان ستمرائی اور پاکبازی ہے ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آتا چاہئے چنانچہ سورہ فرقان میں اللہ نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے ان کی تین صفاتیں آخر میں یہ بتائی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی اور شریک نہیں کرتے جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے اور جو بدکاری نہیں کرتے فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ﴾
(نق ۶۰)

اور جو اللہ برحق کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کا جس کو اللہ نے منع کیا ہے خون نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے اس کے بعد جو دو باتیں ہیں ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں لا تَقْرَبُوا الرِّبِّيَّ بَدْعًا رِيبٌ كَيْفَ تَشْرَحُونَ ہیں ان کی مزید تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں^۲ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ ہار یک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں^۳ حکم دیا کہ منٹ زنان خانوں میں نہ جانے پائیں^۴ فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے

(بچھلے صلی کا بیقہ حاشیہ)

یہ ہے کہ زانی مرد کا عقیف عورت سے اور عقیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے بعض فقہانے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شوہر میں کفو ہونا شرط ہے اور چونکہ عقیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا اس لیے یہ نکاح فریقین میں سے جو عقیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو توبہ کرنے کے بعد جائز ہے دیکھو احکام القرآن بصام رازی و تفسیرات احمد یہ ملا جیون و تفسیر کبیر رازی اور روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ۔

۱۔ ابوداؤد کتاب النکاح۔

۲۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی نظرة الفحشاء۔

۳۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما تندی المرافقہ بہا۔

۴۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المحشبین۔

پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے اہل خانہ کی بے ستری ہونے فرمایا کہ عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے ۱۔ سب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے ۲۔ تاکہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے ۳۔ کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے اگر کسی کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس گیا تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے۔ ۴

یہ ساری ہدایتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو۔ لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کہ بلکہ ان کے لیے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔

﴿الرَّائِيَةُ وَالرَّائِيَةُ فَاجْتَنِبُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ حَلَّةٍ﴾ (ذہبی)

بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مردان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

احادیث میں بیان ہے مردوں اور عورتوں (یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی) میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے اس لیے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی فرمایا۔

﴿وَلَا يَرْبِسُ وَلَا يَقْتُلُ وَلَا دَهْسُ وَلَا بَاتِنُ يَهْتَابُ بَغْيَ رِيَّةِ بِنِ اَيْدِيَهُنَّ وَارْجُلَهُنَّ﴾ (متحدہ - ۲)

اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اور دیکو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو ۱۔ یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے بعض عورتیں دوسرے کے بچے کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں یہ ساری باتیں عفت اور پاکدامنی کے

۱۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان فبالہ البیت۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الرجل باب فی المرأة تطیب الحروج۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطريق۔

۴۔ مسلم کتاب السلام باب تحریم الحلوۃ بالاحسینہ والدخول علیہا۔

۵۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان فبالہ البیت۔

۶۔ مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے۔

خلاف تھیں اس لیے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں فتح مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویوں سے لے اور مدینہ میں انصاری عورتوں سے بھی اس پر عہد لیا ۱۔ بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا اور صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے ان پر بیعت کی۔ ۲

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے اگر نہ پیش کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بناء پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے۔ ۳

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور حقوق عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاکباز کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہو لے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا ہو لے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ ۴

﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ﴾ (فرقان-۶)

اور جو اللہ کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو اللہ نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوس ناک ہیں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی ان سے یہ فعل ظہور میں آیا اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔

۱۔ صحیح بخاری فتح مکہ۔

۲۔ تفسیر طبری سورہ بختہ۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوة الایمان۔

۴۔ اس کی تفصیل سورہ نور میں ہے اس کے بعد نکاح توڑنے یا نوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عمل درآمدی پر رہا ہے بخاری باب اللعان۔

۵۔ بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”زانی جس وقت زنا کرتا ہے شرابی جس وقت شراب پیتا ہے چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا“^۱ لے کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے اور اللہ پر اور اللہ کے احکام پر یقین رکھ کر اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگسار کرنا ہے لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے ایک روحانی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی درناک صورتیں دکھائی گئیں ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ جگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے^۲ یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا اللہ تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔^۳

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں ایک حدیث میں آپ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعۃً پانی برسنے لگا تینوں نے پانی سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی سو اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر ٹھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمال صالحہ کے واسطے سے اللہ سے دعا کریں چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا ان میں پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی ”خداوند! میری ایک چچا زاد بہن تھی جس سے میں بہت محبت رکھتا تھا میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن جب تک میں اس کو سودینا نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی میں نے سودینا رکھا کر جمع کئے اور اس کو دے کر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی لیکن اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو میں فوراً رک گیا اللہ تعالیٰ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی

۱۔ بخاری کتاب اللہ و باب الزنا و شرب الخمر۔

۲۔ بخاری کتاب البیات۔

۳۔ بخاری کتاب اللہ و باب فصل من ترک الفواحش۔

کے لیے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹانے چنانچہ وہ سرک گیا“ ۱۔
 یہ روایت عفت و پاکبازی کو ان اعمال میں شمار کرتی ہے جن سے اللہ کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔



دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ (احزاب-۹)

ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بے شبہ وہ ظالم اور نادان ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک الہی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے اس لیے ہر فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

اللہ کا فرشتہ جو اللہ کا پیغام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا امانت سے متصف ہوتا تھا تاکہ بندوں کے لیے جو حکم اللہ کی جانب سے آئے وہ کی بیشی کے بغیر اللہ کا اصلی حکم سمجھا جائے اسی لیے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ”الامین“ رکھا گیا ہے

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ (شعراء-۱۱)

اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔

﴿مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ (نکوہ-۱)

اس کا کہنا جاتا ہے وہاں امانت والا ہے۔

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا۔

﴿إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴾ (شعراء-۱۰)

میں تمہارے لیے امانت دار قاصد ہوں۔

یعنی اللہ سے جو پیغام مجھے ملے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔ ہمارے رسول اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے ”امین“ کا خطاب ملا تھا کیونکہ آپ اپنے کاروبار میں دیانتدار تھے اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔ نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ بِأَعْوُنَ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (مومنون-۱)

اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبد الدار حبشی کے پاس رہتی تھی فتح مکہ کے وقت وہ اس کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اتری۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (نساء: ۵۸)

بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اللہ نے یہی حکم دیا ہے وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ ۱۔ بہر حال یہ واقعہ صرف شان نزول کا حکم رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا اسی لیے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانت الہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیف شرعی ہے ۲۔ اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے ۳۔ اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے جائیداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ہر مالی قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے کسی کا کوئی عہد آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچ کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث بننا بھی امانت ہے کسی نے آپ سے اپنی کسی نفع کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر پچھ وقت چڑھتا ہے یا بے سبب سستی کرتا ہے یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے وہ بھی ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (سورہ نون: ۸۰۲۳)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسداری کرتے ہیں۔

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی یا سفر میں گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر رو رکھی

۱۔ تفسیر کشاف زحشری۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ تفسیر ابن جریر طبری۔

﴿فَیُثَوِّدُ الْبَدِیَّ اَوْ تُنَمِّسُ اِمَانَتَهُ وَ لَیْسَتْ اِلَّا رِبَّیَّةٌ﴾ (بقراءۃ: ۲۸۳)

تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہئے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

یعنی لے کر مکر نہ جائے یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے جس کی ممانعت اسلام نے بر ملا کی ہے۔

﴿وَنُحَوِّثُ اِمَانَتُکُمْ وَاَنْتُمْ تَغْمُؤْنَ﴾ (غالب: ۸-۲۷)

اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پیٹے کے لیے پانی بھر دیا اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے تو اس موقع پر قرآن پاک کی آیت ہے۔

﴿یَا سَاحِرَہٗ اِنَّ حَبِیْرَ مِّنْ اَسْتَا حِرَّتِ الْفُقَیْ اَلَامِیْنُ﴾ (تیس: ۳)

اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجئے سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو۔

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دور رس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا یا کوئی شخص اپنے کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے رسول اللہ ﷺ کے رازدار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو باتیں سنی تھیں ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا دوسری یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا کچھ سنت سے سیکھا (یعنی فطری امانت کے جوہر میں سب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا فرمایا ”پھر یہ حال ہو گا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے

اندر چھ نہیں ہوتا لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے، لیکن کوئی امانتداری نہیں کرے گا اس وقت امانتداری کی مثال ایسی کیہ ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر نہیں لے سکیں قوم میں ایک امانتدار شخص ہے آدمی کی تعریف ہو گی کہ کیسا عقلمند کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے حالانکہ اس کے دس میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔^۱ حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمان داری کا جو ہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دین داری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا جیسا آبد کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا..... اور جو کوئی کسی تاجا نزارا سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔^۲

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔"^۳ اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دس نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمان داری سے دے ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا "جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے۔" لگے اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہئے الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے رد کرنے کا کام لیا جائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا صحابہ کرام علیہم السلام یعنی "نشتیں امانت کے ساتھ ہوں۔" مگر تین موقعوں پر کہیں کسی ۵ کے ناحق قتل کی یا کسی کی آبروریزی کی یا کسی کا مال تاجا نزارا سے لے لینے کی سازش ہو تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے۔

کسی کاراز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے لہذا راز کے یہی معنی ہیں کہ جس کو

۱ صحیح بخاری باب رفع الامانة و کتاب العین و رقائق صحیح مسند احمد و ترمذی و ابن ماجہ۔

۲ کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۵ حیدر آباد طبرانی کبیر عن ابن مسعود۔

۳ کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ طبرانی اوسط و طبرانی بیہ و ابن عدی فی الکامل و بیہقی فی شعب الایمان۔

۴ دہ المفرد بخاری باب المستشار مومن۔

۵ ابوداؤد باب فی نقل الحدیث۔

۶ ابوداؤد کتاب الادب۔

کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے۔ امانت میں خیانت کرنا آنحضرت ﷺ نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے۔^۱

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو اللہ کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ”عورتوں کے باب میں اللہ سے ڈرو“ فرمایا ”کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے۔“^۲

قیامت کی نشانیوں میں آیا ہے کہ ”سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جو ہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ اللہ کے ہاں نہیں“^۳ فرمایا ”میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔“^۴ یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کار خیر میں دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔



۱۔ ایضاً۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔

۳۔ صحیح مسلم حجۃ الوداع۔

۴۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۱۵ از طبرانی وابن مبارک و حکیم ترمذی عن ابن عباسؓ۔

۵۔ کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

شرم و حیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کی بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرتا اسی وصف کا خاصہ ہے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی ذات اقدس کے لائق ہیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہیں لوٹاتا، حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”عزت اور جلال والے اللہ کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے“ ۱۔ ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی میں آئے آپ کے ارد گرد صحن کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرم کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے آپ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آ کر بیٹھا، وہ اللہ کی پناہ میں آیا تو اللہ نے پناہ کی جگہ دی اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا اللہ نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا، اس نے اللہ سے منہ پھیرا ۲۔ تو اللہ نے بھی اس سے منہ پھیرا۔

سورۃ بقرہ میں ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا﴾ (البقرہ ۳)

اللہ کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے۔

﴿وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ (احزاب ۷)

اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

حدیث میں بھی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ ۳

اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں۔

قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف اللہ کی غیرت و حیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے ”اللہ سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے۔“ ۴

۱۔ تہذیبی کتاب الاسماء والصفات

۲۔ بخاری کتاب العلم و صحیح مسلم باب السلام

۳۔ بخاری کتاب الادب باب الاستحي من الحق

۴۔ صحیح مسلم کتاب التوبۃ عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے مگر اس موقع پر اللہ کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب سے ہو جاتے ہیں غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔

موسیٰ کو مدین کے سفر میں جن دو مزیوں سے سابقہ پڑا تھا وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ اللہ نے بھی اس کا ذکر یہاں ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پٹ نہ جاتے وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں تا کہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ کے بلا جانے کے لیے بھیجا۔

﴿فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْسِي عَلَى اسْتَحْيَاءٍ﴾ (قصص-۳)

تو ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیوانی لڑکی کی مدح و ستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسبت تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے بدھ بڑھتا جاتا ہے اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے اس لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا ستر عورت کا خیال نگاہیں نیچی رکھنا بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا برائی کو منع کرنا یہاں تک کہ غسل خانہ اور وضو میں بھی اس کی اجازت نہ دینا اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے چھپتی رہیں اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیاء بن جائے گا۔

آنحضرت ﷺ جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا آپ انیشیں اٹھا اٹھ کر رہے تھے آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھوں کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رڑ نہ لگے آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہو گئی ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا 'میرا تہبند' حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ دیا 'اے نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں۔

﴿كَانَ النَّبِيُّ ﷺ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعُذْرَاءِ فِي خَدْرِهَا﴾ ۱

رسول اللہ ﷺ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے جیسا کہ سورہ احزاب

میں مذکور ہے۔

﴿إِنْ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِ مِنْكُمْ﴾ (احزاب-۷)

تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم و حیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا بلکہ بعض حالات میں اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اس لیے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امر حق کے اظہار میں شرم و حیا دامن گیر نہ ہو لیکن دوسروں کی مروت

سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیاء دار تھا اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔ ۱

یہی حیا جو ایمان کا ایک جز ہے شرعی حیا ہے یعنی جس طرح ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات سے اجتناب کیا جائے اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے اس لیے وہ دونوں ایک ہی ہیں لیکن جن لوگوں میں فطرۃ حیا کا مادہ ہوتا ہے ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے اس لیے بذات خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہار حق و عطا و پند تبلیغ و دعوت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے مثلاً اللہ نے قرآن مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کیا ہے جس کو غار اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے اللہ نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے اللہ نہیں شرماتا یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا فرمایا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا غُوصَةً فَمَا مَوْفِقَهَا﴾ (آۃ ۳۰-۳۱)

اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں شرماتا (چاہے وہ مثال) پھرکی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)

حضرت زینبؓ کی دعوت ولیمہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے جس سے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب نبوت کے خلاف تھا اس لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِيَّ اِسْتِیْ فِیْسْتَحْیِ مِنْكُمْ وَاِنَّهٗ لَا یَسْتَحْیِ مِنْ اِحْقَ﴾ (آۃ ۲۰-۲۱)

اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لظہار کرتے تھے اور اللہ تو حق (بات سے کہنے) میں (کسی کا چم) کی نظر کرتا نہیں۔

اپنی ذاتی تکلیف کے لیے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ ﷺ کی خوشی خشتی اور مروت کے خلاف تھا اس لیے آپ کو اس سے شرم آتی تھی تاہم اس طرح بیٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نوکارتہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں۔

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیرانہ جھپک اور آزاد بنادیا تھا ایک صحابیہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے نہیں شرماتا کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں

آتی 'اکابر صی' یہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے، تاہم چونکہ کمسن تھے اس لیے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم و حیاء کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی اس لیے جب حضرت عمرؓ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔^۱

انصاریہ عورتیں رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

﴿نعم النساء نساء الانصار لم یکن یسمعن الحیاء ان یتفقھن فی الدین﴾^۲

انصاریہ عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیاء نہیں روکتی تھی۔

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پسند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیاء انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿الحیاء لایاتی الا بخیر﴾^۳

حیاء سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے، بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبہ حیاء ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیاء ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا، اس لیے فرمایا کہ

﴿ان مما ادرك الناس من کلام السوء الا ولی اذالم تستحی فاصنع ما شئت﴾

لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم و حیاء نہیں تو جو چاہو کرو۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔

قرآن و حدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں، اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیاء اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے، اسی بنا پر حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے، اور اسلام کا خاص خلق

۱ بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق للفقہ فی الدین۔

۲ مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المعتسلۃ من الحبصۃ فرصة من سلك فی موضع الذم۔

۳ بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔

۴ بخاری کتاب الادب باب اذلم تستحی فاصنع ما شئت۔

حیاء ہے^۱۔ یہ بھی فرمایا ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے^۲۔ فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول و براز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو۔^۳ مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔



۱۔ موطا امام مالک کتاب الجامع باب ما جاء فی الحیاء۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الایمان۔

۳۔ ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ما جانی الاستیذان عند الجماع۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں ان کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگدلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے اسی لیے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے وہ ”رحمان“ یعنی بڑا رحم والا ہے اسی کے ساتھ دوسرا نام ”رحیم“ آتا ہے یعنی رحم سے بھرا ہوا قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے اللہ کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے مسلمان کو ختم ہے کہ جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم اللہ کا نام لے ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہے دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی رحمت کے جلووں کے سوا کچھ اور نہیں ہے اللہ کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا﴾ (مومن۔۱)

اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سمایا ہے۔
اس رحمت الہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے بلکہ

﴿هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ (ش۔۳)

وہی رحم والا مہربان ہے۔

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں۔

﴿وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ﴾ (مومن)

اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

دنیا میں رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں وہ اسی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ نے رحمت کے سو ٹکڑے کئے جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔“ ۱

بنی نوع انسان میں محاسن اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے۔

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَرِبرٌ عِيبُهُ مَا عَصَمَ حَرِيطٌ عَلَيْكُمْ

بِالْمُؤْمِنِينَ رَأَوْفٌ رَّحِيمٌ﴾ (توبہ۔۱۶)

(لوگو!) تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں تمہاری تکلیف ان پر شاق گذرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں اور ان امتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً﴾ (صدیہ ۴)

اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔

اور اس وصف میں امت محمدیہ بھی ان کی شریک و یکم ہے۔

﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (نہم)

اور جو لوگ محمد ﷺ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زور آور ہیں آپس میں رحم رکھ رہے ہیں۔

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے اس کو صلہ رحم کہتے ہیں کیونکہ قریبوں کے سارے رشتے رحم و مہاشی سے پیدا ہوتے ہیں اور رحم اور رحمان جو اللہ کا نام ہے ایک ہی اصل سے مشتق ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) اللہ کی رحمت کا پرتو ہے اور اسی سے صلہ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

﴿الرَّحِمُ شِجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمَنِ﴾

رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔^۱

یعنی قربت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے اور ساری رحم دلیوں کے جذبہ اس کی شاخیں ہیں بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے حضرت اسمہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ اللہ ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔“^۲

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کو لپٹنے لگا آپ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ ”تم اس پر رحم کرتے ہو؟“ اس نے کہا ”ہاں“ ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔“^۳

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کا بوسہ لیا اقرع بن حابس جو ایک درشت خوبو تھے پاس بیٹھے ہوئے تھے بولے کہ میرے دس بچے ہیں میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں کیا آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ”جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں لیکن ہم لوگ نہیں چومتے ارشاد ہوا کہ ”اللہ نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔“^۴

۱۔ بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ۔

۲۔ بخاری کتاب الادب باب وصع الصبی علی۔

۳۔ ادب المفرد باب رحمة العیال۔

۴۔ بخاری کتاب الادب باب رحمة الولد و تقبلہ و معانقہ۔

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امت محمدیہ کا ایک عنصر ہے اس لیے فرمایا کہ ”جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“ ۱ اور اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیر دستوں پر کھایا جاتا ہے تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔

خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے اسی سے قرآن مجید نے صحابہ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرا دیا ہے ﴿رَحِمَاءٌ نَّبِیْہُمْ﴾ یعنی وہ لوگ آپس میں رحم دل ہیں۔

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحم دلی و باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے ۲ جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبہ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں اس لیے جس طرح ایک عضو کے دکھ درد میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے دکھ درد میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہئے۔

اسلام نے جس رحم دلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے کہ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرے گا ۳ یہ بھی فرمایا کہ ”رحم کرنے والوں پر رحم کرنے والا اللہ رحم کرے گا“ ۴ زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔“ ۵

رحم دلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا ۶ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں آپ نے دوبار فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ بھی تم پر رحم کرے گا۔

جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا اس لیے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی۔

اس عام رحم دلی کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے جو بلاغت کی جان ہیں:

فرمایا۔

﴿مَنْ لَا رَحْمَہٗ لَا یَرْحَمْہٗ﴾

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ان دو لفظوں کی تشریح و فتروں میں نہیں ساسکتی رحم دلی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ انہیں دو لفظوں سے

۱۔ ترمذی ابواب البر والصلة باب ما جاء فی رحمة الصبیان۔

۲۔ بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس والبهائم۔

۳۔ بخاری ابواب البر والصلة باب ما جاء فی رحمة الناس۔

۴۔ اب المفرد باب ارحم من فی الارض۔

ابھارا جاسکتا ہے اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ بھی رحم نہیں فرمائے گا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے محدث ابن ابی طالب نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ”اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس لیے اس میں مسلمان، کافر، مملوک اور غیر مملوک، جانور بھی داخل ہیں اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں“۔ غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غمخواری، بے کسوں کی تسکین، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیر دستوں کی اعانت کرتے ہیں اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔



عدل و انصاف

کسی بوجھ کو دو لے برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس و عربی میں "عدل" کہتے ہیں۔^۱ اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں۔ یعنی جو بات ہم نہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے اس تشبیہ سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل و انصاف کا پند بھی چھم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں ان میں ایک عدل (عدل وال) بھی ہے، اللہ نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ "اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے وہ حق بات کہتا ہے اور وہی کرتا ہے جو حق ہے۔" قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے فرمایا

﴿وَاللَّهُ يَفْضِلُ بِالْحَقِّ﴾ (مومن-۲)

اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے دوسری آیت میں ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ﴾ (احزاب-۱)

اور اللہ حق بات کہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے عدل قویٰ کو ظاہر کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یک جا ہیں۔

﴿وَنُمِثُّ كَلِمَةً رَبِّكَ صِدْقًا وَغَدًّا﴾ (انعام-۱۳)

اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی۔

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے ارشاد ہوتا ہے۔

﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَنِعْمَتُكَ وَأَوْثَارُكَ بِعَيْنِهِ قَائِمًا بِقِسْطٍ﴾ (آل عمران-۲)

اللہ نے وہی ای کی اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے وہی اللہ انصاف کو رکھنا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف ظہر و سلطان ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل و انصاف ہے اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جس آئینی باتوں کا خلاصہ یہ ہے ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے فرمایا۔

۱۔ نذری ابواب البر والصلة باب ما جاء في رحمة الناس۔

۲۔ باب المنفعة باب رحم من في الارض۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس والبهائم۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (نحل-۱۳)

بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگزر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے اللہ تعالیٰ نے اعظم عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی جمہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل سے فرض سے زیادہ اہم ہے پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔ مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

﴿فَإِنْ حَفِظْتُمْ أَتَىٰ تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (نساء-۱۱)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیویوں میں) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لوٹنی) تمہارے قبضے میں ہو۔

عورتوں کی طرح قییموں کے حقوق کے لیے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے اس لیے فرمایا۔

﴿وَأَنْ تَقُومُوا لِلنِّسَاءِ بِالْقِسْطِ﴾ (نساء-۱۹)

اور (خاص کر) یہ کہ قییموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے اس لیے فرمایا۔

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ (احقاف-۱۹)

اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) تول۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام و وسیع ہے اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دہانت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسام نے عدالتی کاروبار کے ہر

پہلو میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے تحریر دست ویز کے متعلق حکم ہے کہ

﴿وَلْيَكُتِبْ بَيْنَكُمُ الْكِتَابُ بِالْعَدْلِ﴾ (بقہ-۲۹)

اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَعِيًّا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِيتَ هُوَ مَيْمَنٌ وَرِثَةٌ

لِلْعَدْلِ﴾ (بقہ-۲۹)

پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا اگر وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کر سکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار (ہو) وہ (انصاف کے ساتھ) (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگر کا جاتا ہے ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی

﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾ (انعام-۶)

اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (۴-۵-۶)

مسلمانو! اللہ واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آؤ وہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاظت میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوہ) انصاف پر ہیزگاری سے قریب تر ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے اور یہ کہ ہر حال میں عدل و انصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے۔ یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے اس پر بھی رسول اسلام کی زبان مبارک سے وحی الہی یہ کہنوائی

ہے

﴿وَقُلْ آمَنَّا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۚ إِنَّ اللَّهَ رَشِيدٌ ۚ﴾ (۲-۳-۴)
اور ہم سب کو تمہاری کتاب کو ماننا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے (اللہ سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا ہم میں تم میں چھ جھگڑا نہیں اللہ ہی سب کو جمع کرے گا اسی کی طرف (سب کو) پھر جاتا ہے۔

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک میں ہے اس کے کئی پہلو ہیں ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچتی ہے اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دوست مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے میرے اللہ نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے ہم سب اس کے غلام ہیں اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہئے ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں سب کو

قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہوتا ہے جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو دیا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل و انصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہل ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے ارشاد الہی ہوا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَقْوَامًا يَتَّقُونَ شَهْدًا نَّهْ وَنُوعَلَىٰ انْفُسُكُمْ أَوْ أُولِي الْأَقْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ عَيْنًا أَوْ فَقِيرًا فَآلَتُهُ أُولَىٰ بِهَمَّا وَلَا تَبْغُوا الْهَوَىٰ إِنْ تَعَدَّلُوا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا تَعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ تَحْكُمُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾ (نساء: ۲۰)

اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو اللہ کے لیے گواہ بنو اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو اگر تم زبان طوگے یا کچھ بچاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے کہ کیا کہ معاملات میں عدل و انصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو جو کچھ کہو یا کرو خدا انگلی کہو اور خدا واسطے کہو عدل و انصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بچ میں آئے نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا نہ دولت مند کی طرف داری کا نہ محتاج پر رحم کا پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر پھیلایا جائے مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو جو حق ہو وہ کرو یا کہو پھر سچ کہنے میں کوئی توجہ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپاؤ تو یہ سب باتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا اس لیے نہ گواہوں کو اس لیے طرفداری کرنی چاہئے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرفداری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہئے بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہئے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔

لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے تمہاری تم بین نظر تو اس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب یکساں ہے وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے

بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے غور کیجئے کہ ان لفظوں میں عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے موصداً انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا ہے یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرفداری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے ظلم عالم کو اتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے غلط گواہی کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

اسی لیے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ ہے اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں

﴿وَتَذَرُوا فِيهَا لِيُحْكَمَ لَكُمْ فِيمَا قَدْ كُنْتُمْ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِإِذْنِهِ وَأَنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (بق. ٢٣)

اور نہ مال حاکموں تک پہنچا تا کہ لوگوں کے مال میں سے گنہگار کرکچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں اور ایک دوسرے کے سرو سینہ پر تڑپ تڑپ کر رہی ہوں یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نبی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو اس حالت میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے فرمایا۔

ثُمَّ لِيَصْطَلِبَنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ قَتْلَهُ وَضَحْيَهُ بَيْنَهُمَا وَإِنِّي سَعَتُ اخِذَهُمَا عَلَى الْآخَرَى

فَقَضَوْا أُنْتَىٰ نَعْمَىٰ نَعْمَىٰ أَيْ أَمْرًا بَيْنَهُمَا وَنَدَّاهُمَا فَاصْبِرُوا بَيْنَهُمَا بَعْدَ مَا وَقَعُوا فِيهِ

لَهُ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿١٠﴾ (الحجرات -)

اور اگر (تم) مسلمانوں کے دہانے آچے میں بڑیوں میں صلح کرادو پھر اگر ان میں کایک (فرقہ) دوسرے پر ریائی برتے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ خیمہ خدا کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں بربری کے ساتھ صلح کرادو ورنہ انصاف کو ٹھونڈ رکھو بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمرت کا ستون ہے اسی سے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کئے
یہ عدل و ضروری قرار دیا ہے کہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی داد و رسی ممکن ہی نہیں اسی سے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عدل
ہو اور شاد ہو

﴿ثُمَّ آتَاهُ اللَّهُ ذُلًّا وَتُجَرُّ رُءُوسُهُمْ إِلَى الْأَرْضِ وَكَانَ وَعْدًا مَعُودًا﴾
 ﴿بِالْعَدْلِ﴾ (نساء-۸)

بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں دلوں کو پہنچاؤ اور یہ کہ جب لوگوں نے درمیان جھگڑے فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں "امانت" سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہئے اللہ نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے اور یہ فیصلہ دوست و دشمن کا فرو مسلم سب کے ساتھ عین عدل و انصاف کے ساتھ ہونا چاہئے چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا۔

﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّهُ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۶-۱۰۰)

اور اگر فیصلہ کرے تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسند سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو اپنے فیصلہ کے غماز کی قدرت رکھتا ہو قوت نطق سے محروم نہ ہو صاحب علم ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿وَصَرَبَ لَئِنْ مَنَّا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا لَكَ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَانُ عَلَى مَوْلَةٍ بِنْتٍ
 يُوجِّهُهُ لَا يَأْتِ بِحَبِيرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾
 (النحل-۱۰)

اور اللہ (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (ہیں) جن میں ایک گونا گوا (اور گونا گونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گوئلے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بار خاطر بھی ہے کہ جہاں نہیں س کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہئے ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا اور قادر ہونا چاہئے کیونکہ حکم سے ملوے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے اور جب تک وہ قادر نہ ہو ملوے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا اور عالم ہونا چاہئے تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت قدرت اور علم دونوں کو شامل بنے پہلا شخص گونا گوا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہئے پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہئے پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہئے تاکہ وہ ہر کام کو سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق معاشرت اور

سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔
 ان آیات کے رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے تاہم امام و حاکم وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی
 زیادہ ضروری ہے اس لیے حدیث میں امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ
 ”قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا‘ سات شخصوں کو اللہ اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک
 شخص امام عادل ہوگا۔“ ۱



عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول و قرار کر لیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ (آل عمران ۴۹)

بے شبہ اللہ کے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ﴾ (زمر-۳)

اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ (آل عمران-۲۰)

(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ (۱۰۰-۱)

اللہ کا وعدہ ہوا ہے اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

﴿وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ (حج-۶)

اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔

﴿فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ﴾ (بقرہ-۹)

تو البتہ اللہ اپنے قول و قرار کے خلاف نہ کرے گا۔

﴿وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ﴾ (توبہ-۱۳۰)

اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول و قرار کریں اس کے پابند رہیں 'سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول و قرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول و قرار کے سمجھتے ہیں لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے۔

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ بَعْدَهُمْ إِذَا عَاهَدُوا﴾ (بقرہ-۲۲)

اور اپنے قرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔

بعض آیتوں میں اس کو کامل ایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (مومنون-۱)

اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔

ایک دوسری سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس تصویر کا ایک رشتہ یہ ہے۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (مومنون-۱)

اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔

کسی کی امانت کو رکھ کر بدلہ کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تائیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا اس کے برعکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا۔

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كُنْتُمْ وَرثُوا بِالْقِسْطِ ۖ

الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (بنی اسرائیل-۳)

اور عہد پورا کیا کرو (قیمت میں) عہد کی باز پرس ہوگی اور جب تاپ مرنے کو پہنچو پورا کرو اور (قول کر دینا

ہو) انڈی سیدھی رکھو۔ (معاذ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے اس سے تائیداً پابندی عہد کے عام حکم کے بعد کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے یہ زبانی قول و قرار کی ضرورت نہیں بلکہ عرف عام کے سارے مسلمات و سوانحی کے قول و قرار ہیں۔

تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روز الست کو بندوں نے اپنے اللہ سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرا وہ عہد ہے جو اللہ کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول و قرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہل حقوق کے درمیان فطرۃ قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ارشاد ہے

﴿الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۖ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ

يُؤْتِلُ﴾ (احزاب-۳)

جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار و تمہیں توڑتے اور جو اللہ نے جن تعہدات سے جوڑنے کا

حکم دیا ہے ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان ہے پھر اس قول و قرار کو جو

باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے جو خاص کراہل قرابت کے درمیان قائم ہے۔
سورہ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے جو اللہ کو حاضر و ناظر بنا کر یا اللہ کی قسمیں کھا
کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں فرمایا۔

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ
كَفِيلًا﴾ (نحل-۱۳)

اور اللہ کا نام لے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو اور اللہ کو
تم نے اپنے پر خا من ٹھہرایا ہے۔

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انھوں نے رسول اللہ ﷺ
سے کیے اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے ساتھ ہی وہ سب
معاہدے بھی اس میں آجاتے ہیں جو اللہ کا واسطہ دے کر اور اللہ قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔
سورہ انعام میں ایک اور عہد الہی کے ایفاء کی نصیحت کی گئی ہے فرمایا۔

﴿وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ وَصَّيْنَاكُمْ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ لِمَنْ كَفَرُوا بِهِ﴾ (انعام-۱۹)
اور اللہ کا قرار پورا کرو یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے تاکہ تم دھیان رکھو۔

اس عہد الہی میں اللہ کے وہ فطری احکام بھی داخل ہیں جن کے بجا مانے کا اقرار تم نے اللہ سے کیا ہے یا اللہ نے
تم سے لیا ہے اسی طرح اس نذر اور منت کو مشتمل ہے جس کو اللہ کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے اور انسانوں کے اس باہمی
قول و قرار کو بھی شامل ہے جو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کار سازی نے یہ موقع بہم
پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز کم ہوتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا
مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جاسکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے
باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی
اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے
لڑنے کی اجازت گودے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دو۔

﴿بِرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ فَسَبِّحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ
أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ﴾ (توبہ-۱۱)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا تو پھر لو (تم اے
مشرکوں!) ملک میں چار مہینے اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تمکنا نہیں سکتے۔

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ
داری نہیں رہی تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفاء عہد کی تاکید کی گئی جنھوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم

رکھا تھا فرمایا۔

﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوا كُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُصَاهَرُوا عَنْكُمْ أَحَدًا فَانْتُمْوَا إِلَيْهِمْ عَهْدُهُمْ إِلَىٰ مَدَّتِهِمْ إِنْ لَمْ يُحِثْ الْمُتَّقِينَ﴾ (توبہ-۱)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انھوں نے تم سے کچھ کی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کر دے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔

اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایقائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنھوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے۔

﴿كَيفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقِيمُوا إِلَيْكُمْ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِمْ إِنْ لَمْ يُحِثْ الْمُتَّقِينَ﴾ (توبہ-۲)

مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔

”سیدھے رہنے“ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا مندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفاء اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہ الہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (انعام-۱)

مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں

”وفو بالعہد“ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ“ اور اس قول میں تمام عقد مثلاً عقد بیع، عقد شرکت، عقد یمین، عقد نذر، عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہیں خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے۔“

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جھنے سے ہو

جاتی ہے، حسن عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔“ یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے ”حسن العهد من الایمان“ اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ حجر نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہیں تمہارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا، اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا ”عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسن عہد ایمان سے ہے۔“ یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسب توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے، اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے۔

﴿لَا دینَ لِمَن لَّا عہدَ لَہٗ﴾ (احمد، طبرانی و ابن حبان)
جس میں عہد نہیں اس میں دین نہیں۔

یعنی اس قول و قرار کو جو بندہ اللہ سے کرتا ہے یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے جس کے مجموعے کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا وہ دین کی روح سے محروم ہے۔



احسان یعنی بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیک کے کام کو محیط ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا جس کے احسانات کی حدود پایاں نہیں عرش سے فرش تک جو پہنچے وہ اسی کے احسانوں کی جہوہ نمائی ہے۔

﴿وَلَا تُغْنِ الْغِنَىٰ وَالشَّرْهَ عَنْ الْإِنْسَانِ لِصُومَةٍ كَفَّارًا﴾ (سورہ بقرہ: ۲۱۷)

اور گرنے کے احسان گو توں کو پور نہ گن کو گئے بے شک انسان بے انصاف ناشکرا ہے۔

حضرت یوسفؑ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر ان کو قید خانہ سے نجات دی اور وہ ان کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔

﴿وَقَدْ أَحْسَنَ بِي ذَٰلِكَ الْخُرُوجَ مِنْ لَسْتُمْ مِنْ لَدُونِ﴾ (یوسف: ۲۱)

اور اللہ نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا۔

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفت محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے فرمایا۔

﴿أَحْسَنَ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ بَنِي﴾ (قصص: ۱۸)

تو احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا۔

اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر ادا بدلہ داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو امن گیر ہے احسان حسن سوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے اور قرآن مجید میں جا بجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے چنانچہ سورہ نحل میں حکم کی صورت میں ہے۔

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَرْفَعُ الْغُلَامَ وَبَنَاتٍ ذِي الْقُرْبَىٰ﴾ (سورہ نحل: ۱۵)

اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہیں کرتا وہ ہر ایک کو اس کا واجب حق دے دیتا ہے

اس موقع پر ایک اور بات خیال میں رہے عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنے کے ہیں۔
رو میں جن معنوں میں ہم احسان کا غلط بولتے ہیں عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں ایسی بات کے صلہ کے ساتھ ہوگا قرآن پاک میں جہاں جہاں محسن یا محسنین یا محسنون کے لفظ بلا صلائے ہیں ان سے حسب موقع احسان کرنے اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لیے جائیں گے۔ اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے ﴿لَا يُضْلِعُ الْحَمِيمُ﴾ (توبہ: ۱۵) بے شبہ اللہ اچھے کام کرنے والوں کی ضروری برباد نہیں کرتا۔ ﴿وَأَنْتَ سَيِّدُ الْكَرَّةِ فَاصْبِرْ﴾ (زمر: ۶) کاش اگر میرے لیے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا۔ ﴿وَاللَّهُ نَحْتُ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران: ۱۳) اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدا کے ساتھ اس کا ذکر کیا پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا لیکن احسان مالی امداد کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ ماں قرابت دار یتیم محتاج قرابت دار پڑوسی اجنبی پڑوسی آس پاس کے بیٹھنے والے مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء کی ایک آیت میں (رُوح ۵) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔ (بقرہ ۹۰، زخرف ۷، انعام ۱۶، اسرا نکل ۳)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا۔

﴿وَإِحْسِنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ (قصص-۸)

اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں۔

﴿وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ﴾ (یوسف-۱۱)

اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کئے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا، احسان کی اہم صورتیں ہیں اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں جن کو اللہ نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کا م تھا جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو فرمایا

﴿الطَّلَاقُ مَرْثٌ فَإِذَا مَسَّكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيعٍ﴾ (بقرہ-۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دودفعہ (کر کے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یہ تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کرو اور اس کی ادائیگی میں لیت و لعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو فرمایا۔

﴿مَنْ عَفَى لَهٗ مِنْ أَخِيهِ شَيْءً فَاتَّبَاعُ الْمَعْرُوفِ وَادَاءُ إِلَيْهِ بِالْحُسْنِ﴾ (بقرہ-۲۳)

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جز (قصاص) معاف کر دیا جائے تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث

مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خون بہا کا) ادا کر دینا۔

قصور داروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی اللہ کے محبوب بندوں میں ہوں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران-۱۱۳)

اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے تو شوہر پر نصف لے مہر واجب ہوتا ہے یہ تو قانون ہوا مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسن خلق ہے اور شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں تو یہ مرد کا حسن خلق ہے اس کے بعد رشد ہے۔

﴿وَلَا تَسْأَلُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ سَمَاعُ تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (بقرہ-۳۱)

اور آپس میں فضل مت بھلوئے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے تو بھی احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں فرمایا۔

﴿وَلَا يَأْتِلْ اُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُؤْتُوْا اُولٰٓئِی الْقُرْبٰی وَالْمَسْكِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِيَعْفُوْا وَلِيَصْفَحُوْا﴾ (نور-۳)

اور تم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں وہ قرابت داروں، غریبوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں ان کو چاہئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک جامع لفظ ”معروف“ کا استعمال کیا ہے یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو معروف میں داخل ہے قرآن کریم کا حکم ہے۔

﴿وَامُرْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (آف-۲۳)

اور نیکی کرنے کو کہہ۔

اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

﴿كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ﴾

ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب و امیر کی تخصیص نہیں بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے اسی لیے آپ

۱۔ یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔

۲۔ سعید سے روایت ہے ”آپس میں فضل کو مت بھلو“۔ یعنی ”احسان کو مت بھلو“ ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر۔

۳۔ کشاف زحشری تفسیر آیت مذکور بعضوں نے یہاں ”فضل“ سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا۔

نے فرمایا کہ ”ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے“ صحابہ نے عرض کیا کہ ”اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے“ فرمایا ”کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے“ صحابہ نے عرض کیا کہ ”اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے“ فرمایا ”غریب حاجت مند کی اعانت کرے“۔ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے؟ فرمایا ”نیکی کے کرنے کا حکم دے“ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے ارشاد ہوا کہ ”برائی سے باز رہے کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے“ اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ ”آدمی اپنے اہل و عیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے۔“ ۱۔

اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ ”بر“ کا استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے۔

﴿لَا يَسْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الذِّبْصِ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُحِرْجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَنْصُرُوهُمْ وَتُقْسَطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (نحۃ: ۲)

جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکال ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو اللہ تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صحابہ میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمھارا نہیں میرا کام ہے تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہئے تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا“ ۲۔ ارشاد ہوا۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُفْقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسُكُمْ وَمَا تُفْقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُفْقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ الْيُكْمَ وَأَنْتُمْ لَا تَطْلُمُونَ﴾ (بقہ: ۳۷)

تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے اور تم جو دو گے خیرات سوا اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمھارا حق مارا نہ جائے گا۔

گویہ احسان کی ایک خاص صورت ہے مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار ہے جو نیک کام کریں گے ان کو اللہ کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی ارشاد ہوا۔

﴿هَلْ خِرَاءُ إِلَّا خُسَانُ إِلَّا خُسَانُ﴾ (رحم: ۳)

بھلائی کا بدلہ کیا ہے مگر بھلائی۔

گویہ آیت پاک اپنے سبق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صلیفۃ مع فتح الباری۔

۲۔ ابن جریر وابن کثیر بحوالہ نسائی۔

۱۔ یہ آیت سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہٹا کرنا ہے، دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے انسان کو عبادت پر اس قدر توجہ دینا اور تنگدست مقرضوں کو مہلت دینا جو قرض کرنے سے باہل مجبور ہوں ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔

حرب میں سو خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقرضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے۔

﴿وَإِذَا كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ لِّهِ مِيسِرَةً ۖ وَإِن تَصَدَّقُوا حَبِيرًا لَّكُمْ﴾ (بقرہ ۲۸۰)

اور (کوئی) تنگدست (تمہارا مقرض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر کچھ تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرض بھی) بخش دو۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ "قیامت کے دن میں جو تین آدمیوں کا فقیہ ہوں گا جن میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔" ۱۔ اس کو اور بھی مؤید کر دیا اور قرض کے معاملے میں تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں، یعنی مہلت دینا قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ ساتھ قضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوائے کسی اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو نبی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقرض تنگدست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگزر کرو شاید اللہ ہم سے بھی درگزر کرے چنانچہ اللہ نے اس کے صلہ میں اس سے درگزر کیا دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں فرشتوں نے کہا ذرا یاد کرو اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اگر مقرض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں آسانی کرتا تھا اور اگر تنگدست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یہ کہ فراخ دست مقرض کو مہلت دیتا تھا اور تنگدست کا قرض چھوڑ دیتا تھا۔ ۲

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے ۳۔ یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ سے ساتھ آئی ہے۔ جو شخص اپنے قرض کو مہلت دے گا یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔ ۴

۱۔ بخاری کتاب البیوع باب الممن باع حرام مع فتح الباری۔

۲۔ مسند ابن حنبل باب فضل نظر المقرض۔

۳۔ مسند ابن حنبل باب فضل۔

۴۔ مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۸۔

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے۔ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے۔ زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول سے اوروہ تنگ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ تو تمہیں کسی اور کسی شے علیٰ علم سے سب سے (جان سے) مارتا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو۔ کسی چار کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ رونا چھہرے کو خوب تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔“ ۱۔

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہئے محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر پوچھا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ میں کسی شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا تو کیا جب اس کا گزر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی بیعت ضعیفی کا بدلہ یہی دوں“ فرمایا ”نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔“ ۲۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ”ایسے نہ ہو کہ خود تمہاری رُہ کی عقل نہ ہو صرف دوسروں کی دیکھ دیکھی کام کرو رہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے۔ بد اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔“ ۳۔

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تموں یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت و نہیں دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوتی ہے۔ حضرت براء بن عازبؓ بھی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے بہشت نصیب ہو ارشاد ہوا ”تمہاری تقریر جو مختص ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ۔“ اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں فرمایا ”نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگا تار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھادو اور پیاسے کو پلاؤ اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔“ ۴۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے فرمایا ”جو روزی اللہ نے دی اس میں سے دوسروں کو دے“ عرض کی ”اے اللہ کے رسول اگر وہ خواہ مخفس ہو“ فرمایا ”اپنی زبان سے نیک کام کرے“ عرض کی ”اگر اس کی زبان معذور ہو“ فرمایا ”مغلوب کی مدد کرے“ عرض کی ”اگر وہ ضعیف ہو مدد کی قوت نہ ہو“ فرمایا ”جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے“ عرض کی ”اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو“ فرمایا ”اپنی ایذا رسانی سے دُور رہنا چاہئے رکھے۔“

۱۔ صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح۔

۲۔ جامع ترمذی باب ما جاء فی الاحسان والعفو۔

۳۔ جامع ترمذی ایضا انظار المعسر۔

۴۔ مستدرک حاکم ج ۲ کتاب الکاتب۔

عفو و درگزر

عفو و درگزر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سوئی پڑ جائے اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عفو (درگزر کرنے والا) عاف (عفو کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ﴾ (شوری-۳)

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کر دے یا ان کو معاف کر دے فرمایا۔

﴿أَوْ يُؤَيِّسُ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ﴾ (شوری-۴)

(اگر اللہ چاہے تو) گنہگاروں کو ان کے کرمات کے سبب تباہ کر دے اور بہتوں کو معاف کر دے۔

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے۔

﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى﴾ (طہ-۴)

اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے پھر راہ پر

رہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو عاف (بخشنے والا) پانچ دفعہ عمار (بڑی بخشش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عمو (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں عمو (بخشنے والا) کہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو و درگزر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے اللہ نے اپنی ساری صفوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے۔ فرماتا ہے۔

﴿وَتَعْفُوا عَنْ سُوءِ فَإِنَّ اللَّهَ تَكَانَ عَفْوَافٍ ذِي رَحْمَةٍ﴾ (نساء-۴۱)

ایسی برائی کو معاف کرؤ تو بے شک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا۔

نسان اگر یہ کسی قصور وار کو معاف کرتا ہے تو اس کی قدرت بہر حال کامل نہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارے کی مجال نہیں وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصوروں کو معاف کرنا کتنا زیا اور سزاوار ہے تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہم بھی اپنے قصور واروں کو معاف کریں۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصور واروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے فرمایا

﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِشُّونَ أَنَّ يُعْذِرَ اللَّهُ نَحْمَ وَاللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (دور-۳)

اور چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا

تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حبان۔

مہر والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو غنودہ گزر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تمہیں معاف کرے گا اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابر کرم کی کچھ تصنیفیں پڑنی چاہئیں چنانچہ جن مومنوں کے لیے اللہ نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے۔

﴿وَإِذَا مَا غَضُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ (شوری-۳)

اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا غصہ کی حالت میں جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے مگر وہ اپنی بات پراڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا وَتَرْهُمْ يَنْصُرُونَ الْبُيُوتَ وَهُمْ لَا يَنْصُرُونَ﴾ (حد العفو وَاْمُرُ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْخٰهِلِيْنَ) (الاعراف-۲۳)

اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں (اے پیغمبر) درگزر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔

کیونکہ ایسے موقع پر دوسری صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر یا جائے یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں ان ناگوار یوں کو برداشت کیا جائے اللہ نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگوار یوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دے۔

﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ السِّيْفَةِ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ﴾ (مومن-۶)

(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کہ جو بہت ہی چھا ہو جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے جب کچھ لوگ ن لوگوں کو بھی سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں لیکن اللہ نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو غفور و رحیم کا حکم دیا ہے۔

﴿وَدُكْثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكُتُبِ لَوْ يَرُدُّوْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ نَفْسِهِمْ

مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاَعْفُوا وَاَصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ النَّاسُ بِاَمْرٍ ؕ﴾ (۲۰۰)

(مسئلہ نو!) کثرتِ کتاب باوجود یہ کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دینِ سدی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بتادیں تو معاف کرو اور درگزر فرمادیں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔ اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے اگر غصہ در نے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہئے کیونکہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزاء و سزا کے قائل ہو اس لیے سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا فرمایا

﴿قُلْ لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ لَا يُرْمَوْنَ فِيهَا مِمَّا كَانُوا يُكْسُونَ مِنْ عَمَلٍ صَالِحٍ خُفِّفْ عَنْهُمْ وَمِنْ أَسَاءَ فَعْنِيَ اللَّهُ إِلَهِي رَتَّكُمُ تَرْجَعُونَ﴾ (بقرہ: ۱۲۵)

ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزاء و سزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں تاکہ ان لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھٹے کے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو غصہ و درگزر کی نصیحت فرمائی (تفسیر: ۱۰۰)۔

غصہ و غصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے لیکن اس حالت میں بھی

۱۔ اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے غصہ و درگزر کی نصیحت ہے نہ مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے جہاد کے حق میں غصہ و درگزر کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم و غصہ و درگزر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے اور سب سے پہلی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصحیح کی ہے لکھتے ہیں "اس آیت (و غرض عن سبهم) میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بد اخلاقی پر صبر کریں اور ان کی باتوں اور مبینہ جھوٹوں کا جواب ہی قسم کی باتوں اور جھوٹوں سے نہ دیا جائے اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی بدست نہیں بلکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں اور جب دونوں باتیں یک ساتھ ہو سکتی ہیں تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں بلکہ غلطی پرست مفسرین کی ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں" جلد ۴ صفحہ ۳۹۶

ایک اور آیت (دفع سنی ہی احسن) کی تفسیر میں لکھتے ہیں "کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے"۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین و اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو" جلد ۶ صفحہ ۳۰۰

آیت و ادحہم سبہم سبہم سبہم اسلام کی تفسیر میں فرماتے ہیں "کلی اور ابولعلیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا" لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ اجتماع سے چشم پوشی کرنا ویران کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے اور عزت و آبرو اور پرہیزگاری کی سداستی باعث ہے۔ جلد ۶ صفحہ ۳۹۷ طبع دار المطبعتہ العامۃ مصر۔

آیت یعمروا اللہیں اموا (جاوید) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر غصہ و کرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا جائے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

اسلام نے غفور و درگزر سے کام لینے کا حکم دیا ہے چنانچہ حضرت مسیحؑ حضرت ابو بکرؓ کے رشتہ دار تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہؓ کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کی مدد اور بند کر دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَلَا يَأْتِلُ أُولَؤُلَا الْفَصْلُ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولَؤُلَا الْقُرْبَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۚ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (۳-۲۰)

اور تم میں سے جو لوگ صاحبِ حسن اور نکشش والے ہیں قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ (چاہئے کہ ان کے قصور) بخش دیں اور درگزر کریں (مسلمانو!) یہ تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور کو معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کے آخری ٹکڑے سے ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگزر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَحِبَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۚ الَّذِينَ يُسْقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَافِئِينَ الْعِطْيَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران-۱۳)

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف نپکوجس کا پھیلنا (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان (کا پھیلنا) جی سبائی) ان پر بیزگاریوں کے لیے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگ دستی (دونوں حالتوں) میں (اللہ کے نام پر) خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگزر کرتے ہیں اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہ اللہ میں دینا اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حصہ)

جائے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو غفور و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑ نہ کیا جائے اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگزر کیا جائے (جملہ ۷ صفحہ ۸۴ طبع مذکور) میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصور و روں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق عباد ہیں یعنی وہ مسلمانوں کا اپنی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیان الہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو نہیں ہے حاصل نہیں اور قتال و جہاد حقوق الہی کے مقابلہ میں شروع ہوا ہے اس لیے جہاد کی باتیں اس مغفرت اور غفور و درگزر کے خدائی احکام میں غفلت انداز نہیں اور منثور میں ابن عباسؓ سے حضرت بوسم خورانی صحابیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے (ج ۶ صفحہ ۳۹ مصر)

درگزر کرنا اور ان کے لیے دو جزائیں ایک اللہ کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت بیان کی گئی ہیں اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو جنت ہے جس کی حدود پایاں آسمان و زمین ہے اور غصہ کو روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ اللہ کی مغفرت ہمارے شامل حال ہوگی اور وہ اعظم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

غفور و گزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جز شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور ناتوانی پسندی کے مترادف ہو جائے اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ اسلام نے غفور و گزر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خود داری کی شان بھی قائم رہتی ہے۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ﴾ وَخِرَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٍ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَمَا وَاَصْلَحَ فَاجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (شوری-۴)

اور جو ایسے (غیر متحمل) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی اس پر (بھی) جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے اور غفور و گزر افراد کا اخلاقی کمال ہے جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں غفور و گزر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے جس کی مزدوری کی ذمہ داری اعظم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب پہلے ظلم کر بیٹھیں یا وہ ہوں جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد غفور و گزر خود داری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتغال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر غفور و گزر کرتا ہے اسی لیے فرمایا۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (شوری-۴۳)

اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیوں کر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے۔

﴿وَلَا تَسْتَوِ الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ إِحْسَنِ فَإِذَا الدُّنْيَ بَيْنَتْ وَبَيْنَهُ عِدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۚ وَمَا يُنْقِهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُنْقِهَا إِلَّا ذُو حِطِّ عَصِيمٍ ۚ وَأَمَّا يُرْعِثُ مِنَ الشَّيْطَانِ نَرْعٍ فَاستَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (سجده-۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست ہے نالتے والا اور یہ بات متی ہے انہیں کو جن میں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے

س کو جس کی بڑی قسمت ہے اور اُس (اس میں) شیطان کے کوٹنے سے کوئی کوچہ تجھ کو گم نہ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔

آیت کے اخیر لکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگزر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے وہ شیطانی کام ہے اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا۔

”اللہ نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفو و درگزر کا حکم دیا ہے جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا“ ۱۔

ابو مسعود صبیہؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ’جان لو جان لو مڑ کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ اللہ کو تم پر ہے ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور ﷺ سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے اس نے پھر یہی پوچھا تب آپ نے فرمایا ”ہر روز ستر دفعہ“ ۲۔ اس سے مقصود نبوی تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفو و درگزر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگزر سے ان کے رعب و داب اور وقار میں فرق آجائے گا لیکن یہ خیال صحیح نہیں انتقام سے کو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے مگر اس سے کسی پائیدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا یہ چیز عفو و درگزر ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ ۳۔

﴿وَمَا زَادَ اللَّهُ رَجُلًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا﴾

اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگزر کرتا ہے نہیں بڑھاتا ہے مگر عزت میں۔



۱۔ ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

۲۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی ادب الخادم میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔

۳۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی التواضع۔

حلم و بردباری

حکم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصور وار سے اس کے لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے یہ قدرت سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے انتقام نہیں لیتا اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حکم کے ساتھ متصف کیا ہے اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حکم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے فرمایا۔

﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (بقرہ-۲۸ مائدہ-۱۳)

اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (آل عمران-۱۶)

بے شک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

﴿إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾ (سراکل-۵ مائدہ-۵)

بے شک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حکم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر کر دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی شان غفاری کا نتیجہ ہے۔ دوسری جگہ حکم کے ساتھ اپنی صفت علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَلِيمٌ﴾ (نہ-۲)

اور اللہ ہے جانتے والا بردبار۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَعَزِيزٌ حَلِيمٌ﴾ (حج-۸)

بے شک ہے اللہ جانتے والا بردبار۔

﴿وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا﴾ (احزاب-۶)

اور ہے اللہ جانتے والا بردبار۔

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے۔

﴿وَسِعَتْ عِزِّي حَلِيمَةً﴾ (بقہ-۳۶)

اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے اس لیے یہ ظاہر فرما دیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے مثلاً انتقام کے مقابلہ میں حکم اگر اس برائی

کرنے والے کو رام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے لیکن اللہ کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم کو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں ان میں سرشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا اس لیے اس نے اپنے حلم اور دارویر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو فرمایا۔

﴿وَاعْمَلُوا إِنَّ اللَّهَ يُعَلِّمُ مَا هِيَ أَنْفُسُكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْمَلُوا إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ حَنِيمٌ﴾ (۳۰-۱۱)

اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا ہے اور عتاب کرنے والا۔

یہ آیت عورت کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں ہے یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اس سے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے اس لیے اس سے پر امید بھی رہنا چاہئے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے اس موقع پر اس کا ارشاد ہے۔

﴿لَنْ نَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضَعِفَهُ لَكُمْ وَيَعْمَلْكُمْ وَتَهُ شُكُورٌ حَنِيمٌ﴾ (۲۰-۱۱)

اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دو گنا کر دے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ ہے قدر دان اور تحمل والا۔

اس کی قدر دانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے کسی قصور وار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے یا اس میں ایک عیب ہے مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگزر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگزر کرتا ہے۔

صفت حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الہی سے بچ جائے انہوں

نے اس کا فریاد کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سرشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہوگئی اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيمَ لَانِیْهِ اِلَّا عَنْ مُّوْعَدَةٍ وَّعْدٰهَا اٰیٰهٗ فَلَمَّا نَسَبَ لَهٗ اَنَّهُۥ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّآ مِنْهُ اِنْ اِبْرٰهٖمَ لَآ وَاَهٗ حَلِیْمٌ﴾ (توبہ-۱۳)

اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا، لیکن، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے لیا تھا پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے بے شک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود اللہ سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوط کی بردباری کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهٖمَ لَحَلِیْمٌ اَوْ اَهٗ مُّثِیْبٌ﴾ (صافات-۷)

بے شک ابراہیم بردبار نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر و غفور درگزر و رفق و ملامت اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توصیف میں صبر کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف میں اواہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صبر کے لیے غفور درگزر اور رفق و ملامت لازمی ہیں۔ لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیلؑ کی نسبت فرمایا ہے:

﴿فَسَّرْنٰہٗ بِعِلْمٍ حَلِیْمٍ﴾ (الصافات-۱۰)

تو ہم نے ان کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بردبار کے (اسماعیل سے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی۔

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا ہے:

﴿یٰۤاَبَتَ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (الصافات-۳)

اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تعمیل کیجئے انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر علم کا ایک ضروری جزء ہے۔ علم کی صفت اللہ کو نہایت محبوب ہے چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے یعنی علم اور جہد بازی نہ کرنا۔ یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہئے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ "غصہ نہ کرو" اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

”پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پھنسا دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے“ ۱۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ”جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا۔“ ۲۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملتا ہوں، ۳۔ وہ کاٹتے ہیں میں بھلائی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ ”اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی۔“ ۴۔



۱۔ بخاری کتاب الادب باب الخذر من الغضب۔

۲۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی کثرة الغضب۔

۳۔ یعنی صلہ رحم کرتا ہوں۔

۴۔ صحیح مسلم باب الرحم وادب المفرد، ام بخاری باب فضل صلہ الرحم۔

رفق و لطف

رفق و لطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ جو بات کی جائے نرمی سے جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مٹا دیا جائے وہ جتنی طرح سے کہوں و موموں کے لئے اور پھر کو بھی موم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو ”لطیف“ فرمایا ہے۔ اور حدیثوں میں اس کا نام رفق آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق و لطف فرماتا ہے اور اپنے اس تطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بسانِ ممان جس طرح امارت سے رتبہ تک پہنچایا اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم و شرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں:

﴿لَا رَفَقَ لَطِيفٌ تَعَالَى اللَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ (یوسف - ۱۰)

بے شک میرا رب ہف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے بے شک وہی سمجھتا اور حکمت والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں ان کی حکمت کو اللہ ہی جانتا تھا اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رفق و لطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

﴿لَهُ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَهُوَ يُعْطِيهِمْ وَهُوَ يُعْطِيهِمْ وَهُوَ يُعْطِيهِمْ﴾ (شوری - ۲)

اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے۔ یہ آیت ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطف الہی کافر و مومن دونوں کے ساتھ ہے کہ دونوں کو یکساں وہ رزق

۱۔ رغب صفحہ ۱۱ ”لطیف“ کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں وہ اپنے بندوں کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے (لفظ لطف) امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں۔ ”اللہ کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے۔ لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصیحتوں کا سامان فرہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ ابن العربی کا قول ہے ”لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک مدت (رفق) سے پہنچاتا ہے۔ صفحہ ۷۳ ان آباد۔“

۲۔ مامغزوں کہتے ہیں اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصیحتوں کو جاتا ہے پھر ان کو نرمی کے طریق سے سختی سے نہیں اس تک پہنچاتا ہے جس کے حق میں وہ مفید ہیں۔ جب عمل میں نرمی اور رُک میں بھلائی ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے (روح المعانی تفسیر شوری)

۳۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الرفق۔

پہنچتا ہے اور اسی لیے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطاف ہے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملت ضیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طلب ہوئے تو بارگاہ الہی میں گویہ دعا مستجاب نہ ہوئی، مگر ابراہیمؑ ضعیف کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا۔

﴿إِنِّ اِبْرٰهٖمَ لَآوٰةٌ حَلِیْمٌ﴾ (توبہ-۱۳)

بے شک ابراہیم نرم دل بردہار تھے۔

اسی طرح جب وہ قوم لوط کی گنہگار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی کو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

﴿إِنِّ اِبْرٰهٖمَ لَحَلِیْمٌ اَوٰةٌ مُّنِیْبٌ﴾ (موم-۷)

بے شک ابراہیم بردہار نرم دل حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

اواہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعا میں مانگتا ہو دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے اور تیسرا دردمند کہتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں وہ ہر شخص کی دعائے کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے وہ دردمند تھے اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے یا دل کے نرم تھے اس لیے جلد پہنچ جاتے تھے اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملت ضیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰ اور ہارونؑ فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں۔

﴿فَقُوْلَا لَهُ قُوْلًا لَّیْسَا لَعْلَہٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَحْشٰی﴾ (طہ-۲)

سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا شاید وہ نصیحت پائے یا (اللہ سے) ڈرے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لیے دین ضیف کے مبلغ اعظم اور توحید کے داعی اکبر محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمت الہی نے خاص طور سے اس کا حصہ وافر عنایت فرمایا تھا۔ خود حضور ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے۔

﴿فَمَا رَحْمَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ لَئْسَ لَہُمْ وَلَوْ کُنْتَ فِظًّا غَیْظَ الْقَلْبِ لَا نُفْصِیْہَا مِنْ حَوْلِکَ﴾ (آل عمران-۱۰۱)

تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تترہتر ہو گئے ہوتے۔

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے تاکہ لوگوں کو اس کی تعظیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقہ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمت عالم ﷺ کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں

۱۔ تفسیر روح المعانی میں مقل کا یہی قول ہے صاحب روح المعانی اور مامون خرازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت پر ہمدردی کے بعد اس سے اپنی شکایت ظاہر فرمائی۔

طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ صم و برد باری، غنود و درگزر، چشم پوشی اور خوش خمتی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شان جمالی پائی جاتی ہے یہی رفق و خلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے۔ جس طرح فطرت زینت و آرائش سے دو بالا ہو جاتا ہے اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دو چند ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی فرمایا۔

﴿اِنَّ رَفِيقَ لَا يَكُوْنُ مِثْلَ شَيْءٍ اِلَّا رَاهُ وَلَا يَسْرِعُ مِثْلَ شَيْءٍ اِلَّا شَاهَهُ ۝﴾ ۱

نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بد نما بنا دیتی ہے۔
 ”جس چیز“ کا لفظ کتنا عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور سختی بگاڑتی ہے الایہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ نرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔“ ۲ جریر بن عبد اللہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا۔“ ۳ اور فرمایا کہ ”تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی اللہ اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔“ ۴

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ ﷺ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی۔

﴿اِلَّا احْسِرْ كَمَا يَحْسِرُ بِحَرَمِ عَمِي النَّارُ وَنَحْرُ عَمِي النَّارُ عَمِي كُلُّ قَرِيبٍ هَبْنِ سَهْلٍ ۝﴾ ۵

یہ میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو نرم ہو اور آسان ہو۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ ”السام علیکم“ یعنی تم کو موت آئے حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب میں کہا ”وعلیکم السام واللعنۃ“ یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ”عائشہؓ ٹھہر جاؤ اللہ تمام کاموں میں نرمی پسند کرتا ہے۔“ بولیں یا رسول اللہ انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا کہ ”علیکم یعنی تم پر“ ۶

آنحضرت ﷺ کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی مگر اس میں سختی کا نشان نہیں اور پھر اس طرح

۱ صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

۲ صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

۳ صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

۴ ترمذی ابواب الزہد۔

۵ یضاً۔

۶ بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کل۔

سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدودِ الہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھنے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع و قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (تہ ۲)

اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔

دوسری جگہ فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَبُوءُ لَكُمْ الْكُفَّارَ وَيُجَادِلُكُمْ غِلْطَةً﴾ (تہ ۶)

اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہئے کہ وہ تم میں نزاعیں پائیں۔

اسی طرح شریعت کے تنہا گاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کے اجراء میں نرمی نہ برتیں مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (ور ۱)

اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

آنحضرت ﷺ کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا البتہ جب احکامِ الہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے۔“ ام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کے ذرائع ”مطہرات تک پر کسی کی بات میں سختی برتی ہے۔“ حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں۔

”گو امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکلیفوں پر صبر

کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے لیکن اللہ کے حق میں آپ اس قدر سختی سے کام لیتے تھے جس کا اللہ

نے حکم دیا تھا“ (فتح الباری ص ۱۰۲۹)

آنحضرت ﷺ صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ ”آسانی کرو سختی نہ کرو۔“ شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ توافل و مباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے۔ ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی منطی ہوئی انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے

۱ بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یروا ولا تعسروا۔

۲ باب ما يجوز من الغضب والعقد لا امر الله تعالى۔

۳ صحیح بخاری کتاب الادب باب یروا ولا تعسروا۔

حضور کی خدمت میں سے چھوٹا سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چھنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیسے ہی خدمت نبوی میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی۔ ارشاد ہوا ”کہ ایک غلام کی گردن آزاد کرو“ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ ”یا رسول اللہ ﷺ اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں“۔ فرمایا ”لگاتار دو مہینے روزے رکھو“۔ گزارش کی کہ ”یا رسول اللہ ﷺ روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی“ پھر روزہ رکھوں“ فرمایا ”ساتھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ“ عرض پرداز ہوئے کہ ”قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری ہے“۔ فرمایا کہ ”صدقہ سے فداں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو اس سے ساتھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو بیچ رہے وہ خود کھاؤ“۔ وہ صبحی ہنسی خوشی اپنی قوم میں واپس آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ ”میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔“ لے



تواضع و خاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (بایہ ۱۰)

اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔

اس سے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اختیار کریں اور عاجزی و فروتنی برتیں۔

تواضع و خاکساری کے بہت سے مظہر ہیں قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے مثلاً رسول اللہ ﷺ کو پہلے کفار سے درگزر کا پھر مومنوں کے ساتھ محبت تواضع کا حکم دیا ہے۔

﴿وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (حجر-۶)

اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

﴿وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (شعراء-۱۱)

اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے۔

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔

﴿وَاحْفَظْ لَهُمَا جَنَاحَ الذِّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل-۳)

اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو مہر و محبت سے جھکا دے۔

”حفص حساح“ یعنی بازو جھکا دینا تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے۔ جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازو کو جھکا دیتا ہے۔ اس سے یہ استعارہ لے لیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبر اور ترفع کی بندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاصَمَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا

سَلَامًا﴾ (غفران-۶)

اور رحمت والے (اللہ) کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے

(جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے اللہ کے بندے کہہ کر نصیحت

فرمائی گئی کہ اللہ جب رحمت اور مہر و رحمہ راہ سے تو اس کے بندوں میں خلق اللہ کے ساتھ تواضع اور مفساری ظاہر ہو۔
حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی۔

﴿وَلَا تُصَغِّرْ حَدَّكَ لِلسَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾
وَالْفَصْدُ فِي مَثَبٍ وَاعْظُضْ مِنْ صَوْتِ الْإِنِّ أَنْ تَكُونَ الْأَصْوَاتُ نَصُوتُ الْحَمِيرِ ﴿۲﴾ (تہذیب) (۲)
اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اتر کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا اور
اپنی رفتار میں مینہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بری سے بری آواز
گدھوں کی آواز ہے۔

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے زمین
پر اتر کر نہ چلا جائے چال و حال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور برکتی ہو۔

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع و خاکساری اور دنائت و پستی میں بڑا فرق ہے۔ تواضع و خاکساری کا منشا یہ ہے
کہ انسان میں بہر و غرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دنائت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل
اغراض کے لیے انسان اپنی خودداری کو کھودے۔ چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو
وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خود ارادہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے۔ صحابہ جب عمرہ کے لیے آئے تو چونکہ مدینہ کے
وہابی بخاری نے ان کو کمزور کر رکھا تھا اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمد اور ان کے اصحاب "ضعف" کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف
نہیں کر سکتے اس پر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اتر کر کریں تا کہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا
اظہار ہو۔ ۱

تو تے اظہار کا اصلی موقع جہاں میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور و
پسند یہاں ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور و اتنا پسند اور بعض کو پسند کرتا ہے جنگ و صدقہ کے موقع پر اترانا اتنا پسند
ہے اور ظلم و فخر پر اترانا پسند۔ ۲

بہر حال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے اور ضعف ذات بیچارگی اور بے سرو سامانی سے مختلف ہے
ضعف ذات سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے لیکن خاکساری اس کو بندرتبہ بنادیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ
"جو شخص اللہ کے لیے خاکساری کرتا ہے اللہ اس کو بند کر دیتا ہے۔" ۳ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "جو شخص عمرہ
پنہ سے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو اللہ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے
بارے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو صلہ پسند کرے اس کو پہن لے۔" ۴

۱۔ مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف صحیح بخاری عمرة النبی ﷺ۔

۲۔ ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔

۳۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی التواضع۔

۴۔ ترمذی ابواب الزہد۔

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دوست کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تا کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔“ اے اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہئے۔



خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو ملحوظ رکھنے تاکہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مزوت اور محبت بڑھے۔ سلام کرنا، شکر یہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا، اس کو قرآن پاک میں بھی دہرایا ہے:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بقہ۔ ۱)

اور کہو لوگوں سے اچھی بات۔

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے۔ ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے، ارشاد ہے۔

﴿وَقُلْ نَعَادِي يَقُولُوا اَنتُنَّ هِيَ احْسَنُ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَرْفَعُ سَهْمَهُ اِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ

عَدُوًّا مُّبِينًا﴾ (بنی اسرائیل۔ ۶)

اور اے (پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان بھڑپاتا ہے آپس میں بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور بد گوئی و بد کلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے۔ وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے۔ اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہئے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے بچہ میں کہیں، اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر و محبت پیدا ہو۔ اسی لیے تیسارو، مالا، القاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے۔ کسی کو یا کافر یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخفی طلب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھنا چاہتے ہیں، پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے، فرمایا۔

﴿وَلَا تَسْمُرُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَرُوا بِاللِّقَابِ بَنَسْ لَا سَمَ فُسُوفِ عَدِ لَا يَمَانِ﴾ (ت۔ ۲)

اور نہ تم آپس میں یک دوسرے کو طعن و ذر نہ نہ کرنا، نام سے رپکارو، ایمان۔ بعد کنہکاری برائنام ہے۔

اسی لیے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے۔

﴿لَا تُحِبُّ اَللّٰهُ اَلْحَمْرُ سَا شَوْءٌ مِّنَ الْقَوْلِ اَلَا مِّنْ ضَمٍّ﴾ (ن۔ ۲۱)

اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے نہ لعنت بھیجتا ہے نہ بدزبانی اور تحش کلامی کرتا ہے۔^۱ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیے۔ اس کی زبان سے حق و صداقت، بہودی و خیر خواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے۔“^۲ اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ کلمہ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکتے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل کر رہے گی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا۔ پھر ارشاد فرمایا ”دوزخ سے بچو اگرچہ چھو ہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو“ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔“^۳

ایک دفعہ آپ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا ایک بدوی صحابیؓ مجلس میں حاضر تھے چیتا بنہ بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔^۴

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”اچھی بات صدقہ ہے۔“^۵ یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاتی ہے اسی طرح زبان کی منھاس سے اس کے زخموں پر پھار کھا جا سکتا ہے اور سچی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ نجات کیونکر ملے؟“ فرمایا ”اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔“^۶ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے؟ آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا ”اس کا ڈر ہے۔“^۷ کے

۱۔ صحیح بخاری باب طیب الکلام۔

۲۔ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

۳۔ ترمذی کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی اللہ۔

۴۔ ترمذی ما جاء فی قول المعروف۔

۵۔ صحیح بخاری کتاب الصلح۔

۶۔ ترمذی باب حفظ اللسان۔

۷۔ ترمذی ایضاً۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسرے کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہ کرام میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیئے، باغ دیئے، کھیت دیئے، اپنی مختوں میں ان کو شریک کیا۔ اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا، پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت ﷺ نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجرین کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح و ستائش کی۔ ۱۔

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْأَيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (حشر-۱)

اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجرین کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں اس پر جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجرین) کو دیئے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجرین کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بغل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔ ان ایثار کے پیکاروں نے عرض کی: جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہیں۔ فرمایا اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے۔ ۲۔

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی، آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو، آپ ﷺ نے اسی وقت اتار کر ان کے حوالہ کر دی، صحابہؓ نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی حاجت تھی اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے تم نے کیوں مانگ لی؟ بولے ہاں میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے۔ ۳۔

۱۔ صحیح بخاری اول مناقب انصار۔

۲۔ تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری۔

۳۔ صحیح بخاری اول باب مناقب انصار۔

۴۔ صحیح بخاری باب حسن الخلق و باب من استعد للفقير۔

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ کاشانہ نبوی میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص آج رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی۔ اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں، صرف بچوں کا کھانا۔ بولے بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔“ ۱

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے ۲۔ لیکن قرآن پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔



۱۔ صحیح مسلم کتاب الاثر باب اکرام المصیف وفضل ایثارہ صحیح بخاری تفسیر سورہ حشر۔

۲۔ ایضاً۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے۔ اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں کے افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو اُمّۃً وَّسَطًا بیچ کی امت کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے ان میں یہ بھی کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے۔ اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہوا رشاد ہے۔

﴿وَلَا تُجْهَرُ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافُ بِهَا وَاتَّبِعْ بَيْنَ ذَلِكَ مَسِيلًا﴾ (بنی اسرائیل - ۱۲)

اور تو نہ پکار اپنی دعا (نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے یا مخافت اس کو سن کر برا بھلا کہے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

ہماری چال کیسی ہو اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح میں ہے:

﴿وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ (لقمان - ۱)

اور چل بیچ کی چال۔

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زادوں کی نمائش چال بن جائے۔ ۱

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں، سارے مذہبوں نے اس پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹا سنے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک، تلنے کی نوبت آ جائے اور محتاجوں میں ایک سے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے فرمایا۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ بِيَدِكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا

مَحْسُورًا﴾ (بنی اسرائیل - ۳)

اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ (فرقان - ۶)

اور جو خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے۔

۱ تفسیر کبیر رازی آیت مذکور (بقرہ)۔

۲ - یری طبری (روح المعانی)۔

یعنی نہ اسراف ہونہ بخل ہو درمیان کی چال ہو۔
صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿اَكْلُوا مِنْ اَعْمَالِ مَا تَطْبِقُونَ﴾

اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو۔

”عمل“ کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز وغیرہ عبادتیں ہیں۔ ۱۔ مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخری دم تک نباہ سکو دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے۔
مسند بزار میں حضرت حذیفہؓ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ۲۔

﴿مَا احْسَنَ الْقَصْدَ فِي الْغَنَى مَا احْسَنَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ مَا احْسَنَ الْقَصْدَ فِي الْعِبَادَةِ﴾

دولت مندی میں درمیانی کتنی اچھی ہے محتاجی میں درمیانی کتنی اچھی ہے عبادت میں درمیانی کتنی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کہ انسان قارون وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان و شکوہ عز و جہ اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر غنی اور مبتذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھودیتے ہیں اور یہ بھی بے اعتدالی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہئے نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہئے۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گزر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔



خودداری یا عزت نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے اور جھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذات الہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے چنانچہ قرآن پاک میں بہتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عزیز لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت والا اور غالب کہیں کہیں عزیز کے ساتھ قوی (قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو۔ اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلبگار تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا۔

﴿اَيَتَّبِعُونَ عِزَّهُمْ اَلْعِزَّةَ فَاِنَّ اَلْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا﴾ (نہ-۲۰)

کیا ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِیدُ اَلْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ اَلْعِزَّةُ جَمِیْعًا﴾ (فاطر-۴)

جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔

﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾ (آل عمران-۳)

اے خدا تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد کو نکال دیں گے اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

﴿وَلِلّٰهِ اَلْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهِ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلَیْٰكِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (منافقون-۱)

اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے لیکن منافق نہیں جانتے۔

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی جھمی نہ جائے گی اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر

۱۔ عزت کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عز و شرف اور نخوت (حمیت) کی معنوں میں آیا ہے اس لیے ہر جگہ اس کے وہ معنی لیے جائیں گے جو سیاق و سباق کے مناسب ہوں اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے یہ ہے کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے و کھولسان العرب و مفردات راغب اصفہانی و ابن جریر طبری آیات عزت و سورہ بقرہ، نساء، ص، منافقون۔

باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہئے اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہئے اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہئے۔ تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہؓ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا تھا اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں ارشاد ہوا بیشک ایسا ہی ہے۔ عرض کی تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں؟ ارشاد ہوا میں خدا کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی رسول خدا ﷺ کی نظر اس کے بہت آگے تھی اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوہ خندق میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلہ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ دیا جائے گا، لیکن جب انصار کے سرداروں کو بلا کر آپ ﷺ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! جب ہم بتوں کو پوچھا کرتے تھے اور اللہ سے بے خبر تھے تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور کی بدولت ہم عزت پا چکے ہیں، ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں۔

صحابہ کرام جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسری کے مقابلہ میں صف آرا تھے ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسری کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا۔ مسلمان جب تک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مند یوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احسان رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران-۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لیے ظہور میں لائی گئی۔

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علیؑ سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے فرمایا غرور نہیں خودداری (عزت) ہے۔ یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ﴿ذَلِيلُ الْعَبْرَةِ وَإِرْسُؤُهَا وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (مائتوں) ایک مسلمان صالح بی بی کے کپڑے پرانے تھے تو بولیں کیا میں مسلمان نہیں؟ یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابو حفص سہروردی کہتے ہیں کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے اور غرور اپنی ذات کی اصلی

حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں۔^۱

یہ خودداری عین شرافت ہے جس میں یہ خودداری نہیں لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں۔ اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگزر کرنا پڑتا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے۔

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللُّغُومِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ (فرقان۔ ۶)

اور جب وہ ہونٹھیں یہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔

یعنی اس شریفانہ انداز رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاق خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے چال و حال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمائش کی یونٹ نہ آئے یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جزء شامل نہ ہو۔ یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جاسکتا ہے چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔^۲

اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے رنے نہ پائے کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھ جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا؟ ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا فرمایا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ اس نے کہا اونٹ بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں، ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔^۳

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہو سکتی ہے لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

﴿إِذَا سَمِعْتُمُ الْأَقَامَةَ فامشوا إلى الصلوة وعبثکم بسکینة وبقار ولا تسرعوا﴾^۴

۱۔ یہ اقوال امام رازی اور صاحب روع معانی نے سورہ منافقون کی آیت و سہ العرۃ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔

۲۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی الکبر۔

۳۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب والخلقان۔

۴۔ بخاری کتاب الصلوۃ باب الی الصلوۃ ولیاتہا بالسکینۃ والوقار۔

جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو۔

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے۔ مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا آہستہ چلنا نگاہ کا جھکائے رکھنا آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں ابو داؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

﴿الهدى الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من حمسة وعشرين جزء من النبوة﴾

نیک طور طریق، نیک انداز اور میانہ روی، نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔

کیونکہ ان ہی اخلاق خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دل کا ہے اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار و گفتار شکل و صورت وضع و لباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور و طریقہ اختیار کرے اسلام نے خصال فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا وقار۔ بولے خداوند میرے وقار کو اور بڑھا۔^۱

فقروفاقہ کی حالت یا حرص و طمع کے موقع پر انسان سے خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابل ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خدا تعالیٰ نے اصحاب صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَنُهُمُ الْجَاهِلُ أَعْيَاءٌ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ الْخَافًا﴾ (بقرہ ۲۷۰-۲۷۱)

(خیرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے۔ بے خبران کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے تو (ان کو دیکھتے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

اس آیت میں فقر وفاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے صاحب کشاف نے ﴿لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ الْخَافًا﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن امام رازی نے لکھا

ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ انکی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی 'اصحاب صفہ' صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لیے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پچھنے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔ ۱

سوال کی سب سے متزل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا" یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوا دی ہے چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا آپ نے دے دیا پھر سوال کیا اور آپ نے پھر دیا لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا۔ جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے خواہ مرگ ناگہانی کے ذریعہ سے خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔

روز مرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے لیکن کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھاؤ میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا اسی لیے کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ ایک بار رسول

اللہ ﷻ نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی ﴿لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا﴾ (تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا)

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی آپ ﷺ نے پہلے تو اس کو اجازت ہی نہیں دی پھر فرمایا کہ اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو۔ صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے ورنہ رفیق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں بیچ ہیں جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لیے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دناست اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہئے۔

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک و احتشام، تکلف و قنص اور جاہ و حشم کی نمائش کا نام نہیں بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اونچا کر دے کہ اگر وہ غریب و مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سر بلند رہے اور اگر وہ صاحب امارت و حکومت ہو تو اپنے رعب و دبدبہ کے لیے ظاہری نمائش چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جا رہے تھے جب شہر کے قریب پہنچے تو پہ سالار اسلام حضرت ابو عبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے پاؤں سے چری موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اور اسی شان سے اسلام کا فرمانبردار رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا حضرت ابو عبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں اونٹنی کی ٹکیل آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اے ابو عبیدہؓ اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر امت محمد ﷺ کے لیے عبرت بناتا

ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔ ۱



شجاعت اور بہادری

قَدِيرٌ (قدرت والا) قَادِرٌ، مُقْتَدِرٌ، قَوِيٌّ، جَبَّارٌ (جس کو کوئی پہچان نہ سکے) فَاہِرٌ جو ہر کسی کو بادے غالب اور عزیز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں۔ جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی و دہسانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم و ستم اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے اس لیے تعلیم محمدی نے بہادری و شجاعت کو سراہا اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہئے کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم و ستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کامیاب ہو سکے۔

ان مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور زرائعوں میں داور دائی دیں اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَجَيْسِ الْأَسْأِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (بقرہ-۲۲)

اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی متقی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو وہ زبان سے کہے یا نہ کہے اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے اور جب وہ ایسا کرتا رہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی القا کا مٹا ہے۔ ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا رَحُّوا فَمَا تُولُوهُمْ الْأَذْرَ﴾ (انفال-۲)

اے ایمان والو جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ”ایمان والے“ کہہ کر خطاب کیا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی ”ایمان“ مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔

﴿وَمَنْ يُولُوهُمْ يَوْمَئِذٍ ذُرَّةً إِلَّا مُحَرَّفًا لِّقَابٍ وَمَنْحَرَةً لِّى فَنَهْ فَقَدْ - مَعْصَبَ مَن سَهْ

وَمَا وَهُ جَهَنَّمُ وَبَشَسَ الْمُصِيرُ﴾ (انفال-۶)

اور جوان کو اس دن پیٹھ دے گا مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی سچ کرتا ہو یا کسی (مسلمان) دستہ سے جا ملنا ہو تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔
یہ تو سبلی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہئے اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا﴾ (انفال-۶)

اے ایمان والو جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔
یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔
﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (فتح-۴)
وہ کافروں پر زور آور ہیں۔

اشداء کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زور مند اور قوی دست کیا جاسکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔
﴿وَاعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْنَمُوا لَهُمْ ۚ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (انفال-۸)
اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی زور و قوت اور گھوڑے باندھنا تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے مرعوب کرو۔

اس "قوت" کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامان جنگ و قتال سے کی گئی ہے مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے ورنہ معنی میں مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے۔ غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان و اسلحہ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ ہیں اور ان سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی متوحش ہو رہے تھے اس پر وحی الہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا۔

﴿كَانُوا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ﴾ (انفال-۱)

گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں۔

سورۃ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نکتہ کمپا ہے۔

﴿فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾

(۲-ب)

جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف فکر کر دیکھتے ہیں ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی غشی آجائے۔

سورۃ محمد میں ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے۔

﴿فَإِذَا أَنْزَلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُنْظَرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمُنْعَشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَئِكَ لَهُمْ﴾ (محمد۔ ۳)

جب اترے کوئی عتابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے دیکھے گا کہ تکتے ہیں تیری طرف جیسے تنگی لگائے وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے سو خرابی ہو ان کی۔

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا۔

﴿وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعُ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشْتُ مُسْنَدَةٌ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ﴾ (من نقون۔ ۱)

اور جب تو انہیں دیکھے تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں جو کوئی چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فریبی اور موٹائی سے نہیں بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سجیلے اور گھٹے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کرے۔ دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے بڑے اور موٹے تازے ہیں مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں اس لیے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کا جو جو ہر پیدا کرنا چاہتا ہے اگرچہ اس میں مادی و جسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہے لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھے کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مستحکم اڑایا ہے اس لیے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں اس بنا پر وہ اپنے پیروؤں میں شجاعت اور بہادری کا جو جو ہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

(۱) جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں صرف فضل الہی اور نصرت خداوندی چاہئے۔

(۲) ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے جب وہ آجائے تو وہ کسی کے ہاتھ نہیں مل سکتی اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

(۳) خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلت و کثرت:

تعداد کی قلت و کثرت پر جدوجہد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے کامیابی و ناکامی تعداد کی کثرت پر نہیں بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر منحصر ہے۔ تعداد کو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان یقین کی قوت موجود ہے تو بفضل خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پا سکتی ہے۔ اس فلسفہ کو حضرت حالات کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے۔

﴿كَمْ مِّنْ قَبِيلَةٍ عَلَتْ قَبِيلَةً كَثِيرَةً يٰۤاٰذُنَ اللّٰهِ﴾ (بقرہ-۳۳)

کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گیا ہے۔

حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو آمادہ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے۔

﴿اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبّٰرِيْنَ﴾ (مائدہ-۳)

اس میں تو ایک زبردست قوم ہستی ہے۔

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں۔

﴿فَاِذَا دَحَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ عَلَيْهِمْ وَّ عَلٰى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (مائدہ-۴)

تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

بدر اور احد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے ارشاد ہوا۔

﴿وَلَسَ نُعٰى عَنْكُمْ فَتَنُكُمْ شَيْئًا وَّ تَوَكَّلْتُ وَاِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (انفال-۲)

اور تم کو تمہارا جتنا کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

﴿وَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلٰى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ اِنَّ يَنْصُرُكُمْ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنَّ

يُخٰذِلْكُمْ فَمَنْ دَاۤلِدُنِيْ يَنْصُرْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِيْ وَّ عَلٰى اللّٰهِ فَيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (آل عمران-۱۷)

تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر بیشک اللہ تو کل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی

تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہئے کہ اللہ ہی پر

بھروسہ کریں۔

فتح و شکست حکم الہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے۔

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْۢ عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ غَرِيْبٌ خَبِيْۤیْمٌ﴾ (انفال-۱)

اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

تعداد کی قلت کی سلامتی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت

سے نہیں بتایا بلکہ ان کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوشخبری سنا دی فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گننے کے مقابل ہے

تجربہ قدم دس مسلمان سو پر اور میں ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا سَيِّ حَرٰصُ الْمُؤْمِنِيْنَ فَقَاتِلْ اِنَّ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتِيْنَ

وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَتَّخِذُوا الْفَاسِقَ الْدِينَ كَافِرًا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٩﴾ (انفال-۹)

اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا۔ اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر و توکل کی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کردی گئی پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کوئی ہے یعنی یہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈمگائیں۔

﴿وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَتَّخِذُوا مِائَتِينَ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَتَّخِذُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (انفال-۹)

تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں تو دوسو پر غالب ہوں اور اگر تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر حکم خدا غالب ہوں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندہی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بجمہ اندہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے اور وہ اپنے اس یقین و ایمان کی بدولت اپنے سے دو ٹی تعداد کی پروا نہیں کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے جس کا وعدہ ساز ہر تیرہ سو سال سے ہے کہ

﴿سَلَفْنِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (نمران-۱۶)

ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔

﴿سَلَفْنِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (انفال-۲)

میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے۔

﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (احزاب-۳)

اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (شوریہ-۱)

اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے:

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے نہ ٹل سکتا ہے اور نہ بٹلایا جاسکتا ہے اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحی محمدی نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے غزوہ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَتَبْنَا مُوْتَجِلًا﴾ (آل عمران-۵)

اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔

جب اللہ کا حکم ہو گا تب ہی کوئی مر سکتا ہے پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بزدلی کیوں چھائے جنگ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا۔

﴿قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْغَرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ﴾ (احزاب-۲)

(اے پیغمبران سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھگنا تم کو کام نہ آئے گا۔

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آ کر اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا۔

﴿قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَسَرِرْنَا لَكُمْ عَنْهُمُ الْقَتْلَ الٰی مَصَاحِعِهِمْ﴾ (آل

مرآن-۱۶)

(اے پیغمبران سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جس کا مارا جاتا تھا وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے۔

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں

﴿لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِی قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُخَيِّرُ وَيُجِبُّ﴾ (آل عمران-۱۷)

اگر یہ مرنے یا مارے جانے والے ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اور یہ خیال اس سے ان کے دل میں آتا ہے تاکہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اللہ جلانا اور مارتا ہے۔

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہیں تو ٹال لیں۔

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے ان کے خطرہ کا ذکر کر کے ان کی تشریف کی گئی۔

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا لَرَسُولٍ كَتَبَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۚ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْهِمُونَ فَتِيلًا ۖ أَلَيْسَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكُكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ﴾ (نساء-۱۱)

پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس

سے بھی بڑھ کر اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت پر بیزار کے لیے بہتر ہے۔ تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہو گے موت تم کو پالے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراؤ بلکہ ان مجاہدوں کی طرح جو جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے۔

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (آل عمران-۱۸)

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور بول اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔

شہادت اور غزا کا رتبہ:

میدان جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑے سے بڑا عیش و آرام بھی پیچ ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾ (توبہ-۱۲)

اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے اللہ راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سورہ نساء میں اہل ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر چکے ہیں اعلان ہے۔
﴿فَيُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (ساء-۱۰)

تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے۔

﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَآخَرُوا حَتَّىٰ مَاتُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ أَجْرُهُمْ مَا لَهُمْ خَوْفٌ وَلَا حُزْنٌ﴾ (آل عمران-۲۰)

تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے انہیں گناہوں کا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی وہ ان کو از سر نو اسی وقت دے

دی جائے گی اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مرجاتے ہیں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو وہ خدا کے پاس زندہ ہیں۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ (مرحین نما انہم اللہ من فضلہ) (آل عمران۔ ۱۷)

اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔

ان کی اس زندگی کو گواہ دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہئے۔

﴿وَلَا تَقُولُوا مَن يُقتَلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ حَيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾ (آل عمران۔ ۹)

اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔

ہرگز نمیر و آنکہ دلش زندہ شد بے عشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں جو نبیل اللہ کی راہ میں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہیں اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ و غضب اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی ہے۔ اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی فرمایا۔

﴿تَبْشُرُونَ غَرْصَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعَسَىٰ أَلَّهُ مَغَانِمٌ كَثِيرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّن قَبْلُ فَمِنَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ فَنِيْشُوا﴾ (نساء۔ ۱۳)

چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال سوائے اللہ کے پاس بڑا مال غنیمت ہے تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے ایک شخص غصہ و انتقام کے لیے لڑتا ہے تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا

﴿مَنْ قَاتَلَ لَتَكُونَ كَلِمَةً لِلَّهِ هِيَ الْعُيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ۱

جو شخص اللہ کی بات سب سے بڑا کرنے کے لیے لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ ۲

۱ صحیح مسلم صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتكون كلمة لله هي العيا فهو في سبيل الله۔

۲ صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للرياء والسمعة استحق الماروجا مع تردی۔

سو تم اپنا اجر پا چکے اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا و نمائش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے لیکن اگر جہد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے۔
کیونکہ اس فخر کا ضما بھی کلمہ حق کا بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبخیر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ بعض ناز و تبخیر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے خدا جس ناز و تبخیر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے۔^۱ کیوں کہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا لو میں ابن اکوع ہوں حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں۔

”یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ حالت کا اقتضاء یہی تھا اور وہ اس ناز و فخر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں۔“

غزوہ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا تو آپ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا

﴿أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطْلَبِ﴾

میں پیغمبر ہوں جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گواہ لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔^۲

صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہایت بہادر تھے ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا وہ خود سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے آپ ﷺ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آ کر فرمایا خوف کی کوئی بات نہیں۔^۳ ایک موقع پر جب بدویوں نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے۔^۴ بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگنی ہے ان میں بزدلی بھی ہے چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے دوسری روایت میں ہے کہ

۱۔ فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور۔

۲۔ بوداؤ کتاب الجہاد باب فی العیلافی الحرب۔

۳۔ فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۴۔

۴۔ صحیح بخاری غزوہ حنین و کتاب الجہاد باب بغلة النبی ﷺ۔

۵۔ صحیح مسلم باب غزوہ حنین۔

۶۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب الحمر کل و تعلیق السیف بالحق۔

۷۔ بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعت فی الحرب و الحین۔

آپ ﷺ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے ^۱ ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرادینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔ ^۲

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی صبی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو ^۳ اسی خط میں آنحضرت ﷺ کا وہ بلغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّ الْحَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ﴾ ^۴

یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔



۱ بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الحمن

۲ الہوداؤد کتاب الجہاد باب فی الحرۃ والحبین

۳ صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال

۴ ایضاً باب الحنۃ تحت بارقۃ السیوف و باب کان المی ﷺ یقاتل اول البہار اخر القتال حتی نزول الشمس

بخاری ج ۱ ص ۴۱۶۔

استقامت

”استقامت“ کے لفظی معنی سیدھا رہنے یا سیدھے چلنے کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستیا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے۔

﴿إِنَّمَا إِلَهُكُمُ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوا﴾ (حم السجدہ-۱)

تمہارا معبود ایک ہی ہے سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشاؤ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو ایک اور آیت میں بارگاہ الہی سے جناب رسالت مآب ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو نہ رہے، بہکونہ حکم ماننے سے سرکشی کرو۔

﴿فَاسْتَقِيمْ كَمَا أُمِرْتُ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (حود-۱۰)

تو (اے پیغمبر) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

عرب کا گرم ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تور بن گیا تھا، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول حق کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم ٹنگ ہوتی جاتی ہے اس موقع پر رسول اسلام اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے ارشاد ہوتا ہے اسی دین حق کی طرف سب کو بلاتے رہو اور ثابت قدمی دکھاؤ اور مخالفتوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

﴿فَبِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ﴾ (شوری-۲)

پس اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرما دیا اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا۔

﴿إِنَّ الدِّينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (احقاف-۲)

پیشک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ (راہ پر) چلے رہے تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا وہاں تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی۔

﴿إِنَّ الدِّينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَنْزِيلُ عَلَيْهِمُ الْحَلِيقَةُ أَلَّا تَحَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا

وَابْشِرُوا بِالْحَنَةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (حم السجدہ-۴)

بیشک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر جسے رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی منوجس کا تم سے وعدہ ہے۔

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے کہ میں اس سے چٹ جاؤں ارشاد ہوا کہ کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔ صحابہؓ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کئے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر حسنت اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں خود اللہ تعالیٰ نے غزوہ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے فرمایا۔

﴿اذْجَاءُ وَكُنْمْ مِنْ فَوْقَكُمْ وَمِنْ اَسْفَلِ مِنْكُمْ وَادْ رَاغْتَ الْاَنْصَارُ وَبَلَغْتَ الْقُلُوبُ الْحَاسِرَ وَتَطْمُنُ بِاللّٰهِ الطُّمُونُ، هُمَا لَيْتُ الْمُؤْمِنُونَ وَرُلُّوْا رُلًّا شَدِيْدًا﴾ (احزاب-۲)
جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جہز جہزائے گئے۔
اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہے اس کے بعد ہے۔

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَتَسْلِيْمًا﴾ (احزاب-۳)

اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔
اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا اور اس کو پورا کر دکھایا ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے۔

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهُ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْوَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَضِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾ (احزاب-۳)

ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔
یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں مردان خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی فرمایا۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْمِ الْبَاسَاءِ وَالضَّرَّاءِ

وَرَأَوْا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللَّهَ أَلاَ اِنْ نَصَرَ اللَّهُ فَرِيقًا ﴿۲۶﴾
 کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی اور جہنم جہزائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے گئے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کئے ہیں ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی۔

﴿رَبِّیْ اِفْرِغْ عَلَیْہَا صُورًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَی الْکَافِرِیْنَ﴾ (بقہ ۳۳)

اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہارے پاؤں اور اس کا فرقہ کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے احادیث ۱۔ ویر میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسیٰ کی امت کے کچھ شخص اور بچے مسلمان تھے یہودیوں نے ان کو ہر طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر ان کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا، مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے۔

﴿فَقُتِلَ اَصْحَابُ الْاِخْدُوْدِ السَّارِدَاتِ الْوَقُوْدِ، اِذْ هُمْ عَنْہَا فُقُوْدٌ، وَهُمْ عَلَی مَا یَفْعَلُوْنَ

بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُہُوْدٌ، وَمَا نَقَمُوْا مِنْہُمْ اِلَّا اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ﴾ (برون۔)

مارے گئے گڑھے کھودنے والے آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلائیں لیتے تھے مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے اللہ پر ایمان لے آئے تھے۔

انگوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے، خباب بن ارت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجئے۔ کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی بیتابی کا اظہار تھا اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آ رہے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دین حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا اور لوہے کی گتھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا۔ ۱

رسول اسلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہل تاریخ سے چھپا نہیں، ان ہی خباب بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہیں یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چٹ لٹا دیا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ

۱۔ صحیح مسلم و سیرت ابن ہشام قصاص اصحاب الاخدود۔

۲۔ صحیح بخاری باب علامات النبوة فی الاسلام۔

بدلنے پائیں یہاں تک کہ کولے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے! حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو جلتے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم و ستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالوں پر لٹائے جاتے پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ اس وقت بھی ان کی زبان سے اخذ اخذ (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا حضرت خبیثؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دو گناہ شکر ادا کرتے ہیں خود آنحضرت ﷺ کا وہ فقرہ جس کو آپ نے اپنے چچا اور ابوطالب کے جواب میں کہا تھا اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے فرمایا چچا جان اگر یہ کافر میرے واسطے ہاتھ میں سورج اور پائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں مرجائے یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو اٹلے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت و حیات سے وابستہ نہیں اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے۔

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَبْصُرَ اللَّهَ شَيْئًا﴾ (آل عمران-۱۵)

اور محمد تو ایک رسول ہے اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم اٹلے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو اٹلے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

﴿وَكَايَسُ مَنْ نُبِيَ قَتْلَ مَعَةٍ رِثْيُونٍ كَثِيرٌ فَمَا وَهَبُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۚ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (آل عمران-۱۵)

اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ لڑے تو پھر ان کو اللہ کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھو اور ہم کو کافروں پر مدد دے۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہئے اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامت عمل ہے جس کا نام مداومت ہے یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے اس پر مرتے دم تک مداومت رہے اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے نماز پڑھنا انسان کے سب سے اچھے کاموں میں سب سے اچھا

کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں فرمایا

﴿إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۖ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾ (معارف-۱)

لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے اس لیے آنحضرت ﷺ

نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل

نیک سب سے زیادہ محبوب تھا فرمایا وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے ۱۔ خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک

سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔ ۲۔



۱۔ صحیح بخاری باب القصد و مداومت العمل۔

۲۔ صحیح بخاری باب القصد و مداومت العمل۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح میدان جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں، بعینہ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابل ستائش سمجھا جاتا ہے جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو اور اسلام نے اسی قابل ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاعْرَضْ عَنِ الْمُنْشِرِ كَيْفَ ۚ اَنَا كَفَيْتُ الْمُنْشِرِ نَفْسًا ۚ اَلَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ (الحجر-۶)

پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کرو، ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں، کافی ہیں۔

یعنی اب مخفی طور پر دعوت تو حید کا زمانہ گزر گیا اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آ گیا ہے اس لیے کھلم کھلا اللہ کے اس حکم کو بیان کرو اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر و استہزاء کی مطلق پروا نہ کرو بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروا نہ کرو سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں ایک خوف تو لعنت و ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے۔

﴿وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ (مائدہ-۸)

یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن و طعن کی پروا نہیں کرتے۔

لعنت و ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھتا ہے لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: "کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہئے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو"۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں ہر شخص اپنے آپ کو حقیر کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو اللہ کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو ورنہ نہ کہے ایسے شخص سے اللہ قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف ارشاد ہو گا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہئے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ﷺ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

﴿افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جابر﴾

بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔

دوسری روایت میں ”کلمہ حق“ کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیئے گئے ہیں ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے۔ چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا نماز سے پہلے خطبہ دیا حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ ”تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے“ ۱۔

صحابہؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا مرتبہ حق گوئی میں بدرجہ کمال تھا یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترتا اور دوسرے دن پھر جا کر اعلان حق کیا اور وہی سزا پائی آنحضرت ﷺ نے ان کی مدح میں فرمایا کہ ”آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں“ ۲۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی اس پر انہوں نے بے محابا دارو گیر کی اور اس میں امیر معاویہ کی پرواہ انہوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا ”ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے“۔ یہ سن کر حضرت ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔ ۳۔



۱۔ سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

۲۔ جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذرؓ۔

۳۔ ترغیب وترہیب منذریؒ ۲ باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی۔

استغناء

استغناء کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (آل عمران - ۱۰)

اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہاں سے بے نیاز ہے۔

اور اس بے نیازی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔

﴿وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ﴾ (محمد - ۳)

اور اللہ تو بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذات بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام کے آئین اخلاق میں اس استغناء اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلا یا جائے قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (فاتحہ)

(اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اللہ نے جا بجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے فرمایا:

﴿وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (آل عمران - ۱۸)

اور کیسا اچھا کارساز۔

﴿وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾ (نہ - ۱۱)

اور تیرا رب کارساز بس ہے۔

﴿لَا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا﴾ (اسرائیل - ۱)

میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔

﴿وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا﴾ (نہ - ۱۱)

اور اللہ کارساز بس ہے۔

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے۔

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ﴾ (زمر - ۳)

کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔

اس لیے کسی شاہ امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغناء کی بنیاد ہے وہ قناعت ہے۔ یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے اسی پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے۔

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ (نساء۔ ۵)

اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔

﴿وَلَا تَمُدُّوْا عَيْنَكُمْ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ﴾ (طہ۔ ۱۶)

اور اپنی آنکھیں نہ پھیرا اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی، اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا تاہم اللہ نے جو کچھ اس کو دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اس بنا پر استغناء و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

﴿يَسِيسُ الْغَنَىٰ عَنْ كَثْرَةِ الْعُرُوضِ وَلَكِنَّ الْغَنَىٰ غِنَى الْمَقْصُودِ﴾ (بخاری رقائق باب لغنى غنى النفس)

دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے ”تو نگری بدل است نہ بہ مال“

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ﷺ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا حضرت ابو ذرؓ فرماتے

ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابو ذر! تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا ”ہاں“ فرمایا تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا ”ہاں“ فرمایا ”بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی“ ۱۔ اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضاء و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے مال و دوست سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی اللہ انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جو ہر نفس میں پیدا ہوتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے ۲۔ ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے ان کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر ان کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہو گا تم سے بچ کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے اللہ اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے اللہ اس کو بے

نیاز کر دیتا ہے۔ اے اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے اللہ اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہیں قبول کیا۔ ۱

فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے“ ۲ حضرت بھل بن سعد کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ۳



۱۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الاستغفار۔

۲۔ ترمذی کتاب الزہد۔

۳۔ زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القنعة۔

۴۔ مستدرک ج ۴ ص ۳۵۲ کتاب الرقاق۔

﴿وَالسَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (توبہ-۱۳)

اور منکر سے منع کرنے والے۔

﴿وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران-۱۳) اور توبہ-۹

اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

اور کہیں فَحْشَاءُ اور مُنْكَرُ کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے۔

﴿وَهُنَّ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (نور-۳)

وہ فحشاء اور منکر کرنے کو کہتا ہے۔

نماز کی خوبی یہ ہے کہ

﴿تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (مککات-۵)

وہ فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہے۔

فحشاء منکر اور بغی:

کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں فحشاء، منکر اور بغی۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ دِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (النحل-۱۳)

(مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قربات والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحشاء اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ

ﷺ کی شرم و حیا کی وجہ سے اسلام لایا تھا اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی۔^۱

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر و شر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے۔^۲

قد وہ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جن اخلاق حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پسند کئے جاتے تھے ان میں کوئی خلق

ایسا نہیں ہے جس کا اللہ نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو اور کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں ہے جس کی اس آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔^۳

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں فحشاء اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی

تشریح کی ضرورت ہے۔

۱۔ مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ۔

۲۔ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۵۶ وابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

۳۔ ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

فحشاء کے معنی:

ان میں پہلا لفظ فَحْشَاء ہے جس کی دوسری صورت فاحشۃ کی ہے یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ ۱۔ اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبیح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدودِ الہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرمادیں اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدیِ حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرکب ہوتا ہے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِقُرُوجِهِمْ خَمَطُونَ ۖ أَلَا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ ذُنُوبُهُمْ أَلَمَنِ ابْسَاطُهَا هُمْ ۖ هَٰؤُلَاءِ ضَالُّونَ ۚ﴾ (۱۰۶-ن۔۱)

اور جو اپنی شرکابوں کی تمکیدی کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر تو انھیں ملامت نہیں کی جائے گی پھر جو کوئی اس کے سوا کوئی ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اسی لئے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہو گئے ہیں قرآن نے کہا ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزَّوْجَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۚ﴾ (۱۰-ن۔۳)

اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ "فاحشہ" (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے۔

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے

بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی:

دوسرا لفظ "منکر" ہے۔ اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند

کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے وہ تو جانا پہچانا کام ہے اسی لئے اس کو معروف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گرجاتا ہے وہ منکر (ناشناسا) ہے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:

﴿قَوْمٌ مُّسْكِرُونَ﴾ (نبرۃ اریات)

لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انھوں نے تو پہچان لیا مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے

اس موقع پر قرآن میں ہے۔

﴿فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ﴾ (یوسف۔۷)

یوسف نے تو ان کو پہچان لیا مگر وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بدابہت ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے یہ کیفیت بھی منکر ہے فرمایا:

﴿وَاِذَا تَلٰى عَلَيْهِمْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ نَعَرَفُوْهُ فَاِذَا هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۹﴾ (ن-۹)

اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں تو کافروں کے چہروں میں تو منکر کو (بگڑی ہوئی شکل) بچپن کے گانزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں حملہ کر بیٹھیں۔

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے اس کو منکر کہا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جن کو ہر شخص فطرۃً اور بلاشبہ ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی:

تیسرے الفاظ بھی ہیں جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں۔

﴿حٰضِمٰنٌ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ﴾ (م-۳)

ہم دو جھگڑنے والے ہیں ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بابتہ دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں۔

﴿وَمِنْ سِیْطٰرِہٖ الرَّزٰقُ لِعٰدَہٗ لِعٰوٰہِی الْاَرْضِ﴾ (ش-۳)

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔

اسی سورہ میں ہے:

﴿ثُمَّ اَسٰوٰہِ عَلٰی الْاَرْضِ بِطٰغُوْنِہَا سَاسٌ وَیَبْعُوْنَ فِی الْاَرْضِ سَعِیْرَ الْحَقِّ﴾ (ش-۴)

راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاق ذمیرہ برے کیوں ہیں؟

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحش، منکر اور بغی میں منحصر ہیں۔ صفات ذمیرہ فحش،

یعنی حدود و جہتیں اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورۃ اعراف کی ایک آیت ہے۔

﴿فَلِیْ مَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظٰہَرَ مِنْہَا وَمَا بَطٰنٌ وَّالَاٰثِمَ وَالْبَغِیَ سَعِیْرَ الْحَقِّ﴾ (ع-۴)

اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی، ان اخلاق ذمیرہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے، اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے ایمان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔ ۱۔

رذائل کی ترتیب:

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جا سکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے۔ اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے فحشاء پھر مسکر پھر معی۔

فحشاء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ۔ مسکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے جیسے شوہر کا ظلم باپ کی سنگدلی، اولاد کی نالائقی اور بغی، جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو چھایا ہتی ہے جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی۔ دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفات ذمیرہ ہیں جن سے اللہ کی رحمت چھین جاتی ہے پھر وہ برائیاں ہیں جو اللہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وہ ہیں جو رضائے الہی سے خالی ہیں۔



۱۔ منطقی اصطلاح میں فحشاء، مسکر اور بغی میں مابعد اخلاق ہے، یعنی کسی بد اخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے مگر کوئی بد اخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی، یعنی ہر بد اخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاق ذمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے۔ یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر ہو جائے، کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قوی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے انسان کے دل کے اندر کی بات سوا اللہ کے کوئی دوسرا نہیں جانتا کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگرچہ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی ہوں وہ کم ہے کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو چنانچہ بعض پیغمبروں کے لئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے فرمایا۔

﴿وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ إِذْ يُسْأَلُ كَذَّابٌ عَنْ نَبِيِّهِ إِذْ قَرَأَ نَصْرَ الْمَوْدِيِّينَ﴾ (مریم: ۳)

اور اس کتاب میں اور یس کا ذکر کروہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔

اسی لئے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا فرعونوں کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے صدق نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا اللہ کا نبی نہیں ہو سکتا۔

﴿وَإِنْ يَثُوتَ لَكُمْ كَوْنُ كَذِبٍ فَإِنْ كَانُوا لَيُضِلُّوكُمْ عَنْ آلِهَتِكُمْ إِفْ كَذِبًا﴾ (مومن: ۳)

اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔

اس میں یہ تسلیم بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور طریق پر چلتے ہیں روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت نے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا ابوسفیان نے جواب دیا نہیں قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ اللہ پر جھوٹ باندھے گا؟! یہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

﴿تَنْزِيلُ عَلَى كُلِّ نَبِيٍّ مِّنْ مَّوَدِّعِهِمْ، يَنْفِقُونَ السَّمْعَ وَكَثُرُ هُمْ كَذِبُونَ﴾ (شعرا: ۱۱)

صحیح بخاری بدء الوحي۔

شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر لا ڈالتے ہیں سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیاء علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے اسی لئے جو جھوٹا ہوتا ہے

اس کے دل سے اللہ کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (زمر-۱)

بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے احسان نہیں مانتا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جھوٹ گنہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولتے

بولتے آدمی اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے“۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی

ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا جب

بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ

جنت میں داخل ہوا اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا جب

بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے

گا۔“ (مسند احمد ج ۱ ص ۶-۷)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آ جاتا ہے جس سے زیادہ

بری چیز کوئی دوسری نہیں اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ وسیع ہے وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری

کائنات آرام کر رہی ہے مگر رحمت الہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے جس کا منہ جھوٹ کی بادِ مسموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لعنت کا سخت ترین لفظ ”لعنت“ ہے۔ لعنت کے معنی ”اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی“ کے ہیں

قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی

ہے لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بناء پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹ الزام لگانے

کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اور اس پر اللہ کی لعنت کی جائے مباہلہ کے موقع پر فرمایا گیا کہ

دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

﴿ثُمَّ نَبْتَهِلُ فَنَجْعَلُ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ (آل عمران-۶)

پھر دعا کریں پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ

نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

﴿أَنْ لَّعَنْتَ اللَّهَ عَلَيْهِ إِنَّ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ﴾ (نور-۱)

صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وكونوا مع الصادقين، وجامع ترمذی باب ماجاء فی الصدق والكذب والیٰ وادود کتاب

الادب باب التمسيد یدنی الکذب۔

اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجمن میں جائے حق کا علم رکھ کر اس کے اظہار سے باز رہے اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ یُکْتُمُوْنَ مَا اٰتٰہُمْ السَّیِّئَاتُ وَالْہٰذِیْ مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنَہٗ سَاسُ فِی الْکِتَابِ
اُولٰٓئِکَ یُبْعَثُہُمُ اللّٰہُ وَیُلْعَنُہُمْ السَّعُوْنَ﴾ (بقرہ-۱۹)

بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور رہ کے نشان اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لئے کھول کر رکھ دیا ہے ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

یہ جھوٹ کی سببی صورت ہے کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹ سمجھیں اس سے وہ جھوٹ کے گو قرار نہیں لیکن عمل مرتکب ہوتے ہیں اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ اس سے جو منافق ہو گا وہ جھوٹ ہو گا چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے فرمایا۔

﴿وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ﴾ (منافقین-۱)

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے فرمایا کہ ”منافق کی پہچان تین ساتوں سے ہے جب کہ جھوٹ بولے جب وعدے کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔“ لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔ کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنا اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی برائی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی از می طور سے پیدا ہو جاتی ہیں ہی لئے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں جیسے

﴿قَاتِلِیْمٌ﴾ (شعر-۱۱)

جھوٹ بولنے والا گنہگار۔

﴿کَذِبٌ کَفَّارٌ﴾ (زمر-۱)

جھوٹ بولنے والا احسان کا حق نہ ماننے والا۔

﴿مُسْرِفٌ کَذَّابٌ﴾ (مومن-۴)

بے باک جھوٹا۔

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپاؤں گا اس لئے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جھوٹا ہو گا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس بات پر یقین کا ہے کہ کو آنے لگا۔ اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں یا اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو لیکن یہ کذب قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے۔ کذب عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

﴿سَمَّا احْفَظُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾ (توبہ-۱۰)

اس لئے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لئے کہ جھوٹ بولتے تھے۔

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑ لی قسم کھا کر اور وعدہ کر کے کسی کام کو طاق رکھ کر پھر نہ کرنا ایک قسم کا فریب تو ہے ہی مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے۔

﴿وَسَيُحْفَضُوْنَ بِاللّٰهِ لَوْ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهَنِّكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَنْهُمْ لَكَذِبُوْنَ﴾ (توبہ-۶)

اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنہوں نے اپنی سچائی کا عمل ثبوت دیا اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے فرمایا۔

﴿لِيُخْرِىَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَاءَ اَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ﴾ (احزاب-۳)

تاکہ اللہ انہیں ان کی سچائی کے سبب سے اجردے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی مسلمان ہو جا میں تو معاف ہو جائے)

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے فرمایا۔

﴿نَاصِيَةٌ كَاذِبَةٌ خَاطِئَةٌ﴾ (علق-۱) جھوٹی خط کا پیشانی۔

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنگ کا نیکا ہے جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریا کاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے۔

﴿قَاتِلُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا تَنْفَعُكُمْ هُمْ لِكُفْرٍ يَوْمَئِذٍ اَفَرَأَيْتُمْ مِنْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ يَقُولُوْنَ بَاغُواهُمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران-۱۷)

انہوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ ثرائی ہوگی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو آ کر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿أَوَلَيْتَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (نساء۔ ۹)

یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔

یہی وہ شخص جو اپنے آپ کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے جھوٹا ہے۔ یہ دفعہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (۶۰ ت) بنی اس میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلا نامہ نظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے؟ فرمایا ”جو جتن نہیں دیا گیا اتنے کا دکھا دینے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے“ ۱۔ حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا اور جس نے جو نہیں یا اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا۔ اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھا دینے یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے۔ غالباً اسی سبب اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی زور فرمایا ہے۔ ۲۔

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے جیسے اثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لئے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے ایک کسین صبی بنی عبداللہ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور ﷺ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ ”یہاں آ تجھے کچھ دوں گی“ حضور نے فرمایا تم جتنی ہو مگر تم اس کو چھ دینا نہیں چاہتی ہونا نے کہا اس کو کھجور دیدوں گی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا“ ۳۔

اس تعلیم کا منشاء یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہئے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرماتا اس لئے بھی ہے کہ ماں باپ کی تعلیم و تربیت سے بچے پر برا اثر پڑے گا وہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سنے گا اسی سانچے میں ڈھلے گا اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔

۱۔ ابوداؤد کتاب الادب۔

۲۔ صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الادب باب التعلیم فی الکذب۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے اور وہ انکار کرتے ہیں تو یہ بھی جھوٹ ہے چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔ ۱۔

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش ہمتی کے موقع پر شخص لطف صحبت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس اس پر افسوس“ ۲۔ کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس شخص کا سچ جھوٹ برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کئے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابل اعتبار سمجھتا ہے اس لیے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآئیں لیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو“ ۳۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زور اور افک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔ جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْتَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (ن: ۴)

بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔

زور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر شہادت مراد ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا ”ہاں یا رسول اللہ“ فرمایا کہ ”شرک اور باپ ماں کی نافرمانی“۔ راوی کا بیان ہے کہ

۱۔ مسند احمد و طبرانی کبیر مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۴۰ باب فی ذم الکذب۔

۲۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التمسد ید فی الکذب۔

۳۔ ادب المفرد باب اذا کذب الرجل و هو ملک مصدق۔

آپ ﷺ ایک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ ”جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات“ اور برابر یہی کہتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے۔ ۱۔

اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

الفکس اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا۔ شرک اللہ پر جو جھوٹ باندھا کرتے تھے ان کو قرآن نے افک کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو بہتان لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ افک سے تعبیر کیا ہے (نور۔ ۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افک بڑے خبیث طینت کا کام ہے فرمایا:

﴿تَنْزِيلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ﴾ (اشعراء۔ ۱۱)

اور شیطان (تو) اتر کر رہے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿كَمْ بِالْمُرءِ كَدْنَا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ﴾ (مقدمہ صحیح مسند)

آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے

﴿سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ﴾

جھوٹ کے بڑے سننے والوں۔

کا خطاب دیا ہے۔ یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

﴿سَمْعُونَ لِّلْكَذِبِ﴾ (مائدہ۔ ۶)

جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔



جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لئے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے اسی لئے قرآن پاک میں اس قسم کے کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ اللہ کو بھی شریک کرتا ہے۔ اسی لئے کسی آئندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گنہگار ہوتا ہے اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ ۱۔

﴿لَا يُؤْخَذُكُمْ اللَّهُ بِاللَّغْوِ مِنْ أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ
طَعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كَسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ
يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَفِظْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ﴾ (آئندہ ۱۳)

اللہ تم کو تمھاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے رہ باندھا تو اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا بیچ کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو یا ان کو کپڑا دینا یا ایک غلام آزاد کرنا تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا یہ ہے تمھاری قسموں کا اتار جب تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انبہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کی جائے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد کو غیر انبہ معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے اللہ نے فرمایا۔

﴿قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَجِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾ (تحریم ۱)

اللہ نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گنہ ہے اسی لئے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے حد درجہ بے اعتبار اور ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے رسول کو حکم ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تَطْغَوْا كُلَّ حَلَابٍ مَّهِيٍّ﴾ (نساء۔۱)

اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا نہ مان۔

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس کا اعتبار کریں لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بیقداری اور بے اعتباری کا احاطہ فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں اسی لئے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منشاء نہ تھا ہمارا نیت نیک تھی اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا أَصَابْتَهُمْ مُصِيبَةٌ سَمِعُوا قَدَمْتُ أَيْدِيَهُمْ ثُمَّ جَاءَ وَكُ يُخْفُونَ بِاللَّهِ أَنْ يُرَدَّ مَا أَلَا

حَسَنًا وَتَوْفِيقًا. أُولَئِكَ الَّذِينَ يَغْمِسُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (نساء۔۹)

پھر یا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض بھلائی اور مدد ہی تھی یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں اللہ فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو تو ان کو چاہئے کہ سچائی اختیار کر کے اللہ اور رسول کو خوش کریں۔

﴿يُخْفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ وَاسْتَوْسُوهُ أَحَقُّ أَنْ يَرْضَوْهُ كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (آپ۔۸)

تمہارے (مسلمانوں کے) آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ وہ تم کو راضی کر میں اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے اگر وہ ایمان دار ہیں۔

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اور اس پر پوچھ چھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں۔

﴿يُخْفُونَ بِأَنَّهُ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ﴾ (آپ۔۱۰)

اللہ کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا حالانکہ انھوں نے بے شک کفر کی بات کہی۔

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا، اللہ نے فرمایا کہ تم جد کر ان سے پوچھو گے تو وہ اللہ کی قسم کھا جائیں گے۔ سَيَخْلِفُونَ بِاللّٰهِ (توبہ-۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَخْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ (توبہ-۲)
تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔

اس لئے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، اللہ نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا۔

﴿وَيَخْلِفُونَ أَنْ ارْذَنَّا إِلَّا الْخُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾ (آ-۱۳)
اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔
اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے۔

﴿وَيَخْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (مجادلہ-۳)
وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ (مجادلہ-۳ ومنفقون-۱)
انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ اور اس کو اپنے پیؤ کے لئے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی۔

﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۚ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَضَتْ عُزْلَتَهُمَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَارًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَحَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونُوا أُمَّةً مِّنْ أُمَّةٍ﴾ (نحل-۱۳)
اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو اور تم نے اپنے پر اللہ کو ضامن بنایا ہے بے شک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے اور اس عورت کے جیسے نہ ہو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کئے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی، تم اپنی قسموں کو آپس میں بیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

اللہ کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا اللہ کے مقدس نام کی تحقیر ہے اسی لئے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا اللہ کو ضامن ٹھہرایا، اس لئے قسم کھا کر توڑنا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کر پھر ایسی قسم، توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بیوقوف عورت کا تھا جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے اللہ کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بد عہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

یہی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے دلوں پر دعویٰ کرنا اللہ کے کا نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کی بجائے دو گنہوں کا مجموعہ ہے یعنی غصب و جھوٹ اور وہ بھی اللہ کے پاک اور مقدس نام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿اِنَّ الْاٰدِیْنَ یَشْنُرُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ وَ اَیْمَانَهُمْ ثَمَّٰ فَبِیْنَا وَاَیْمَانُکُمْ لَا اِحْلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا

یُکْتَمُّهُمْ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیْمَةِ وَلَا یُرْکَبُهُمْ وَاُیْمَانُکُمْ اَیْمَانُکُمْ﴾ (النمل: ۸)

بے شک جو لوگ اللہ کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا دل خریدتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اللہ ان سے بات کرے گا اور ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

شان نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہر حال عام ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا دل لینا چاہے گا تو جب وہ اللہ کے پاس جائے گا تو اللہ اس پر غضبناک ہوگا۔ اشعث بن قیس صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ”اللہ کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے۔ میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی اس نے میری ملکیت سے انکار کیا میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے“ میں نے کہا نہیں تو آپ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا اس وقت یہ آیت اتری“ لے

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا ”تین آدمی ہیں جن کی طرف اللہ قیامت کے دن نہ دیکھے گا نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے“ صحابی کہتے ہیں میں نے کہا کہ وہ لوگ جو نہ کام ہوئے اور خسارے میں پڑے وہ کون ہیں یا رسول اللہ! فرمایا جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک دکاتا ہے (یعنی یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے (مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ) بہر حال جیسا کہ معلوم ہے کہ شان نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آ جائے اس لئے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا“ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو فرمایا درخت (اراک)

کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”بڑے بڑے گناہ یہ ہیں اللہ کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا“۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص سے قسم کھوائی جائے اور وہ جھوٹی قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا“۔ چہرہ کی خصوصیت شاید اس لئے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھٹائی دکھائی جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اس لئے خاص طور سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے فرمایا ”جھوٹی قسم مال بکوادتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھنہ دیتی ہے“۔ روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹی ہے وہ تو ہے ہی لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے پھر بے برکتی ہو جاتی ہے“ کیسے بلیغ فقرے ہیں: فاسہ یفق ثم یمحق (مسلم و نسائی و ابن ماجہ) جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بے باکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے قرآن پاک کی آیت اوپر گزر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت و خواری کا سبب ہے۔ وَلَا تُطْعَمُوهُ خَلَابِ مَہْنِ (قسم) حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے“۔ ۵



- ۱۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقطع حق مسلم یمین۔
- ۲۔ سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر۔
- ۳۔ سنن ابی داؤد و کتاب الایمان۔
- ۴۔ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی منذری باب ترغیب التجار فی الصدق۔
- ۵۔ ابن ماجہ صحیح ابن حبان منذری باب ترغیب التجار فی الصدق۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے فرمایا۔

﴿إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ (بنی اسرائیل-۴)

بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔

اور جس کی باز پرس اللہ فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بد عہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا فرمایا۔

﴿فَاعْتَبَهُمْ يَفَاقًا فِي يَوْمٍ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا

يَكْذِبُونَ﴾ (توبہ-۱۰)

پس اس کا اثر ان کے دل میں اللہ نے نفاق رکھا اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے اس لئے کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

صحیحین میں ہے کہ ”منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بولے جھوٹ بولے جب وعدہ کرے خلاف کرے جب امانتدار بنایا جائے تو خیانت کرے“ (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) ”اگر چہ وہ نماز پڑھتا ہو روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔“ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے جب تک اس کو چھوڑ نہ دے جب امانتدار بنایا جائے خیانت کرے جب بولے جھوٹ بولے جب معاہدہ کرے خلاف کرے جب جھگڑے گالی بکے۔ ۱

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں جب بولو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو۔“ ۲



۱۔ ترغیب و ترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق۔

۲۔ احمد حاکم ابویعلیٰ بیہقی منذری باب انجام الزوال وعد۔

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے۔ اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانتداری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ علیٰ ہذا عام مسلمانوں ائمہ وقت اور اپنے متفقہ قومی و ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔ اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَحُونُوا أَمْنِيَّتَكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (نقل-۳)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بددیانتی کرو۔

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے ایمانداری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ و رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چوری چھپے امداد پہنچائی جائے یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں۔ اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آ چکی ہے کہ ”منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے“۔ ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت کا قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا اگر چہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کر دو وہ کہے گا خداوند! اب کیسے لاؤں دنیا تو ختم ہو چکی کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان جائے گا اور اس کے پیچھے گرے گا یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لا کر لے چلے گا جب دوزخ سے لکنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ کرتا چلا جائے گا۔ پھر انھوں نے فرمایا نماز امانت ہے وضو امانت ہے تول بھی امانت ہے ٹاپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براء بن عازبؓ صحابی کونائی انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَوَدُّوا الْأَمْثَالَ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (نہ-۸)

بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔ ۱

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو اس کے بعد آئے گا پھر جو اس کے بعد آئے گا پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے خیانت کریں گے امانت داری نہیں کریں گے اور نذرانہیں گے تو پوری نہ کریں گے“ ۲

آنحضرت ﷺ جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ”اللہ! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا“ کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے“ ۳

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا۔ چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے مگر ان کی یہ چال کار گرنہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ ان کا بھید کھل جاتا تھا فرمایا۔

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِنْهُمْ﴾ (مائده-۳)

اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔

یعنی ان کی کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لئے کیا۔

﴿ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ﴾ (يوسف-۷)

تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی ان کی بیوفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں اللہ نے فرمایا:

﴿لِلَّهِ مَثَلًا الْيَهُودُ كَفَرُوا بِأَمْرَاتِ نُوحٍ وَأَمْرَاتِ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا

صَالِحَيْنِ، فَخَانَتَهُمَا فَلَمْ يُغَيَّا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا﴾ (۶-۲)

اللہ نے کافروں کے لئے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی مثال بیان کی یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی تو یہ دونوں (یعنی شوہر بھی) اپنی بیویوں کو اللہ سے ذرا نہ بچا سکے۔

یہ دل کی خیانت تھی۔

۱۔ مسند احمد بیہقی منذری باب الترغیب فی انجام الزور۔

۲۔ صحیح بخاری صحیح مسلم منذری باب مذکور۔

۳۔ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے یہاں تک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو۔ اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے فرمایا

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ (نور: ۲۰)

اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔

پھر اس سے چھپ کر کیونکر کوئی کام کر سکتا ہے۔



غداري اور دغا بازی

غداري اور دغا بازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بد عہدی کرتے تھے ان کے ذکر میں اللہ فرماتا ہے۔

﴿الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مِرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ۝ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَنُصِرْ بِهِمْ مِمَّنْ خَلَفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ وَإِمَّا تَحَافَنُ مِنْ قَوْمٍ يَخِيَانُ فَاَنْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ﴾ (انفال-۷)

جن سے تو نے معاہدہ کیا پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ (اللہ کا لحاظ) نہیں رکھتے سوا اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پاوے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پیچھے دیکھ کر بھاگیں شاید وہ عبرت پکڑیں اور اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے اللہ کو دغا باز خوش نہیں آتے۔

اس آیت میں گوان کافروں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بد عہدی اور دغا بازی کرتے تھے مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں ایک یہ کہ بد عہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے دوسری یہ کہ یہ غداري دغا بازی اور بد عہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے۔ بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا فرمایا۔

﴿وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (انفال-۱۰)

اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے اللہ سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں تو اللہ نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اللہ سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے تو اللہ تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا“^۱ یعنی اس سے اس کی بد عہدی اور غداري کی تشہیر ہوگی۔ آنحضرت ﷺ اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ ”بد عہدی نہ کرنا“^۲ یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداري نہ کی جائے۔ ظالم بادشاہوں حاکموں افسروں پہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور جب وہ ان کے

۱۔ صحیح مسلم کتاب الجہاد و السیر۔

۲۔ ایضاً۔

قابو میں آ جاتا ہے تو اس کو سزا دے دیتے یا مروا دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔^۱
اللہ فرماتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (مائدہ-۱)

اے ایمان والو! اپنی گزشتہ (قول و قرار) کو پورا کرو۔

عقود کی تعظیم میں وہ تمام شرطیں وعدے اور معاہدے داخل ہیں جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے۔ یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے مدت متعینہ کے لئے کوئی معاہدہ کیا۔ اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمرو بن عبسہ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر بد عہدی نہیں۔ امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گروہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے۔“ یہ سن کر امیر معاویہؓ واپس چلے آئے۔ غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا۔ رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بد عہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔



۱۔ سنن ابن ماجہ و صحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاماز الوعد۔

۲۔ سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لئے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو۔ قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لئے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں طعمہ نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابیؓ کے گھر میں چوری کی۔ مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلواریں کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحی اہی نے دفعۃً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔ ۱۔ دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے و دی۔ اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی۔ لوگوں نے اس کو پکڑا۔ آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ آپ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا۔ اس وقت یہ وحی آئی۔ ۲۔ بہر حال واقعہ جو کچھ ہوا امر مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں۔

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْمُخَلَّفِينَ حَصِينًا. وَأَسْتَعْمِرَ إِلَهُهُ إِنْ أَنَّهُ كَانَ عَفُوزًا رَحِيمًا. وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَلُونَ أَنْفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ حَوَاسًا أَثِيمًا. يَسْتَحْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَحْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ أَذِ يُبَيِّنُونَ مَا لَا يَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَفْعَلُونَ مُحِيطًا﴾ (۱۶-۱۷)

ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو اللہ نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑ اور اللہ سے قصور محاف کر اے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ خیانت کار گنہگاروں کو دوست نہیں رکھتا۔ وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے۔ جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔

آگے چل کر ہے۔

﴿وَمَنْ يُكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا﴾ (نہ-۱۶)

اور جو کوئی خطایا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لا دیا۔
 ان آیتوں میں خیانت کا راز تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے۔ پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے۔ پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گنہگار ہیں اور اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لئے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے۔ اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لا دیا۔

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی۔ اللہ نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی۔

﴿وَلَا يَأْتِيَنَّ مِبْهَتَانِ يُفْتَرِيَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ﴾ (نساء: ۳)

اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے۔ پھر بن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے۔ اللہ نے فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بغيرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدْ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَأُتْحَا مُبِينًا﴾ (احزاب: ۷)

اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لا دیا۔

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ ان کی عزت پر حرف رکھنا ہے اس لئے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے اس کو کوڑے مارے جائیں۔

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاحْذَرُوهُمْ ثَمَّ نَجِيصٌ حُنْدَةٌ وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (النساء: ۱۵)

اور جو لوگ شریف بیویوں کو عیب لگاتے ہیں پھر نہ لائے چار گواہ تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو اور وہ فاسق ہیں مگر جنہوں نے توبہ کی۔

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ بہتان باندھنے والا اللہ تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لئے بے اعتبار ہوگئی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگے گا حالانکہ وہ

بے گناہ ہو یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا۔ اے یہ گویا قذف یعنی تہمت بے جا کی مثالی سزا ہوگی۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس میں جو برائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے اے یعنی اس سے بچنا چاہئے۔“



۱۔ سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

۲۔ سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو اسی لئے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہئے یہ لفظ کہے ہیں مَسَاءِ بَنِمِیم (قلم) جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو۔ فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِحِبَالٍ فُتُصِبْحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾ (حجرات-۱)

اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو۔ کہیں کسی قوم پر نادانی سے جانہ پڑو پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو۔

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو اللہ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چونکہ اس بد اخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں بالخصوص عزیز واقارب اور دوست و احباب میں نا اتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں پھر خود ہی فرمایا۔

﴿الْمَشَاوِنَ بِالْنَمِيمَةِ الْمُفْسِدُونَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ﴾ (مسند احمد ج ۶ صفحہ ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید)

جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔ اے صحیح مسلم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿إِلَّا أَنْبَشَكُمْ مَا الْغَصَّةُ هِيَ النَّمِيمَةُ الْقَالَةُ بَيْنَ النَّاسِ﴾

کیا میں تم کو بتاؤں کہ غصہ کیا ہے؟ وہ چغل خوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔

لغت میں غصہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں۔ اس لئے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لئے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے لیکن اگر سحر کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت و مناسبت ہے۔ کیوں کہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بیوی

میں علیحدگی کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے۔

﴿فَبِتَعْلَمُونَ مِنْهَا مَا يُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَرُوحِهِ﴾ (آۃ ۱۲)

اس پر بھی ان (ہروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میوں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہروت ماروت سے سیکھتے تھے لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ مقصد چغل خوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ فداں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا اس نے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو یہ ہدایت کی تھی۔

﴿لَا يَسْمَعِي أَحَدٌ مِّنْ أَصْحَابِي عَنْ أَحَدٍ شَيْئًا فَانِي حَبَّالٌ أَحْرَجَ إِلَيْكُمْ وَأَنَا سَلِيمٌ الصِّدْرُ﴾ ۱۔

میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے کیوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے۔ بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناؤار گزرتی ہے۔ بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بد اخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگتے رہتے ہیں تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں۔ اسی بنا پر اہل عرب چغل خوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح مکڑیاں بیچنے والے مکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں اور ایندھن کے لئے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتش فتنہ و فساد کے لئے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق "حمالة الحطب" یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔

ان میں بعض لوگ استراق سمع کرتے ہیں یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتات کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

﴿لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَاتٌ﴾ ۲۔

جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تاکہ ان کا اثر بڑھ جائے اسی لئے عربی زبان میں چغل خوری کو "وشایہ" کہتے ہیں جس کے معنی نقش و نگار کے ہیں اور ادھر کی ادھر لگانے کے لئے

۱۔ مسم کتاب البر و صلۃ باب تحریم الغیمۃ۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الہدیث۔

چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے۔ اسی من سبت سے چغل خوری کو ”سعہ“ بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ تحریر و کتابت اور رمز و اشارات سے چغل خوری کی جاسکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں۔ یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ ”فلاں شخص یہ کہتا تھا“ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ”فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔“ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ”محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا“ چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔

اس بنا پر چغل خوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ نے ”ترک مالا یعنی“ کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل و خونریزی تک کی نوبت پہنچتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب و فریب، نفاق، غرض مختلف بد اخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہو گئی ہے۔ اگر امراء کے درباروں میں تہنق و خوشامد کے لئے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریح خاطر اور لطف صحبت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہیں سمجھتے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا۔ فرمایا ”ان پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں۔ ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔“ ۱۔

اس حدیث کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے۔ محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بد اخلاقیات اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبار و موبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ چنانچہ ”فلک عائشہ“ کے عام جہے کے متعلق ارشاد الہی ہے۔

﴿إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِالْبَيِّنَاتِ كُمْ وَتَقُولُونَ بِإِفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ﴾ (نور-۲)

جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل و نقل کرنے اور اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں کشف عورت اور کشف عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع 'پست حوصلہ' مبتذل اور ناقابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے شرف و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابل اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَلَا تَطْعُمْ كُلَّ حَلَافٍ مَّهِينٍ﴾ «هَمَّازٌ مَشَاءٌ بِنَعِيمٍ» «مُنَافِعٌ لِلْخَبِيرِ مُعْتَدٍ آئِينَ» (قلم-۱)
اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے۔ آبرو باختہ ہے (لوگوں پر) آواز سے کسا کرتا ہے۔ چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔ اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ بدکار ہے۔



غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں۔ اس بنا پر جن بد اخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَرُوا بِاللِّقَابِ ۚ بَشَرُ الْإِسْمِ الْفُسُوقِ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَحْسَبُوا ۖ وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿ (حجرات - ۲)

مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (اللہ کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو طعن نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو۔ ایمان لائے پیچھے بدتمیزی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی (اللہ کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو کیوں کہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ثنول میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برائہ کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو۔ بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقے سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے وہ غیبت ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تعریف، تصریح، رمز و اشارات، تحریر و کتابت اور محاکات و نقلی ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جاسکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے، لئے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جاسکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت پر زور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں۔

۱۔ انسان کا گوشت محض اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے اس لئے جو چیز اس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

۲۔ لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدت غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک برا فعل ہے تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مر جانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے اسی طرح اگر کوئی شخص رو در رو کسی کو برا کہے تو گویا ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی۔ لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا

نہایت بڑا لائق کام ہے اور بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔
۳۔ لوگ شدت محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے اس سے اس کی سخت قساوت و سنگدلی اور بغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اس لطف و محبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطراب کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کی بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔ اس لئے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرنے اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو طہانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہئے۔ اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ شب معراج میں میرا گدرا ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو دگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت و آبرو موٹ لیتے تھے۔ ۱

اعمال اور اعمال کی جزا و سزا میں منہایت ہوتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے یعنی ان کی غیبت کرتے تھے اس لئے عالم برزخ میں ان کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔
ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ ﷺ صحابہؓ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔ ۲

اس حدیث میں بھی اعمال اور جزا و سزا کی منہایت ظاہر ہے۔ مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے۔ اس لئے یہ بدبو اسی مردار خوری کا نتیجہ تھی۔

اس حدیث میں ایک نکتہ یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب کی تشبیہ و تنقیص کی جائے۔ اس لئے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیداتے ہیں اسی طرح ان کے اس عمل کی نجات و ننگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے۔ اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بالاشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا: ”وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جا گزیں نہیں ہوا ہے۔ نہ مسلمانوں کی غیبت کرو نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو کیوں کہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا اور اللہ جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دے گا۔“ ۳

۱۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبة۔

۲۔ ابوالفرد باب الغیبة۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبة۔

لغت کے رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں۔ مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی ضروری قید نہیں۔ اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ”تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے“ کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔ اے اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی۔ لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہل لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔ باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ سب و شتم میں داخل ہے۔

اس طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعے بھی غیبت کی جاسکتی ہے۔ کسی شخص کی نقل کرنا مثلاً ایک شخص لتکڑا ہے تو اس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لئے لتکڑا کر چلنا بھی غیبت ہے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اے اس طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ درزی کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے۔

﴿مَعَاذَ مَنَآءِ بَنِیْمِ﴾ (قلم-۱)

(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (ادھر کی ادھر ادھر کی ادھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔

﴿وَبَلِّ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةً﴾ (ممزہ)

ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چائیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حمزہ سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے برائی کرتا۔

۲۔ حمزہ خاص طور پر لوگوں کی نسب کی برائی بیان کرتا۔

۳۔ حمزہ ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرتا۔

۴۔ حمزہ زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرتا

۵۔ حمزہ برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرتا۔

۶۔ سر، آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قدم بند کر دیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآن پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغہ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں یا کفر کرتے ہیں ان کا حال یہ ہے۔ اس طریقہ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہیں وہ اس لئے کہ انکی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے قرآن پاک کا چھٹا پارا اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا﴾ (نساء۔ ۲۱)

اللہ کو بد گوئی پسند نہیں آتی، لیکن جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے، لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لئے اس کے احوال واقعی کا اظہار جائز ہے غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہ سلطانی میں فریاد کرنا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے لصاحب الحق مقالا۔

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرض احتساب (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں

قرآن نے طشت از یام کی ہیں)

(۳) فتویٰ طلب کرنا اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوسفیانؓ

کے بخل کی شکایت کی (اور آپ ﷺ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا)

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے ایک شخص کو بنس ابن العشیرہ (قبیلہ کا برا آدمی) کہا تھا۔

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو مثلاً اعمش یا عرج کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا رسول اللہ ﷺ نے خود ایک صحابیؓ کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً مخنث کو مخنث

کہنا۔



دور خاپن

اُردو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دور خاپن نہیں پایا جانا چاہئے۔ یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہئے بلکہ یہ بد اخلاقی چغل خوری سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دور خاپن آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دور خاپن کے لئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دور خاپن کہلائے گا۔ نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ”ہم لوگ امراء اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں۔“ بولے ”ہم لوگ عہد رسات میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔“ اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے:

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنُوا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيُطَانِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْرَءُونَ﴾ (آۃ ۲۰)

اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف مسلمانوں کو بیاتے ہیں۔

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اردو میں دور خا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لئے وعید شدید آئی ہے مثلاً فرمایا ”قیامت کے دن اللہ کے نزدیک تم سب سے برا دور خنے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔“^۱ ایک اور حدیث میں فرمایا:

”دنیا میں جس کے دور خ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دوزبانیں ہوں گی۔“^۲ یہ گویا اس کی اس عادت ذمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دورنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

۱۔ صحیح بخاری باب ما قيل في ذي الوجہين۔

۲۔ بخاری کتاب الادب باب ما قيل في ذي الوجہين و صحیح مسلم و مالک۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الادب باب ذي الوجہين۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جس کا نتیجہ ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کام میں بد نیتی ہی بد نیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسن نیت نظر نہیں آتا۔ دوسروں کی طرف ان ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے۔ دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اس سے کترانے لگتا ہے۔ اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ (حجرات-۲)

اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کر ڈبے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں فرمایا:

تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو اور نہ آپس میں حسد اور نہ بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے کہ آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔^۱

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے۔ اس کی مثال خود آنحضرت ﷺ نے پیش فرمائی ہے۔

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے رات کو ازواج مطہرات میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آپڑے وہ آپ ﷺ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے آپ ﷺ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔^۲



۱ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و مالک باب تحریم الظن۔

۲ صحیح مسلم باب انہ یستحب لمن روى خاليا بامراه يقول هذه فلانة۔

مداحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد اخلاق کی پستی و ناست اور ذلت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے اور یہ اس کے لئے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرکب ہوتا ہے ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں یہ جھوٹ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا یہ نفاق ہے۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لئے ارباب قدر و جاہ کی خوشامد انہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے جس سے اس کی دنائت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔

بے جا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے اور بے درپے تعریفیں سن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے۔ بادشاہوں امیروں دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مستحکم انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس طرح وہ بر خود غلط ہو جاتے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے ۱ اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی

ہے۔

﴿لَا تَحْسِبَنَّ الدِّينَ بِفَرْحُونَ لِمَا آتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسِبْنَهُمْ

مُخْفَرَةً مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (آل عمران - ۹)

اور جو اپنے کارناموں پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا اس پر تعریف کئے جانے کو پسند کرتے ہیں تو ان کو نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔

ان آیتوں کا شان نزول گو خاص ہے مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے۔ ۲ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کئے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن تو یہ کے اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے مگر یہ کہ مغفرت الہی و شگھیری فرمائے اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا تم نے اس کو برباد کر دیا۔ ۳ ایک اور موقع پر ایک

۱ صحیح بخاری تفسیر آل عمران۔

۲ فتح القدیر شوکانی۔

۳ صحیح بخاری باب کرہیۃ التماذج۔

صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا ”تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی“ اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہوا اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے“^۱ مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہو جائے گا اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لئے بھی حکم نہیں لگانا چاہئے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں ان کو سن کر ان کے نفس موئے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں تو حضرت تمقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو“^۲ ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے آپ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں آپ نے فرمایا ”اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو“۔^۳



۱۔ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد باب مذکور۔

۲۔ صحیح مسلم و ابوداؤد باب کرہیہ التماذح۔

۳۔ باب شخصی فی وجہ المہامین۔

بخل

بخل بھی اساسی بد اخلاقیوں میں سے ہے یعنی ایسی بد اخلاقی جو بہت سی بد اخلاقیوں کی جڑ ہے۔ خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دناست بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھانا، تنگوں کو پہنانا، محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبریلؑ کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بناء پر دلا یا وہ یہ ہیں۔

”یا رسول اللہ! آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔“ (صحیح بخاری، باب مدد الوقی)

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی ”بخیل“ نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کی خصوصیات قرار نہ پاتے۔

بخلت ان بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا۔ سورہ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے اس میں دوزخیوں کے سوال و جواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے ہو تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھاتے تھے مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دین حق پر اعتراض کیا کرتے تھے اور یہ سب اس لئے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۚ فَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْمُطَّلِبِينَ ۚ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمِ الْمَسْكِينِ ۚ وَكُنَّا نَحْوُ ضُرٍّ مَعَ الْخَائِضِينَ ۚ وَكُنَّا نَكْذِبُ يَوْمَ الدِّينِ﴾ (مدثر- ۲)

تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ پہنچا کر رہتی ہے اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا جو مذہبی جزاء و سزا کا قائل نہیں وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کر سکتا، یہی نکتہ سورہ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے دہرایا گیا ہے فرمایا۔

﴿إِنَّ يَوْمَ الدِّينِ يُكْذَبُ بِالذِّينِ ۚ فَاذْلِكِ الَّذِي يَبْذُحُ الْيَتِيمَ ۚ وَلَا يُحْصِ عَلَى طَعَامِ الْمَسْكِينِ﴾ (ماعون)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہو سکتی جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اس دنیا میں پانے کا مستحق رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا اللہ کے پاس ہے اور وہ کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔

اور ایک مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کا تذکرہ کیا جس کی روزی زیادہ نہیں ہے اس لئے اس کو اپنے اللہ سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے اللہ فرماتا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ، وَلَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ، وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا، وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ (الفجر)

یہ خیال صحیح نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں سورہ ہمزہ میں اس بخل کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو دولت کی تھیلیوں کو اپنی حیات جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کی بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی حالانکہ یہ کتنا خیال خام ہے فرمایا

﴿الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ، يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ، كَلَّا لَيُبَدَّلَ فِي الْحُطْمَةِ﴾ (ہمزہ)

جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گن کر رکھا اس کو سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ہرگز یوں نہیں وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کار خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کمال تک کھینچ لے۔

﴿كَلَّا إِنَّهَا لَأُظْفَىٰ، نَرَاغَةَ لَّسْتَوَىٰ، تَدْعُوا مِنْ أَدْبَرٍ وَتَوَلَّىٰ، وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ﴾ (معارف-۸)

ہرگز نہیں وہ جتنی آگ بے کھینچ لینے والی کھال، پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ دی اور پھر گیا اور اکٹھا کیا اور سینا۔

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود دروٹی، کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں اس لئے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو اللہ نے اپنی راہ کہا ہے جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا وہ اپنے لئے درہم و دینار نہیں جمع کرتا اپنے سینہ اور پیشانی

کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فُتْكُوىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كَنْزْتُمْ لَا تَفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ﴾ (توبہ-۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دے جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشینیاں کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لئے گاڑ رکھا تھا تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہئے اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لئے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہیں۔

﴿وَلَا يَحْسِبُ الْإِنْسَانُ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (آل عمران-۱۸)

اور جو لوگ اس مال کو جو اللہ نے اپنے مہربانی سے ان کو دیا ہے روکے رکھتے ہیں وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔

یعنی جس دولت کو انھوں نے بخلت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے وہ قیامت کے عالم مثال واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا حدیث میں ہے کہ ”یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔“

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلق خدا اور اللہ کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے:

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ الَّذِينَ يَتَخَلَّوْنَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبَخْلِ﴾ (حدید-۳)

اور اللہ کسی اترنے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا جو آپ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔

اور جس سے اللہ محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے اسی لئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز واقربا بھی محبت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں کی نگاہوں

میں بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے جس کا ذکر سورہ قصص میں ہے یہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی اللہ جانے کتنی بھری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے خزانوں کی کنجیوں کے کچھوں کو کوئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گذر چکے ہیں جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی یہ انجام ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی اللہ نے فرمایا:

﴿أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا﴾

(قصص-۸)

کیا وہ نہ جانتا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔

زمانہ محمدی کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

﴿مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ﴾ (اہب)

ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہو سکتا جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے بخل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے جس کا وہ بھی ایک فرد ہے۔

﴿هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُفَقُّوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَحْمِلْ

عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ﴾ (محمد-۳)

ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جا رہا ہے تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے سوا اپنے ہی

سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔

بخل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے نہ اچھا پہنن نہ قرینہ کا گھر نہ عزت نہ آبرو ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے فقراء اس کے لئے بد دعا کرتے ہیں یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ

سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے چور اس کے درپے ڈاکو اس کے لاگو زبردہ پاتا ہے جسے اس پر ہوتے ہیں مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے الے تلے سے اس کو اڑا دیا بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے وہ اس مال مفت کو دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس و قلاش ہو جاتی ہے۔

اللہ اپنے رسول کی زبانی فرماتا ہے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسِيسِرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۖ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ﴾ (ہیل)

اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا اور (اللہ کی یا نیکی کی باتوں کی) پروا نہ کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کو سخت کام کے لئے آسان بنائیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

وہ سخت کام جس کو اللہ اس کے سئے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے وہ بری عادت و خصلت اور برے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور ان کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے۔ بھوکا وہ رہتا ہے تنگ وہ رہتا ہے میلا وہ رہتا ہے مصیبتیں وہ جھیلتا ہے راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا عزیز و اقارب دوست و احباب سے اس کی مسرت نہیں ہوتی وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں پھر جب وہ کسی افتدیا مصیبت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی اس وقت افسوس آئے گا تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیر کر دیتا ہے۔

﴿وَانْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَخَذُكُمْ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقْتُ وَأَكُنُ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (منفقون ۲)

اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (اللہ کی رہ میں) خرچ کرو (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکو کاروں میں سے ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا یہ وقت نالے ٹل نہیں سکتا اس کے لئے سامان پہلے سے چاہئے تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں خوب خوب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے فضل سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے مگر جب اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَنْ اٰتٰىا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنُ مِنَ الصّٰحِحِيْنَ ۚ فَلَمَّ اٰتٰىهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (توبہ ۱۰)

اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکو کاروں میں سے ہوں گے پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخلت کرنے لگے اور بخل کر پھر گئے۔
اللہ فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا۔

﴿فَاعْتَبَهُمْ يَفَاقًا فِي قَوْلِهِمْ﴾ (توبہ: ۱۰)

تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔

اس سے معصوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے شاید اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”و خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں بخل اور بد خلقی“۔ رسول اللہ ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی اللہ سے دعا نہیں مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک بخل بھی ہے فرمایا کرتے تھے کہ ”خداوند! میں بخل کسمندی کبر سنی قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں“۔

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مہرات کی ترغیبات شریعت محمدی میں اسی لئے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک و صاف رہیں۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے کسی کو جسمانی قوت دی ہے تو جو لوگ اللہ کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں جس کو علم ملا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے علم کو پھیلانے اور دوسروں کو بتانے جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے اسی لئے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے۔

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَ اللَّهِ﴾ (بقرہ: ۱۷۷)

اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو اللہ کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا“۔ اس لئے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے اللہ کے حق اور بندے کے حقوق کا اجمالی مجموعہ۔ نماز اور بندوں کے حقوق کے مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے دیکھئے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجا آوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ قَالُوا لَمْ نَلْ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۖ وَلَمْ نَلْ مِنَ الْمُتَصَدِّقِينَ﴾ (مائدہ: ۲۷)

کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔

پہلا گنہ حقوق الہی کی بجا آوری سے انحراف اور دوسرا بندوں کے حق سے تغفل ہے، یہی بات سورہ ماعون کے آخر میں ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ﴾

(ماعون۔ ا)

پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پروا رہتے ہیں، وہ جو دکھا داکرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں، یہ حقوق الہی سے تغفل ہے اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے۔ اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لئے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔



حرص و طمع

حرص و طمع یا لالچ وہ برائی ہے جس میں نفس کی دناست پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ حرص و طمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو۔ عربی میں اس کو شح کہتے ہیں۔ جس کی برائی قرآن میں کئی موقعوں پر آئی ہے۔ خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں۔ شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے اس لئے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں یا ایک شخص کی کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرے کے لئے اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا، عشرتکدہ بن جائے گا۔ میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے۔

﴿وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسَ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِبُوا أَنَّ تَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ حَبِيرًا﴾ (نساء-۱۹)

اور طبیعتوں (نفس) میں حرص دھری ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر

ہے۔

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنی حرص و طمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی۔ فرمایا:

﴿وَأَنْفَقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ وَمَنْ يُؤَقْ شَحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (تحدین-۲)

اور خرچ کرو اپنے لئے بھلائی کرو اور جو اپنے جی کی حرص سے بچ گیا وہی کامیاب ہیں۔

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں۔

﴿وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُؤَقْ شَحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

الْمُفْلِحُونَ﴾ (احقر-۱)

اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچا گیا وہی

کامیاب ہیں۔

اسی کا نام ایثار ہے یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا جب

تک حرص و طمع کا خاتمہ نہ ہو۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا جو حرص و آزار سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی بھی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا

سب اسی کو مل جائے اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے کیوں کہ اس میں دو اور بداخلاقیات شامل ہیں۔ ایک بخل اور

دوسری حسد۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا مَا فَعَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ ۖ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَا ۚ وَاسْئَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ (نساء: ۵)
اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لئے ان کی کمائی ہے اور عورتوں کے لئے ان کی اور اللہ سے مانگو اس کے فضل میں سے حصہ۔ بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی کاش خود اسے ملتی بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لئے ہاتھ پھیلا نا چاہئے۔ اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا۔ اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی۔ ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا۔ اسی لئے فرمایا۔

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سُبُحَاتِ الْمَشَايِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۚ لَا تَمُدُّ عَيْنُكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ﴾ (حجر: ۱۶)

اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے۔ تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پار جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟

یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ”حرص و طمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا۔ اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اور حرام کو حلال سمجھا۔“ ۱۔ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے۔ فرمایا ”حرص سے بچو کیوں کہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا۔ اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا اور اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا۔“ ۲۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ”حرص سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا۔ اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا۔ اسی نے ان کو فسق و فجور کے لئے کہا تو انہوں نے فسق و فجور کیا۔“ ۳۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبراوئے والی نامردی ہے۔“ ۴۔ حریص آدمی اس لئے ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا وہ نہیں ملا فلاں کے پاس یہ ہے میرے پاس نہیں۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا۔ نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

۱۔ صحیح مسلم باب تحریم القطم۔

۲۔ صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم۔

۳۔ صحیح ابن حبان و ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجراۃ و الجین۔

۴۔ ابوداؤد۔

۵۔ نسائی۔

”ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔“ ۱ سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر توکل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے۔ ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ ”انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص۔“ ۲ کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے۔ ۳



۱۔ ترمذی۔

۲۔ ترمذی و صحیح ابن حبان، وطبرانی، وابو یعلیٰ، ویزار (منذری ۲ صفحہ ۲۳۸)۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے۔ اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے۔ اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے وہ فطرت کے نظام عدس کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصری آیت میں بیان کر دیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْإِطْلَاقِ﴾ (نہ۔۵)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناقص طریقہ سے مت کھاؤ۔

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے۔ یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور و ظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے یا رشوت لے یا سود کھائے غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں“۔ ۱۔ جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس مختصر فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معصوم ہوا کہ اندر بھیگا، رہا ہر سو کھا ہے۔ آپ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ فرمایا تو پھر اس کو اوپر یوں نہیں رکھ کہ لوگ دیکھ میں۔ جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں۔ ۲۔ یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہوا ”جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا وہ اللہ سے ملے گا تو اللہ اس پر غضب ناک“ ہوگا۔ ۳۔ ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح قسم کھانا چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے قسم کھا لی تاکہ وہ ظلم سے ماں لے لے تو اللہ سے جب وہ ملے گا تو اللہ اس سے منہ پھیر لے گا۔ ۴۔

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو ”غصب“ کہتے ہیں۔ غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب چھپروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا:

۱۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علينا السلاح فليس منا۔

۲۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غش فلليس منا۔

۳۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم۔

۴۔ صحیح کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم۔

﴿أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي السَّحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا﴾ (صاف-۱۰)

وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی جو دریائے میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔

یہ ایک ایسی کہلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا۔ اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعید بن زید صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا ﴿طَوْفَهُ اللَّهُ فِي سَعٍ أَرْصَبٍ﴾ ۱۔ تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا۔ یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے۔ ۲

بے ایمانی کی سب سے بڑی قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوت بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کریتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلا دی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ بے کیوں کہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے“۔ ۳

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کر دیتے ہیں۔

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (بقرہ-۲۳)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچو و حاکموں تک اس کا معاملہ تاکہ کھا جاؤ لوگوں کا کچھ مال گنہ سے اور تم جان رہے ہو۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر ان کا مال خلاف انصاف نہیں کھانا چاہئے جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالِ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَهُمْ لَا يَبْصُرُونَ سَعِيرًا﴾ (نساء-۱)

بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں اور اب وہ آگ میں جی نہیں گے

۱۔ صحیح مسلم باب تحریم المظلم و غصب الارض یہ عبارت کئی طرح سے ہے فی سبع ارضین من سبع ارضین، الی سبع ارضین۔

۲۔ شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور۔

۳۔ ابوداؤد کتاب القضاہ۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے۔ اسی سے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا۔

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا مَكَالًا مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (مائدہ-۶)

اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ سزا ان کی کمائی کی تنبیہ اللہ کی طرف سے اور اللہ ہے زور آور حکمت والا۔

چوری کن برائی کی وجہ بھی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے ما کر جو حاصل کرتا ہے دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکب فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے۔ اس لئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی ضروری سمجھی۔ سورۃ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بیویوں سے لیا جاتا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ”وہ چوری نہ کریں گی۔“ فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ میرے اور میرے بچوں کے لئے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔ فرمایا تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو۔ اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی۔ دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے۔ اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ ﷺ نے لیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا ہم سے عہد کرو کہ تم ترک چوری

اور بدکاری نہ کرو گے۔ پھر آیت پڑھی جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے اور جوان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور اللہ نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔^۱

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چور پر لعنت بھیجی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خودیاری چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

چوری کا گناہ بھی اسی لئے کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو اللہ بھی ہم کو نہیں دیکھتا اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا“^۲

جیہ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ”تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے مگر حق کے ساتھ“^۳

یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو یا اس کا کوئی کام کر کے معاملہ میں حاصل کرو یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالسَّطْرِ إِلَّا أَنْ نَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ بَيْنَكُم﴾ (نساء-۵)

اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہے۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا ”تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں اللہ کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔“ (ابوداؤد کتاب الحدود)

ایک صحابیؓ ایک چادر سرھانے رکھ کر سو رہے تھے ایک چور آیا اور اس نے چالاکي سے ان کے سرھانے سے اس کو کھینچ لیا وہ پکڑا گیا تو صحابی موصوف نے آ کر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی کیا تیس درہم کے لئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بچ دی اور قیمت اس کے ذمہ رہی آپ نے فرمایا مجھ تک

۱۔ صحیح بخاری کتاب الحدود۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الحدود۔

۳۔ ایضاً۔

معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چراتا تھا اور اگر مالک ہشیر ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا آپ نے فرمایا میں اس نے کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔



ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسک نے یکساں کی ہے لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے نازک سے نازک تا جائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا تشریع کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے جس سے ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور جس سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے اللہ نے دنیا میں قائم کیا ہے اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہئے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے فرمایا۔

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۖ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۖ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾ (انسان: ۱)

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ مت زیادتی کرو ترازو میں اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت گھٹاؤ تول۔

اس ترازو سے انسان کا ہر قول و فعل ملتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے اور یہ بھی چوری ہی ہے اسی لئے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں۔ حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی اسی لئے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں۔

﴿أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۖ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطِ الْمُسْتَقِيمِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ (شعرا: ۱۰)

اور پورا پورا بھر دو ناپ اور نہ ہونقصان دینے والے اور تو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹ کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھر و ملک میں فساد پھیلاتے۔

یہی حضرت شعیبؑ مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گزر میں آباد تھے۔

﴿وَلَا تَقْصُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ بِحَيْثُ وَابِنِي أَحَافٌ عَلَيْكُمْ عَذَابُ يُومٍ مُّجِيطٍ ۖ ۝ وَيَقْصُومُ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ (حود: ۱۸)

اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور ایک گھیر لینے والے دن کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں

اور اے میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہئے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیبؑ کی یہ نصیحت پھر سورہ اعراف میں دہرائی گئی ہے:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْجِيزَانَ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (اعراف-۱۱)

تو ناپ تول پوری کرو اور مت گھٹا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو یہ تمہارے لئے بہلا ہے اگر تم کو یقین ہو۔

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْجِيزَانَ﴾ (نہم-۲۹)

اور ناپ تول کو پورا کرو۔

سورہ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ، ذَلِكُمْ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (اسرائیل-۳)

اور جب تم ناپ تو ناپ پورا بھر دو اور سیدھی ترازو سے تولو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔

آیت کا اخیر نکتہ ایسا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول کو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بد اخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں اور ایک دن آئے گا جب ان کو اللہ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا سورہ مطففین میں ہے جہاں اس بد اخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے اس بیماری کا علاج بھی بتایا گیا ہے فرمایا۔

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ، الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ، وَإِذَا كَالُوا لَهُمْ أَوْزَنُوا لَهُمْ يُخْسِرُونَ،

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ، لِيَوْمٍ عَظِيمٍ، يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (مطففین-۱)

خرابی ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لئے ان کو اٹھایا جائے گا جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لئے کھڑے ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو، اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو اس سے کوئی چیز دوسرے ساتھیوں سے چھپا کر لینا غلول کہلاتا ہے مگر زیادہ تر مال غنیمت میں جو بددیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں 'غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے' جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونوں ملتی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہوتا چاہئے لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہو سکتا دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں اسی لئے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوسرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیر عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا اور چونکہ انبیاء بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گنہگار ہوں سے مبرا ہوتے ہیں اس لئے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے فرمایا۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ﴾ (آل عمران - ۱۷)

اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔
پھر فرمایا۔

﴿وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا عَمِلَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (آل عمران - ۱۷)

اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

غزوہ خیبر کے مال غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آ کر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا 'قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا یہ دیکھ کر حضور نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے آگ کا۔ لے

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا آپ نے فرمایا تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہوئی ہے یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا تمہارے بھائی نے مال غنیمت کی ایک چیز چھپ کر لی ہے صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔^۱

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر آتے پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ یہ ہم نے لوٹا تھا فرمایا کیا تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟ اس نے کہا سنی تھی پوچھا پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے اس نے معذرت کی فرمایا ”تم اس کو قیامت میں لے کر آنا میں نہیں قبول کرتا۔“^۲

عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں فرمایا ”اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو وہ ایک سوئی بھی چھپ کر لے گا تو وہ ”غلول“ ہے۔ وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔“^۳



۱۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول۔

۳۔ سنن ابی داؤد کتاب الاقصیہ۔

کُنُوْا بِضَعُوْنَ ﴿۹۰﴾ (۹۰-۹۱)

اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

﴿سَمْعُوْنَ لِنَكْدِبِ الْكُلُوْنَ لِمَسْخَتِ﴾ (۹۱-۹۲)

جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔

قرآن پاک کی ایک اور آیت جو پہلے گزر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْاَسْطٰطِ وَتَذَلُّوْا سَهًا اِلٰی الْحُكَّامِ لِنَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ

النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَانْتُمْ نَعْنَمُوْنَ﴾ (۹۲-۹۳)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم نیک رہو۔

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے رشوت کی ممانعت میں صاف و صریح

ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ”رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے“ رشوت دینے

والے پر یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔“

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھے پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو

آنحضرت ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہ صبی کو بھیجتے، وہ ایمان داری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے

کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو، یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس میں چندہ کر کے

اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کئے اور کہا کہ یہ قبول کرو اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یہ سن کر حضرت ابن

رواحہؓ نے فرمایا ”اے یہودیو! اللہ کی قسم تم اللہ کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر

سکتا، اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے۔“ یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا

کہ ”یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔“

اسی سنے آنحضرت ﷺ نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی۔

عمال نے آ کر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد و ثنا

کے بعد فرمایا۔

”عمال کا کیا ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آ کر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں

۱۔ ابوداؤد و کتاب الاقضية۔

۲۔ موطا امام مالک کتاب المساقات۔

۳۔ ابوداؤد و کتاب الاقضية و کتاب الجہاد۔

بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تجھے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لا کر لائے گا، اونٹ گائے بکری جو ہو پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھ کر تمین بار فرمایا ”خداوند میں نے پہنچا دیا“ ۱۔

اس آیت میں آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے۔



سود خوری

سود خوری حرص و طمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص و طمع تو یوں کہ سود خور اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آ جائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا، اور نہ کسی کار خیر میں دے کر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود خوری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے اور ظلم یوں کہ وہ سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہیں کرتا، اسی لئے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا۔

﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ (بقرہ۔ ۲۸)

نہ تم کسی پر ظلم کرو ورنہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے، اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کس ن اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے۔

﴿وَاحْذَرُوا الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْأَسَاطِلِ﴾ (نسا۔ ۲۴)

اور ان کے سود لینے کے سبب سے حذر، نکوہ اس سے روک کے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس معنت کو جس سے دنیا دہی جاری تھی ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔

﴿أَشَدِّسَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَحَبَّصُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلَّتْ سَائِهِمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحْلَلْنَا بَيْعَ وَحَرَّمْنَا الرِّبَا ۖ فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَفَّ ۖ وَأَمْرُهُ لِي ۖ اللَّهُ وَمَنْ عَادَ فَأَوْثَقْنَا أَصْحَابُ السَّارِ هُمْ فِيهَا حَبِيدُونَ ۚ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزَيِّنُ الصَّدَقَاتِ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كَثِيرًا أَلْبِسَ﴾ (بقرہ۔ ۲۸)

جو سود بھرتے ہیں وہ ایسے انھیں گے جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھو دیے ہوں، یہ اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ خرید و فروخت کا معاملہ سودی کی طرح ہے اور اللہ نے خرید و فروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا، اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں وہ دوزخ میں رہیں گے، اللہ سود کو مٹاتا اور صدقہ و خیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پیارا نہیں کرتا۔

قیامت میں سود خور کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تشبیل ہوگی، دنیا میں سود خوروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کار خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے انھیں گئے، آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سود خوروں کو ناشکر گنہگار ٹھہرایا ہے، کیونکہ اللہ نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا

کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے، مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے جیسے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرضداروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتیں اتریں جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ۚ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ وَإِن تُتِمُّوا فَنُكِّلْكُمْ رُءُوسَ أَمْوَالِكُمْ لَا تَغْلُمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۚ ۝ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَمُطْرَةٌ أَلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَإِن تصَّدَّقُوا فَهِيَ لَكُمْ ۚ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُصْغَمُونَ﴾ (۲۸-۲۹)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا خیال کرو اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو اگر تم واقعی مومن ہو تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لئے ہشیر ہو جاؤ اور اگر تم باز آ جاؤ تو تمہارے لئے تمہارا اصل سرمایہ بنے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے اور اگر وہ (مقروض) تنگ دست ہو تو اس کو کٹاؤ گی تک مہلت دو اور معاف کر دینا تمہارے لئے سب سے اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دیا نہ جائے گا۔

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب اللہ کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا اس کا حساب ہوگا تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا تو اللہ کے یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادھر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھاؤ مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر میں ردیتے اور اسی طرح جب تک وہ قرض ادا نہ ردیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا اللہ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۚ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ﴾ (آل عمران: ۱۳)

اے ایمان والو! (اصل سے) دو گنا چو گنا سود مت کھاؤ اور اللہ سے تقویٰ کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خوری کی سزا جہنم ہے وہ جہنم جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک رویاء صادقہ میں سود خوروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے فرمایا "میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے کنارہ پر کھڑا ہے پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں

چل جاتا ہے وہ پتھر کھا کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے سودخور ہے ^۱۔
سزا کی مماثلت ظاہر ہے لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں سودخور آسانی سے
اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پتھر لقمہ بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے تو وہ وہ دولت ہے
جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گنہ کے شریک وہ بھی ہیں جو کسی گنہ کی اعانت میں شریک ہوں اسی لئے آنحضرت ﷺ نے سود کھانے
والے سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت
فرمائی۔ ^۲



^۱ صحیح بخاری کتاب الجنازہ باب اولاد المشرکین و کتاب العہد باب تعبیر زویا بعد صلاة الصبح۔

^۲ ابوداؤد کتاب المبعوع۔

شراب خوری

شراب خوری ان عادات ذمیرہ میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں جتنا نظر آتی ہیں اسلام سے پہلے جو مذہب تھے ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے۔ لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی شراب پینا پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا بیویاں شوہروں کے کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں کے کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے۔ گے اور ساتھیوں کو اس کے کباب بنا کر کھلا دیتے ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کئے جاتے ان کو سب مل کر کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں اللہ نے تم کو کھجور اور انگور دیے جو بڑی نعمت ہیں لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو فرمایا:

﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرُفًا خَسَنًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ (نحل-۹)

اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی اس میں ان لوگوں کے لئے اللہ کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔

اس آیت میں نشہ کو ”رُفًا حسن“ کے مقابل میں رکھا ہے اس سے معصوم ہوا کہ نشہ ”رُفًا حسن“ نہیں ان آیتوں میں درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں۔ اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف لگتا ہے یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

مدینہ میں آ کر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا حکم ہوا۔

۱۔ لوقا ۱۵۔

۲۔ سیدہ معلقہ میں قصیدہ الایہی بھٹک۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الاشراب۔

۴۔ سیدہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہؓ کا قصہ۔

۵۔ تفسیر کبیر امام رازی۔

۶۔ مفسرین کی مختلف رائیں ہیں۔

﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (۱۰۰۔)

تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا۔ کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنا یہ تصریح کی صورت اختیار کرے لوگوں کے دل میں آپ سے آپ سواں پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا۔

﴿يَسْنَبُونَ عَلَىٰ لَحْمٍ وَحَمِيرٍ قُلْ فِيهِمْ شَيْءٌ كَبِيرٌ وَمَوْفِعُ النَّاسِ وَالْمُتَمَهِّمُ كَثْرًا مِنْ نَفْعِهِمَا﴾ (بقرہ۔ ۱۰۱)

(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں پوچھتے ہیں کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں سے یہ فائدہ نہ دے گا چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے لوگ کھاتے پیتے ہیں دوسروں کو بھی ان کی بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا اس لئے اس فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر چھوٹ پیتے بھی تھے آخر یہ آیت اتری۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَلْأَلَامُ رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَحَسْبُكُمْ عَذَابًا ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ﴾ (۱۰۲۔)

اے ایمان والو! شراب اور جو اور چڑھاؤ کے بت اور پائے مندے کام ہیں شیطان کے سون سے بچتے رہو شاید تمہارا بھلا ہو شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور پیرا مال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر اب تم باز آتے ہو۔

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا یا اللہ! ہم باز آ گئے! اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم لگے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے ان تینوں اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی آشکارہ ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاؤ کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور

برے کاموں میں شمار کیا ہے اس لئے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھوڑے سے اتفاقاً ایک قطبی مر گیا تو فرمایا۔

﴿هُدَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ (قصہ-۲)

یہ ہوا شیطان کے کام سے۔

یعنی بہت ہی برا کام ہوا اسی طرح اس آیت

﴿إِنَّ الْمُنْذِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ﴾ (بنی اسرائیل-۳)

بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب جوئے بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے کون نہیں جانتا شراب خوری، قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جس کی مثالیں زمانہ کے صفحات پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے۔ کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت روزانہ پیش آتے ہیں مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اللہ کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے قرآن نے اس کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے خمر کہتے ہیں چھا جانے کو اس لئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش پر چھا جائے وہ خمر میں داخل ہے حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا ”شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے“ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔“ لے فرمایا ”جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔“ آنحضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب سرور کائنات ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا ناموس وحی حضرت جبرئیلؑ نے کہا ”اس اللہ کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو

جاتی۔“ ۱۔ گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔“ ۲۔ یہ بھی فرمایا کہ ”قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا۔“ ۳۔ اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سد ذرائع کے طور پر حرام کئے یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو اٹھا دیا۔ ۴۔

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ وَلَا تَعَاوُنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ-۱) گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا، سب حرام ٹھہرایا گیا۔ فرمایا ”اللہ نے شراب پر اس کے پینے والے پلانے والے خریدنے والے دوسروں کے لیے نچوڑنے والے اپنے سے نچوڑنے والے اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہے۔“ ۵۔ ارشاد ہوا کہ ”ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا بھی ویسا ہی حرام ہے۔“ ۶۔



۱۔ ایضاً۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ابوداؤد کتاب الاشراب۔

۶۔ صحیحین، ابوداؤد کتاب الاشراب۔

غیظ و غضب

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے اس لئے ایک مسلمان کو چاہئے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے۔

﴿وَالْكَاظِمِينَ لَغْظِهِمْ﴾ (النور: ۱۰)

کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں۔

اور دوسری جگہ فرمایا

﴿وَإِذَا مَا عَصِيتُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ (شوری: ۴۰)

جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پکچڑ دے پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔“ ۱

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابر بن قدامہؓ حضرت ابو درداءؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کہ ”غصہ نہ کیا کرو۔“ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ بارہ عرض کی آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ ”غصہ نہ کیا کرو۔“ ۲ مسند احمد ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد صبح کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں جن میں سے ایک یہ تھی فرمایا ”آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کئے گئے ہیں ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دیر بھی جلد ہو جاتا ہے تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفعہ بہت دیر میں ہوتا ہے تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور دیر جلد ہو جائے اور ان سب سے برا وہ جس کو غصہ جلد آتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں الال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہئے کہ وہ زمین سے ٹک جائے۔“ ۳

ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی

۱ صحیح مسلم باب فضل من یکنفہ عند الغضب و بخاری کتاب الادب باب تذکر من الغضب۔

۲ صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و لمبرانی و منذری باب التریب من الغضب۔

۳ جامع ترمذی و منذری باب مذکور۔

ٹھنڈا کرتا ہے تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وہ وضو کر لے ۱؎ حضرت ابو ریحہؓ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ کھڑا ہے تو اسے چاہئے کہ بیٹھ جائے اور اس سے بھی ممانعت ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے ۲؎ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دو صاحبوں میں چھ باتیں ہو گئیں ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ والہ ہو گیا اور رگیں پھول گئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اغوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہے۔ ۳؎ اس اخیر حدیث میں تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْخٰهْلِیْنَ ۚ وَامَّا یُسْرِئُكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ فَاَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ (اعراف-۲۳)

معاف کرنے کی بات ڈال نہی کی بات نہ اور نادانوں سے درگزر نہ اور شیطان کی چھیڑ چھاؤ کو ابھار نہ تو اللہ کی پناہ پکڑ بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسی قسم کی آیت سورہ حم السجدہ (۵) میں بھی ہے جس کا ترجمہ ہے۔

”نبی اور بدی برابر نہیں برائی کا جواب نبی سے دے پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہوگی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات سچی ہے اس کو جو بڑی قسمت دار ہے اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے“

آنحضرت نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں۔ ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) اللہ اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کر لے گا ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو اللہ کے نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کر لے اس سے فضا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے آنکھیں لال ہو جاتی ہیں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

۱۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من تم غیظا۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب اخذ من الغضب و مسلم باب فضل من ینک نفعہ عند الغضب۔

بغض و کینہ

دس میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیر پا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (حشر-۱)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے معاف کر اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ اے ہمارے پروردگار تو نرمی والا مہربان ہے۔

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہوں گے وہاں بغض و کینہ کا گزر نہ ہوگا فرمایا۔

﴿وَنَرَعَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ عِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ شُرُرٍ مُّتَقْسِمِينَ﴾ (نجم-۴)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آسنے سے منہ پھٹے۔

﴿وَنَرَعَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ عِلٍّ نَجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ﴾ (ف-۵)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔

ان آیتوں کے اشارے سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا جنت کا تختہ ہاتھ نہ آئے گا۔

آنحضرت ﷺ نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے

فرمایا۔

”اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس

میں بھائی بھائی بن جاؤ کسی بھائی کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے“^۱

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی طال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ

کوئی اپنے دل میں نہ رکھے ابویوبؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ

اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو

سلام میں پہل کرے۔“^۲ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ کسی

مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آکر ملے پھر سلام کرے

تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر

لوٹا۔“^۳ کئی حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”ہر دو شنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس

۱ صحیح بخاری و مسلم و مالک ابوداؤد و ترمذی و نسائی۔

۲ مالک بخاری مسلم ترمذی ابوداؤد۔

۳ سنن ابوداؤد۔

نے اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا اللہ اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں، اس حدیث کی تشریح ایک اور روایت سے ہوتی ہے، فرمایا: ”دو شنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دی جاتی ہے اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیئے جاتے ہیں، جب تک وہ اس سے باز نہیں آئیں۔“^۱ یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی بخشش نہیں ان میں سے ایک وہ جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے۔^۲

ان حدیثوں پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزوں سے عبارت ہے اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ جب تک شرک رہے گا اللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے اور انہیں دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔



۱ مالک و مسلم ابو داؤد و ترمذی و ادب المفرد بخاری۔

۲ طبرانی فی الاوسط (منذری ص ۶۴ مصر)۔

۳ ادب المفرد بخاری باب الشنا۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے یہاں تک کہ کفر و شرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں قرآن پاک میں اس کے لئے دو اور لفظ بغی (سرکشی) اور عدوان (تعدی) آئے ہیں یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے۔

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالنَّفْسَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (احزاب-۳)
کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گنہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

﴿وَيَسْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالنَّفْسِ﴾ (نحل-۱۳)

اور اللہ بے حیائی، ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں گو کسی کو تکلیف پہنچنا اچھا نہیں مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ﴾ (احزاب-۲۸)

اور جن پر ظلم ہو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے تو مظلوم اپنا انصاف اللہ کے ہاں پائے گا اور ظالم اللہ کی محبت سے محروم رہے گا۔

﴿فَمَنْ عَمَا وَاَصْلَحَ فَاجْزَاهُ عَلَىٰ شَأْنِهِ أَنَّهُ لَا يُلْحِثُ الظَّالِمِينَ﴾ (شوری-۴۰)

پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے جبکہ اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔

﴿وَلَمَّا انتَصَرْنَا بَعْدَ صُنْبِهِ فَأَوْتَيْنَا مَا عَنِتُّهُمْ مِّنْ سَبِيلٍ﴾ (شوری-۴۱)

اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔

لامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے۔

﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَتَّعُونَ فِي الْأَرْضِ بغيرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ

عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (شوری-۴۲)

روٹ پر جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں ان کے لئے دکھ واں سزا ہے۔
اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طب قصاص کی منصفہ اجازت دی گئی۔

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلَا يَسْرِفَ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا﴾
(۱۰۔ ییل۔ ۴)

اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرنے بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہئے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی فرمایا:

﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ضَلَّ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَظِيمًا﴾ (۲۱۔ ب۔ ۲۱)
اور اللہ وبری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو اللہ کے قانون کے آگے سرنگوں کریں۔

﴿فَإِنْ نَفَعْنَا أَحَدَهُمَا عَلَى الْآخَرِ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَنْعَىٰ حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ﴾ (خبرات۔ ۱)
تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آدے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہئے فرمایا:

﴿وَلَا يَجْرِمُكُمْ شَأْنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّواكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَقْتُلُوا وَتَعَاوَنُوا عَلَىٰ الْإِسْرِ وَتَقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (۱۔ مد۔ ۱)
اور کسی قوم کی دشمنی اس لئے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک وہ سخت سزا والا ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا موثر حربہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور نان کو آپریشن ہے اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے اور صاف و صریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم و تعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے

ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ”تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم“۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے فرمایا ”اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔“ ۱۔ اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کر دی اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے تو اس کس التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے مؤثر انداز میں سنائی فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ ”اے میرے بندو! میں نے اپنے لئے اور تمہارے لئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔“ ۲

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔“ ۳ ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے ہماری زبان میں اسی لفظی روایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہو گی انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے یہ اندھا پن قیامت کے ہونا ک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہو گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے چاہئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے۔“ ۴ براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے ۵ حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ ﷺ نے یمن بھیجا تو ان کو نصیحت فرمائی کہ ”مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے اور اللہ کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں۔“ ۶ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جس نے اپنے بھائی کی آبروی کسی چیز پر ظلم کیا تو اس کو چاہئے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینا رہو گا نہ درہم ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظلم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظلم پر لاد دی جائیں گی۔“ ۷

۱۔ صحیح بخاری ابواب المظالم و صحیح مسلم باب نصر الاغ ظالم و مظلوم۔

۲۔ صحیح مسلم باب تحریم الظلم، وترندی کتاب الزہد، و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۵۴ و صفحہ ۶۰ و صفحہ ۷۷، اب المفرد بخاری باب الظلم۔

۳۔ صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم۔

۴۔ صحیح بخاری ابواب المظالم۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فرمایا کہ ”ظالم کو اللہ مہلت دیتا ہے پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔“ ۱

فرمایا اہل ایمان جب دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کئے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔ ۲



۱ ایضاً۔

۲ صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔

۳ صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فخر و غرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا ہے یا کم پایا جاتا ہے اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دنیا میں سب سے پہلے اس بد اخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالا تر سمجھا اور پکارا

﴿أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ﴾ (اعراف-۲)

میں اس سے بہتر ہوں۔

وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شخی پر اس کو مردود قرار دیا اور فرمایا:

﴿وَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّغِيرِينَ﴾ (اعراف-۲)

یہاں سے اتر جا، یہاں تجھے غرور کرنا زیب نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔

کبر و غرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا، ”نہیں، تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔“

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بد اخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا۔ پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے۔

﴿وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا آتَاكُمْ نَعْمًا فَمِنْكُمْ مَنَّتُمْ فَتَلَوْنَ كُتُبًا مِمَّا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾

عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (ابراہیم-۳)

اور (قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کے رو برو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے تو کیا (آج) تم عذاب اللہ میں سے کچھ (تمہارا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالا تر سمجھتے تھے۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ﴾ (مومن-۳)

تو وہ سب شیخی میں آگئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو اہمیت کرنا پسند نہیں کرتے تھے ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس طبقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔

﴿فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَرَكُ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا تَرَكُ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ

ارادْنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا تَرَى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ۚ بَلْ يَبْغُوكُمْ كَدَبِينَ﴾ (ص: ۳۰)

اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے نگے کہنے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو اور

ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذیل ہیں (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے

سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی قومی سیاسی یا

اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان

لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں عام لفظ تو

استکبار اور اس کے مشتقات ہیں بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ﴾ (ص: ۱)

لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) بیکڑی اور غیبت میں (پڑے) ہیں۔

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے۔

﴿كَذَّبَتْ بَطْنُ الْعُزَّةِ عَلَى كُلِّ قُلُبِ الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (ص: ۳۰)

جتنے مغرور اور سرکش ہیں اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔

دو موقعوں پر اس کے لئے محقق کا لفظ آیا ہے یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے

مغرور اور فحار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾ (ص: ۶۰)

اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فحار ہو۔

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (نحل: ۳)

اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی نہیں دے دی گئی ہے۔

﴿الَّذِينَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِمُتَكَبِّرِينَ﴾ (زم: ۶)

کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں۔

﴿فَمَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (زم: ۱۰)

تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہے۔

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جاسکتا مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔^۱ اور امام غزالی نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ ”مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے اس لئے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔“ یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

یہ بد اخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتائج گونا گوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اس لئے ان سب کا استقصاء تو مشکل تھا البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیئے ہیں مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امراء و سلاطین سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہیے۔“ ایک بار آپ ﷺ خود عصائی کے ہوئے نکلے تو صبیحہ کرام تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے فرمایا کہ عجیہوں کی طرح تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوا کرو۔^۲

بڑے آداب و القاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں عجمی بادشاہ اپنے آپ کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”سب سے برا نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے۔“^۳

کبر و غرور کی چند عام اور بد نما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے مثلاً

﴿وَلَا تَمْسُ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَن تَحْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تُلْعَقَ الْحِمْلَ طُوفًا﴾ (نہل - ۴۱)
اور زمین میں اڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھڑپھڑائیں سکے گا اور نہ (تن رچنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔

﴿وَلَا تُصْعَقْ خَذَفَ لِبَاسٍ وَلَا تَمْسُ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (نعمان - ۲)

۱۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل۔

۳۔ صحیح بخاری۔

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اتر کر نہ چلے بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو فخر ہو۔
گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے:

﴿ثَانِي عِطْفِهٖ﴾ (عج-۱)

ایٹھتا ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

﴿مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ حَبْلًا لَمْ يَنْطُرِ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ ۱۔

جو شخص غرور سے اپنے کپڑے کھینے گا اللہ اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ گزشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوتا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو اللہ نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے ۲۔ اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں اور ان ہی کو اللہ نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے۔

﴿وَعَسَاۤءُ الرّٰحِمٰسُ الَّذِيۡنَ يَمْشُوۡنَ عَلَى الْاَرْضِ هَۡوٰنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْخٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا﴾

(فرقان-۶)

اور (خدا کے) رحمن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر قدمی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

رسول اللہ ﷺ دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے فرمایا ”اللہ نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے“ ۳۔

ایک صحابیؓ نے جن کو لوگ مغرور سمجھتے تھے اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں کبیل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔ ۴۔

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں حسب و نسب حسن و جمال مال و دولت قوت اور اعوان و انصار کی کثرت اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَفَضْنٰكُمْ مِّنْ ذِكْرِ وَّ اُنۡسٰی وَّ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوۡبًا وَّ قَبَاۡئِلَ لِتَعَارَفُوۡا﴾ (حجرات-۲)

لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حواء) سے پیدا کیا اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔

۱۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی اسبال الازار۔

۲۔ ترمذی ابواب الزہد۔

۳۔ ابن ماجہ کتاب الاطعمۃ باب الاکل مکن۔

۴۔ ترمذی ابواب البر والصلة باب ما جاء فی الکبر۔

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے۔

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (حجرت - ۲)

اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ "خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو منادیا اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں 'مومن' پرہیزگار اور بدکار بد بخت 'تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم منی سے پیدا کئے گئے تھے' لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دوں جو جہنم کا کوند ہیں یا اللہ کے نزدیک اس 'تہہ' سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجات کو گھسیٹنا چلتا ہے۔" ۱

جہاں تک زیب و زینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے حسن و جمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا چنانچہ ایک خوب رو شخص نے جب آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جو تا عمدہ ہو تو فرمایا کہ "اللہ حسن کو پسند کرتا ہے۔" ۲ یعنی اس کا نام غرور نہیں البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال 'غرور و تکبر' کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے چنانچہ ایک صحابیؓ کو آپ ﷺ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہہ بند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور اللہ غرور کو نہیں پسند کرتا۔ ۳

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی۔ مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنایا جائے تو اس کی حقیقت جلوة سراپ سے زیادہ نہیں۔

﴿عَسَوْا اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبْلٰةٌ وَنَهَوْا رِيْبَةً وَنَهَاجَةً بِيْسِكُمْ وَنَكَاتُ فِيْ الْاُمُوْر
وَالْاَوْلَادِ﴾ (حدید - ۳)

((دکو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشہ اور ظاہری زینت ہے جس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار ہونا (بس یہی کچھ ہے))

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت سے غافل کر دیا۔

آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا کھاپی

۱۔ ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی الکبر۔

۲۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی اسبال الازار۔

۳۔ ترمذی کتاب تہجد باب ما جاء فی الزہاۃ فی الدنیا۔

ڈالا اور پھین کر پھاڑ ڈالا۔^۱

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیئے جاسکتے ہیں اس لئے اس قسم کے مہتمموں پر ایک قابل ستائش وصف ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کو 'قوی امین' کہا ہے اور حضرت لوطؑ نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے۔

﴿قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةٌ اَوْ اَوْىٰ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴾ (ص۔ ۱۰۰۔)

(بوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی انسان پر اپنا یہ احسان جمایا ہے۔

﴿اِنَّهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْضٍ ضَعْفٍ قُوَّةً﴾ (۶۰-۶۱)

اللہ (بی) وہ (قادر مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جوہر کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا پھر (بچپن کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامان جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَاَعِدُّواْ لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْحَيْلِ تُرْهَبُوْنَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاَحْزٰی مِنْ ذٰلِہُمْ لَا تَعْمَلُوْهُمُ ۚ اِنَّہٗ یُعَمِّہُمْ﴾ (انفال۔ ۸)

اور (مسلمانو!) سپہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے (مقابلہ کے) لئے ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے^۲ اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے تاہم غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے جو ایک قابل ستائش وصف ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

﴿اَلَا اَحِبُّرَ کِمَ بَاہِلِ الْحِجَةِ کُلِّ صَعِیْفٍ مُّتَصَعِفٍ اَلَا اَحِبُّرَ کِمَ بَاہِلِ الْبَارِ کُلِّ عَتَلٍ جَوَاطٍ مُّتَکَبِّرٍ﴾^۳

کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ بدخوا اور مغرور شخص۔
دوسری حدیث میں ہے:

۱۔ ترمذی کتاب الزہد باب ما جانی الزہادۃ فی الدنیا۔

۲۔ مسلم کتاب القدر باب فی الامر باحقوۃ و ترک العجز۔

﴿احتججت النار والجنة فقالت هذه يدحسی الجارون المتكبرون وقالت هذه يدحلی الضعفاء والمساكين﴾^۱

دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ضعف بجائے خود قابل مدح وصف نہیں ہے بلکہ اس کو صرف اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

اعوان و انصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لئے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرت مال اور کثرت اولاد پر فخر و غرور کرتی ہیں اور اس فخر و غرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں بلکہ اللہ کو بھلا دیتی ہیں زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان انصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے۔

﴿إِنَّا أَكْثَرُ مِنْ مَّا لَا وَاعِزُّ بَصْرًا﴾ (کہف-۵)

میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتنا (بھی) بڑا زبردست (جتنا) ہے۔

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لئے اس قدر کبر و غرور جائز نہیں۔

﴿اَكْفَرْتُ بِاللَّهِ خَلَقْتُ مِنْ تَرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّكَ رَحُلًا﴾ (کہف-۵)

کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الہی نے اس کی دولت کو مٹا دیا اور اس کا جتنا ٹوٹ گیا اور اس کو معصوم ہو گیا کہ ایسی ناپائیدار چیز فخر و غرور کے قابل نہیں اہل عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیحہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور زندوں سے گذر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے اس فخر و غرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ ”تکاثر“ ایجاد ہو گیا تھا جس نے ان کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسان کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی۔

﴿الْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (تکاثر-۱)

تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنادیا ہے یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملنے ہو۔

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں بلکہ اجتماعی و تمدنی حیثیت سے نسل ترقی ایک قابل فخر چیز ہے بشرطیکہ فخر و غرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے

۱ بخاری کتاب الادب باب الکبر۔

۲ مسلم کتاب صفات المنافقین و احکامہم باب النار یدخلها الجبارون۔

۳ ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار۔

ارشاد فرمایا ہے۔

﴿تزوجوا الودود الولود فانی مکنتم بکم الامم﴾^۱

محبت کیش، در بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو کیونکہ کثرت تعداد میں میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔



ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے بلکہ اللہ کے علاوہ اور لوگوں کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔“

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے نفاق کیا ہے؟ نفاق یہ ہے کہ دل میں چھہ ہو اور زبان سے چھہہ جائے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا چھہ نہیں رہ جاتی ہے وہ اس سے اللہ کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف و خطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے اس سے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے اس بنا پر قرآن مجید میں جب اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَصْنَعُوا صَدَقَاتِكُمْ مَائِعًا وَلَا ذِي كَأَلْدَىٰ يُفَعِّقُ مَالَهُ رِقْدًا أَشَاسٍ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (نقرہ۔ ۳۶)

مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جت کر اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو جو اپنا مال لوگوں کے دھوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا چھہ اور نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اس لئے وہ نہایت بے پروائی غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع و خضوع، للہیت اور محویت و استغراق کا اظہار کرتا پڑتا ہے۔

عہد رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا چھہ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں اسی لئے ایسے شخص کے عمل میں للہیت اور خضوع نہیں پیدا ہو سکتا۔

﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُتَّاسًا يَرَاءُؤُنَ أَشَاسٍ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (ن۔ ۲۱)

منافق (مسلمانوں کو دھوکا دے کر تو یا) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ (حقیقت میں) اللہ ان ہی کو دھوکے میں رکھتا ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اکسارے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں (ظاہری کر کے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر کچھ یوں ہی سا۔

﴿هُوَ يَلْبِسُ الْمُفْلِسَ الدِّينِ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُؤُنَ﴾ (ن۔ ۱۷)

تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہ مسیح و جال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آنکے اور فرمایا ”کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لئے مسیح و جال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟“ صحابہ نے کہا ”ہاں“ فرمایا ”شرک خفی“ اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔“ ۱۔

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل و صورت ہی کو بکا زنا چاہتی ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بنیاد کو ختم کر دیا اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریا کاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی ممانعت فرمائی مثلاً ان میں پہلی چیز تو داود و ہش ہے جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بد اخلاقی کے خاتمہ ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا اس لئے قرآن و حدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات خفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی تاکہ اس میں ریا کاری کی آمیزش نہ ہونے پائے۔

﴿اِنْ تُدُوْا الصَّدَقٰتِ فَعَمَّاهِیْ وَ اِنْ تَحْفُوْهَا وَ تَوْتُوْهَا الْفُقَرٰۤءُ فَهٖ حَبِیْرٌ لَّكُمْ﴾ (بقہ ۱۰۰-۱۰۱)

لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس

کو چھپاؤ اور حاجت مند کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام و نمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا اللہ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے ہاتھیں ہاتھ کو یہ نہ معصوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔ ۲۔

عرب کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لئے اظہار شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اس لئے وہ ریا کاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی۔ چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے ایک شخص دولت کے لئے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے فرمایا ”اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔“

آپ ﷺ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہار شجاعت کے لئے لڑتا ہے ایک شخص قوی حیثیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے تو کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے وہی پہلا جواب ملا۔ ۳۔

۱۔ بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیسین۔

۲۔ مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لکون کلمۃ اللہ فی المعیافہ فی سبیل اللہ۔

۳۔ مسلم کتاب الامارۃ۔

ریا کاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی اس لئے اس میں ریا کاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی اس کے نتائج بد رسول اللہ ﷺ نے نہایت موثر طریقے سے بتائے ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی یہ شخص اللہ کے سامنے لایا جائے گا اور اللہ اس پر اپنے احسانات جماتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا اللہ کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو تم صرف اس سے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا۔

اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا علم سکھایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ پھر اسی طرح وہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس کے بعد ایک دوست منہ شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا ارشاد ہوگا جھوٹ کہتے ہو تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیض کہیں پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔



خود بینی اور خود نمائی

خود بینی خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے لیکن خود بینی کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط ناز کر سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہیں اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں اسی کا نام عجب اور خود بینی ہے اسی سے نفس میں خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے اللہ کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا تب نصرت الہی نے ان کے پاؤں تھام لئے اور شکست فتح سے بدل گئی اللہ نے فرمایا:

﴿وَيَوْمَ حُصَيْنٍ إِذْ أَعْلَفْتُمُكُمْ كَفَرْتُمْ ثُمَّ تُغَرَّبُ عَنْكُمْ شَيْئًا﴾ (۴-۵)

اور حنین کے دن جب تمھاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کر دی تو اس کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔ اسی لئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ حَرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطْرًا وَرَنَاءَ النَّاسِ﴾ (نمل-۶)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتر آتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق۔ ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے فرمایا۔

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرَتْ مَعِيشَتَهَا﴾ (نمل-۶)

اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں جب وہ اپنے گزران میں اتر کر چلیں۔

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری کساتھ برباد ہو جائے گی یعنی قیامت آئے گی تو اس بربادی کے دن کی جونش نیاں آنحضرت ﷺ نے بتائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی اور اسی پر ناز کرے گا اور اتر آئے گا اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی

چاہئے۔

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلیٰ کی ممانعت فرمائی ہے۔

﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی﴾ (نجم-۲)

تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرؤ پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود نصاریٰ میں عجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ اَنْبِیَآءُ اللّٰهِ وَاجْتَنَاءُ﴾ (مائدہ-۳)

اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادَوْا اِنْ رَغِمْتُمْ اَنْتُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ اَسَاسٍ﴾ (جمعا)

(یہ غیبی ان یہودیوں سے) کہو کہ اے یہود اگر تم کو اس بات کا ٹھمنہ ہے۔ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے چہیتے ہو۔

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوہ سراب سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ”تم نے اس کو ہلاک کر دیا“۔ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی آپ نے فرمایا کہ ”تم نے اس کی گردن کاٹ لی اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں۔“ ممدوح کی یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا علاج سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے فرمایا

﴿لَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاكُمُ﴾ (حدید-۳)

اللہ نے جو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے چونکہ اسلام عرب میں آیا اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی اس لئے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے اور ان بد اخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہل عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہیں، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا اس کو معاف رہہ کہتے تھے آنحضرت ﷺ نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی اسی کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہ تھے اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے پھر اس قسم کی فیاضی کے لئے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا۔

﴿وَإِنَّ دَ الْقُرْبٰی حَقُّهُ وَالْمَسْكِیْنَ وَاسِ السَّبِیْلِ وَلَا تُدْرِ تَدْرِیْ ۚ ۙ اِنَّ الْمُبْدِرِیْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیْطٰنِ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهِ كَفُوْرًا﴾ (بی - ۳)

اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بے جا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے کہ فضول خرچی اللہ کی ناشکری ہے امام غزالی اس آیت کی تفسیر میں

لکھتے ہیں

”بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے تھے“

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریروں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر

کسی کام کے نہیں رہو گئے بلکہ انہیں کو دُک قابلِ ملامت ٹھہرائیں گے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْنُولَةً إِلَىٰ عُقْبَتِكَ وَلَا تَنْسُطْ بِهَا كُلَّ الْسُطِّ فَتَقْعُدَ مَنُومًا مَّحْسُورًا﴾ (بنی اسرائیل-۳)

اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا بی دو (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے (اور) تم تمہی دست بھی ہو گے۔

کیونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ (غفران-۶)

اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو۔

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بد چشتی پسند کرتا ہے اور کھانے پینے پہننے اور اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے سورہ اعراف میں اللہ فرماتا ہے۔

﴿وَكُنُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ (م ف-۳)

اور کھاؤ اور پیو اور شرب نہ کرو بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں۔

﴿كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

الْمُسْرِفِينَ﴾ (انعام-۱۴۱)

درخت کے پھل سے جب وہ پھل تم کھاؤ اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔



حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم، فضل، مال، دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بد اخلاقی نہیں، بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ اللہ کی نعمتیں اس سے چھین لی جائیں، تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے۔

﴿ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَا اَنْهٰهُمْ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ (نساء-۸)

یا اللہ نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جیسے مرتے ہیں۔

اور ان کی یہ خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے۔

﴿ وَذَکٰثِرٌ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ لَوْ يَرُوْۤا نِعْمَتَکُمْ مِنْ سَعْدِ اِيْمَانِکُمْ کُفٰرًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ﴾ (بقرہ-۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔

حسد کی تین قسمیں ہیں

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان کی طرح کافر ہو جائیں۔

﴿ وَذُو الْاُلُوْیٰ تَنْکُفُوْنَ کَمَا کَفَرُوْۤا فَتَنْکُوْۤنُوْنَ سَوَآءٍ ﴾ (نساء-۱۳)

ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جائیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین جائے، اس کو مل نہیں سکتی، اس لئے بالغرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سب کر لی جائے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسروں سے سب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لئے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید میں ہے۔

﴿ وَلَا تَتَّبِعُوا مَا فُضِّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ﴾ (انشاء-۵)

اور مدت جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی چیز اگر کسی کو حاصل ہو بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے اس لئے یہ بھی مذموم ہے البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں اسی لئے فرمایا:

﴿وَسْئَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (نار۔ ۵)

اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں حسد کے سات اسباب ہیں۔

(۱) بغض و عداوت کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اس کی بجائے اللہ اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی۔

﴿وَدُّوا مَا غَنِمْتُمْ قَدْ نَدَبَ النَّعْصَاءُ مِنْ أَقْوَاهِمُمْ وَمَا تُحْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ﴾ (آل عمران۔ ۱۲)

چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور (غیظ و غضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔

﴿إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِغْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا﴾ (آل عمران۔ ۱۲)

(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب اتنی فخر کا غلط خیال ہے کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا ہے اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھین جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہے اس لئے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت سے نکل جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے۔

﴿أَهْلُوا لَا يَمْنَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا﴾ (انعام۔ ۶)

کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لئے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف

حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں کفار اسی وجہ سے

پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے۔

﴿أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا﴾ (نور اہل - ۱۱)

کیا اللہ نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔

(۵) حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا ایک مقصد ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و

حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا۔

﴿إِذْ قَالُوا الْيَوْسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا نَحْنُ غُصَّةٌ﴾ (یوسف - ۲)

جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجود یہ کہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے

تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (بنیامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت سی زیادہ عزیز ہیں۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے اس لئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانہ روزگار ہونا چاہتے

ہیں جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہم ہو گیا ہے تو یہ ان کو سخت برا لگتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھین جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا اس لئے وہ اسلام ہی کی بنیاد پر آمادہ ہو گئے منافقین میں عبداللہ بن ابی کواللہؓ نے اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔

(۷) حسد کا ساتواں سبب خست نفس اور بد طبیعتی ہے کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی

کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے اس لئے

بیگانوں میں جذبہ نہیں ہوتا بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم رابطہ و اشتراک ہوتا ہے۔

ایک عالم دوسرے عالم پر ایک عابد دوسرے عابد پر اس لئے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت

مشترک ہے اس کے بخلاف ایک عالم یا کسی عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عام کیے اشتراک پیدا کر دیا تھا اس لئے

انکا میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں وہ سب کے سب اس

وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے اس لئے اصولاً جو بد اخلاقیوں اس اخوت کا شیرازہ برہم کر سکتی تھی رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا۔

﴿إياكم والصل والطن كذب الحديث ولا تحسسوا ولا تحاسدوا ولا تداروا ولا تباعصوا وكونوا عباد الله احوالاً﴾ (بخاری، کتاب باب ما تنهى عن قتالہ اہل) بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگوں کے عیوب کی نوہ لگاؤ نہ باہم حسد رو نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو نہ باہم بغض رکھو بلکہ اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

﴿المعنى كونوا كاحوال السب في الشفقة والرحمة والمودة والمواساة والمعونة والنصيحة﴾

اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت، غمخواری، محبت، اعانت اور خیر خواہی میں سبھی بھائیوں کی طرح ہو جاؤ۔ لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے ان تمام بد اخلاقیوں سے احتراز کیا جائے ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی اور یہ اس قسم کے تمام محاسن اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

﴿كأنه قال اذا تركتم هذه المنهيات كنتم حوفاً ومفهومه دالم تركوها نصيروا أعداء ومعى كونوا احوالاً كنسوا ما نصيرون به احوال مما سبق ذكره وغير ذلك من الامور المقتضية لذلك نفياً وإثباتاً﴾ (فتح الباری ج ۱ ص ۴۰۳)

گو رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیوں حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گذرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفی یا اثبات پیدا کرتے ہیں۔

ان بد اخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خن ہو سکتا ہے ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون بدگمانی اور حسد سے خن نہیں ہو سکتا کہا گیا کہ ان سے بچنے کی یہ صورت ہے فرمایا ”شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑو اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو بچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ“ لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہو تو اسلام کے تمام محسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمین اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا

﴿ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسرات کما تاكل النار الحطب﴾ ۱

تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول

اللہ ﷺ کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ (فقہ)

اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔



فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں ایک قسم تو قوت شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند بے باک نوجوان اور بے تکلف دوست و احباب ہوتے ہیں مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات و واقعات بیان کئے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رَفَث کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں۔

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (بقہ ۲۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔

اس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن حج کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے اس لئے اس قسم کے چپے نہایت آزادی کے ساتھ کئے جاسکتے ہیں حالانکہ یہ زمانہ ذکر الہی کا ہوتا ہے ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے ایک مجمع میں خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ”کیا تم میں کوئی آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح اللہ کے پردے میں چھپ جاتا ہے؟“ لوگوں نے کہا ”ہاں“ پھر فرمایا کہ ”اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا میں نے یہ کیا۔“ اس پر سب لوگ خاموش رہے پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ”کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟“ اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھ کر کہا کہ ”ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں“ فرمایا ”تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔“ ۱

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود الہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اپنی اہمیت کھودیں گی اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کر دے گا یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے چنانچہ قرآن مجید اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ میں بیان کئے گئے ہیں مثلاً:

﴿وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ﴾ (نساء۔۳)

۱۔ دونوں کی نشستیں الگ تھیں ”س“۔

۲۔ ابو داؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل۔

حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی باہم صحبت ہو چکے)

﴿أَوَلَمْ تَسْتَمِعُوا لِلنِّسَاءِ﴾ (نساء۔ ۷)

یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ شرمیلا اور شریف ہے اسی لئے اس نے جماع کو کنایہٴ لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہیں جو فقہی مسئلہ کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق پانخانہ پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایہٴ کرنا چاہئے پانخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث میں ”قضائے حاجت“ کا لفظ مستعمل ہے جو ایک کنایہ ہے قرآن مجید میں اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

﴿أَوْ حَوَّاءَ آحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾ (نساء۔ ۷)

یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو۔

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں اس لئے استعارہٴ اس سے پانخانہ مراد لیا

گیا۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پانخانہ بھی ایک استعارہ ہے جس کی اصل پائیں خانہ ہے چونکہ پانخانہ عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں اس لئے استعارہٴ ان کو پائیں خانہ کہا گیا پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پانخانہ ہو گیا اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے برص کی تعبیر سوء کے لفظ سے کی ہے جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں۔

﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحٍ تَحْرُحُ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةٌ أُخْرَىٰ﴾ (طہ۔ ۱)

اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بجل میں رکھ لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدوں اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ ہے۔

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوت غصبیہ سے ہے جس کا نام سب و شتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے زمانہٴ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک عام لفظ ”فسق“ سے اس کی ممانعت کی ہے۔

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (بقدرہ۔ ۲۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ فسق کی نہ جھگڑے کی۔

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے تو اس

کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:

﴿لَا يُجِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ﴾ (نساء-۲۱)

اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا ہو (وہ ظلم کو بر ملا بیان کر سکتا ہے)

قرآن وحدیث میں جو بجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں:

(۱) ایک مصمت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں یعنی اگر ایک شخص ایک گالی نکالتا ہے تو دوسرا

دودیتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے اس لئے

دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی

نکتہ بیان کیا ہے۔

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام-۱۳)

اور (مسلمانو!) اللہ کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر

اللہ کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے

باپ پر حسرت بھیجے کہا گیا کہ یا رسول اللہ کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا "اس طرح کہ جب کوئی کسی

کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ اس کے باپ ماں دونوں کو برا بھلا کہے گا۔" ۱

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جتنا چھوڑ دیتے

ہیں اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ "اپنے قید میں یہ نہایت

برا آدمی ہے۔" لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملے جب وہ چلا گیا تو حضرت

عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو برا کہا پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے فرمایا "عائشہؓ تم

نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ

اس کو چھوڑ دیں۔" ۲

(۳) بدزبانی دور وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک

غلام کو ماں کی گالی دی رسول اللہؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ ۳ امام بخاری نے ادب

المفرد میں اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

(۴) رفیق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی

۱ بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ۔

۲ بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشاً ولا متعصفاً۔

۳ بخاری کتاب الادب باب ما نھی من السباب واللعن۔

ان کے بالکل مخالف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے التَّسَامُ عَلَیْکُمْ، تم کو موت آئے، کہا۔ حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا عَلَیْکُمْ وَلَعَنَکُمُ اللّٰہُ وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ۔ تم کو موت آئے اللہ تم پر لعنت بھیجے اور تم پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ”اے عائشہؓ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔“

(۵) گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرات پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا: ارشاد ہے کہ ”بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بد نما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

(۶) گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہئے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔

(۷) گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ کُفْرٌ﴾ ۱

مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے وہ اس بد اخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

﴿لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَانِ وَلَا اللَّعَانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَدِیِّ﴾ ۲

۱ بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی فاحشاً ولا متکھفاً۔

۲ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جانی الفحش۔

۳ مسلم کتاب الایمان باب یمان تفاضل الاسلام دای امورہ افضل۔

۴ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جانی الشتم۔

۵ بخاری کتاب الادب باب ما نمی من المسباب واللعن۔

۶ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جانی اللعۃ۔

جو مسلمان ہے وہ طنز و تشبیہ نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔^۱

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن و طعن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے مثبت الہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ”اللہ کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں۔“^۲ یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود اللہ کو برا بھلا کہنا ہے۔ ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف اللہ کی فرمانبرداری ہے۔“^۳

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ ﷺ نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا،^۴ اور یہ اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔

اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغالطات سنائے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دل آزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے، لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی۔^۵

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفسیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا،^۶ بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ اللہ نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

۱۔ بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔

۲۔ بخاری کتاب الادب باب لا تسبوا اللہ ہر۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن۔

۴۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن السیمۃ۔

۵۔ بخاری کتاب الادب باب ما نہی من السباب واللعن، مسلم کتاب الایمان۔

۶۔ فتح الباری کتاب الادب باب ما نہی من السباب واللعن۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جاسکتا ہے جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورہ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں اس لئے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و رہیں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے اس لئے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفہ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عادات ذمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدم صدق ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو۔ جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دور خاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ دوسری اساسی برائی حب مال سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص و طمع، چوری، غضب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں۔ تیسری اساسی برائی حب ذات ہے اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے۔ حسد، تکبر، عجب، فحاری، غیظ و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا۔

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْحَسَنَةَ هِيَ الْهَوَىٰ﴾ (ازعات-۲)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا تو جنت اس کی آرام گاہ

ہے۔



آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرتے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جزء ہیں، آداب کہلاتے ہیں۔ ان ہی آداب کی پابندی و عدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ ان آداب میں خوبی و لطافت ملحوظ رکھنا حسن ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماع اور معاشرتی امور میں خوشگواہی پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواہی کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلامؐ نے اپنی عملی و قولی ہدایات سے مسلمانوں کے لئے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب و عوائد یعنی ایسی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئین یونان اور روم سے حاصل کیا۔ لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اس کے آداب و عوائد کا ماخذ بھی ہے، اس لئے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کر دیا ہے، اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاثریہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح و سنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے، اس لئے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے، یعنی فطرۃ وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے۔ یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں، تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا۔ ۱۔ ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی ستر عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کی تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات

کے بیان کے مطابق یہ اللہ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔^۱

حضرت ابراہیمؑ انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصال فطرت کہتے ہیں امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا^۲ مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے ایک حدیث میں ہے: ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خصال فطرت پانچ ہیں: ختنہ کرنا، موئے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھ ترشوانا^۳ ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں: مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، اٹھلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال صاف کرنا، موئے زیر ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا غالباً کلی کرنی ہوگی۔^۴

فطرت کے آداب یہ اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور اٹھلیوں کا دھونا ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھیں ترشوانا صفائی کے ضروری لوازم ہیں جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت معلوم ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے۔ یہ تمام باتیں اسلامی اشعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔“^۵ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔“^۶ ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے۔ اچھی اور بری معنوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم رواج کا واہمہ ہے جس رنگ کی عینک لگائے دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

۱۔ توراۃ پیدائش۔

۲۔ تورات پیدائش۔

۳۔ صحیح مسلم باب خصال الفطرہ۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ صحیح مسلم خصال الفطرہ۔

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے۔ گو کہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی بہت کم تھا پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا۔ زن و شوہر کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کر لیں نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہو سکتی۔ فرمایا۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ (۱۱-۲)

اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں، فرمایا:

﴿وَيَبِاتُكَ فَطَهِّرْ﴾ (۱۱-۱)

اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہئے۔

﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ (۱۱-۲)

تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیجے ہاتھوں کو سر پر پھیر لیں، اس کا نام وضو ہے۔

﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ

وَارْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (۱۱-۶)

جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوؤ۔

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہادھو کر جماعت میں شریک ہوں تاکہ کسی کی

گندگی اور بدبو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو۔ قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجی اور عضو خاص و مقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔

ان احکام سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ اللہ کی محبت کے

جصول کا ذریعہ ہے۔ فرمایا۔

﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (۲۸-۱)

اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لئے مختلف سنن اور طریقے سیکھائے

گئے مثلاً

(۱) آپ ﷺ نے فرمایا ”جب کوئی شخص سوکراٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھو لے اس کو پانی کے برتن میں

ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے۔ کیوں کہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے۔^۱ اس حدیث سے معلوم ہو کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہئے۔ سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔^۲

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے۔ اس لئے خیال رکھنا چاہئے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

(۲) دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا۔ فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔^۳ ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے تو فرمایا کہ تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں، مسواک کیا کرو۔ (مسند احمد ج ۱ صفحہ ۲۱۴)

(۳) عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہئے۔^۴ یہ اس لئے کہ راستہ چننے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

(۴) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں۔ ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہئے بلکہ محب کو چاہئے کہ اس سے پانی لے کر غسل کرے۔ کیوں کہ ہماری تھوڑی سی سہل انکاری سے وہ پانی دوسروں کے لئے ناپاک یا قابل کراہت بلکہ عام حالت میں خود اسی کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کرے گا۔

(۵) عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے۔ اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

(۶) پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے کیوں کہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔
(۷) غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو کیوں کہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

(۸) بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے۔ ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو

۱۔ مسم کتاب الطہارۃ۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً۔

یہنا اچھا ہے۔ استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے۔ اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

(۹) طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہئے۔

(۱۰) ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا کپڑے بدلنا عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے۔ بلکہ بعض فقہاء اور

محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشینہ پوش تھے اور محنت مزدوری کرتے

تھے۔ ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی۔ ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی

نماز پڑھنے کے لئے آئے تو لوگوں کو اس پشینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی رسول اللہ نے

یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے۔

۲۔ جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔ ۳۔

(۱۱) جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہئے۔ چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ

ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟

ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا۔ ۴۔

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہیں

دی ہے جو تشدد و غلو اور وہم و دوسوسہ کی حد تک پہنچ جائے۔ اس بنا پر اسلام نے بعض ان سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں

اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً یہودیوں کے مذہب کے رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لئے ضروری تھا کہ نہانے کے

بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو۔ لیکن اسلامی تعلیمات کے رو سے انسان کو اس معاملہ میں

صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہئے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائیں۔ اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو

کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ شدت احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور

کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نے

اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجا کرتے

ہوئے دیکھا ہے۔ ۵۔

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے

۱۔ یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھیے۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

۳۔ مسلم کتاب الصلوۃ۔

۴۔ ابوداؤد کتاب العباس باب فی غسل الثوب۔

۵۔ صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب مسح علی الخنجر۔

تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَأَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ﴾ (بقرہ-۲۸)

اور (اے پیغمبر! لوگ) تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہو لیں ان سے مقاربہ نہ کرو اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وقائع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو اور خود اپنے طرز عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور آپ کے سر کو دھوتی تھی۔ ایک بار آپ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی، میں نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔^۱

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جاسکتے، قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے۔ اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہؓ نے حالت جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ ”مسلمان نجس نہیں ہوتا“۔^۲ یعنی مسلمان جنابت اور حاجت غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں یعنی زمین میں گھسنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو۔ بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے۔^۳ یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے۔ ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے۔ جب بارش ہو تو ہم کیا کریں۔ فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں ”ہاں“ ہے۔ فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے۔ غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کر دی گئی ہے اور اسی لئے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ جو تازمین پر گر گز لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا۔^۴

۱۔ صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الخافض راس زوجہا۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لئے جائیں پھر کمر سے دھو کر نجا ست دور کر لی جائے پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے۔ آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے پہلے دونوں ہاتھ دھوتے پھر اپنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے پھر وضو کرتے۔ لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑوں کو ملتے پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ (مسند باب غسل بناء)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لئے ہر روز نہالے تو مباح ہے۔ آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہہ رہی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔



کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہئے۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا لے نہیں اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔ ۱ ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا ہی کی غلطی سے ہوگا اور اس کو اس تباہی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لئے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

(۲) مسلمانوں کا ہر کام اللہ کے نام سے شروع ہونا چاہئے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقاء اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے کتنا بڑا کام ہے۔ یہ کام اللہ کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لینی چاہئے۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ لیکن ایک بار ایک بدودوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے۔ ۲ اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ و آخرہ کہہ لے۔ ۳

(۳) انسان کو ضرورت کے منہ کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صفائی کا اقتضایہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لئے خاص کر دیئے جائیں۔ چنانچہ سب اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لئے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے۔ اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے۔ انسان کے زیادہ تر کام فطرۃ پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر کاموں کے لئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے جدھر قلب نہیں ہے۔ یعنی ”دایاں پہلو“ تاکہ کام کے پکڑنے اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ سب انسان فطرۃ سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بائیں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لئے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی چستی اور طاقت ہوتی ہے اسی لئے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہئے۔ ۴ صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ

۱ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

۲ ایضاً۔

۳ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

۴ ایضاً۔

۵ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔ مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا تھا اور بائیں جانب حضرت ابو بکرؓ تھے۔ آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔

ایک بار آپ ﷺ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔ اس نے کہا میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا۔ مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا۔

(۴) کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے بیچ سے نہیں کھانا چاہئے کیوں کہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بیچ جائے گی گندی نہ ہوگی دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔

(۵) اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دودھ کر کے نہیں کھانا چاہئے کیوں کہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معصوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا آ کر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھالے۔ یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص و طمع پر دلیل ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہئے۔

(۶) کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے کیوں کہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فتنہ نکالنے والے کی طرف سے جڑ اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے۔ اس لئے اگر اتفاق سے کھانا بد مزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہئے ورنہ چھوڑ دینا چاہئے۔

(۷) سب کامل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست و احباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی۔ لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے

۱۔ صحیح بخاری کتاب الاشریہ۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ترمذی ابواب الاطعمہ باب ما جانی کرہیۃ الاکل فی وسط الطعم۔

۴۔ سنن ترمذی ابواب الطعام۔

۵۔ بخاری کتاب الاطعمہ۔

۶۔ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

کہ برکت ہوتی ہے۔ اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا کوئی تھوڑا کھاتا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے۔ پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا شخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے مٹتا ہے۔ اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صی بنے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے۔ فرمایا غائباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو۔ صی بنے کہا ہاں۔ فرمایا کہ ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کر لو تو برکت ہوگی۔ ۱۔

(۸) کھانا ٹیک لگا کر بیٹھ کر یا منہ کے بل سو کر نہیں کھانا چاہئے۔ ۲۔ کیوں کہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس کے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے آرام نہیں پہنچتی ہے۔ کھانے کے سے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو ترا آری طرح پر بیٹھ کر کھایا جائے یا دو زانو بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور نوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر۔ ۳۔ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، میں بندہ ہوں غلاموں کی طرح کھاتا ہوں یعنی خاکساری سے۔ ۴۔

(۹) کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے۔ ۵۔ خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا نکلنا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لئے الٹی سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔ (۱۰) کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہئے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پونچھنا چاہئے۔

(۱۱) پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہئے۔ ۶۔ اس طرح پانی پینے سے پوری سیر ی ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں گرنے پاتی۔ (۱۲) پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہئے کیوں کہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکر وہ معصوم ہو۔ پھر یہ بھی معصوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے۔ اس لئے اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہئے۔

(۱۳) پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہئے کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے۔ البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو پچھ حرج نہیں کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے۔ ۷۔

۱۔ ایضاً۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الاطعمہ و ابن ماجہ کتاب الطعمہ و شرح سفراء فیہ و زآبانی مشیخ عبد حق محدث دہلوی۔

۴۔ ابوداؤد ابن ماجہ مع زرقانی علی السیرۃ ج ۴ ص ۳۹۸۔

۵۔ بخاری کتاب الاطعمہ۔

۶۔ بخاری کتاب الاطعمہ۔

مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہئے کیوں کہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ البتہ زمزم کا پانی برکت، دعاء اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

(۱۴) پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہئے۔ کیوں کہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنی پی لیا پھر یہ دیکھا نہیں جاسکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں۔

(۱۵) کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کر رکھنا چاہئے تاکہ اس میں رد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

(۱۶) کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے کھلایا اور پلایا۔ اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں۔ جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَعْصَمَنَا وَفَسَّاهُ وَجَعَلَ لَنَا اَنْفُسَيْنِ﴾ یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔ ۳



۱۔ ابو داؤد کتاب الاشربہ۔

۲۔ ایضاً موطا امام محمد۔

۳۔ صحیح مسلم کتاب الاشربہ۔

آداب مجلس

آداب مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہوتا کہ یہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو۔ ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

(۱) مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کی آنے تک پہنچ چکا ہے، وہیں بیٹھ جانا چاہئے یہ نہیں کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے۔ کیوں کہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔ لہٰذا انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں۔ جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لئے لعلی رقاب یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) مجلس میں کسی کو اٹھ کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہئے۔ لہٰذا اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے۔ دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ کیوں کہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

(۴) اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لئے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

(۵) اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔ کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہوگا

۱۔ ادب المفرد باب مجلس الرجل حیث یجلی۔

۲۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کرہی ان یقام الرجل من مجلس ثم یجلس فیہ۔

۳۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلس ثم رجع ہوا حق بہ۔

۴۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کرہی ان یجلس من الرجلین بغیر اذنہما۔

۵۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کرہی ان یقعہ وسط الحلقہ۔

اور چھٹوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی جو ایک قسم کی بد تمیزی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تاکہ سب کو ہنسائیں اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

(۶) مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہئے۔ ۱۔ کیوں کہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈنڈا شرک سے مل جاتا تھا۔ اس طرح ایک شخص کو یا اللہ بناتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جاسکتا۔

(۷) راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہئے کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور ہر آنے والے کو تکنا بد اخلاقی ہے۔ لیکن آرض ورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا صلہ دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔ ۲

(۸) انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے۔ ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری منہجت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحمیں ایک قلوٹ فوج ہیں جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے، ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ۳ ایک مشہور مثل ہے کہ ”اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ“۔ اس نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے۔ مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا یا اس کو خریدو گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلانے کی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔ ۴

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے۔ کسی دوسرے سے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ فرمایا کہ ”اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔“

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین سے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور

۱۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلس فی الطرقات۔

۳۔ ابوالمفرد باب الارواح جنود مجنۃ۔

۴۔ بخاری کتاب البیوع باب فی العطار و بیع المسک۔

آداب ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لئے جتنا ایک ثواب کا کام ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات ہو گیا تو ایسا پکارنے والا، اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لئے ایک مکان بنالیا۔^۱

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہئے۔ اسی لئے فرمایا کہ ”تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتا یہ بھی صدقہ ہے۔“^۲ ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے ”سَلَامٌ عَلَيْكُمْ“ (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے۔ چھوٹے بڑے کو بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

یہاں کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے۔ عرب کے لوگ ملاقات کے وقت ”سَلَامٌ عَلَيْكُمْ“ کہتے تھے۔ یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ تمہاری صبح خوشگوار ہو۔ امراء و سلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے ایرانی ہزار سال بڑی ہزار برس جیو کا فقرہ کہتے تھے۔ یورپ کے لوگوں میں صبح کو ”گڈ مرننگ“ (اچھی صبح) شام کو ”گڈ ایوننگ“ (اچھی شام) رات کو ”گڈ نائٹ“ (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے۔ مگر اسلام نے سب کے لئے ”سَلَامٌ عَلَيْكُمْ“ کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں:

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں ”وَسَلَامٌ عَلٰی (مریم)“ یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں ”وَسَلَامٌ عَلٰی الْخُرَسٰی“ ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دنیوی تسبیحات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

(۳) اس میں مذہبی شان پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف اہم اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

(۴) اس میں مباحذہ امیر تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی کو نشا آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعدؓ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ و اوس کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کیا کریں تو آپ نے

۱۔ ترمذی کتاب البر والصلة باب ما جاء فی زیارة الاخوان۔

۲۔ ترمذی کتاب البر والصلة باب ما جاء فی صلوات المعروف۔

ان کو اس کی اجازت نہیں دی۔ ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے فرمایا ”نہیں“ اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے فرمایا ”نہیں“^۱ اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے فرمایا ”ہاں“۔

(۵) دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعادی جاسکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال آل و اولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی پر مشتمل ہے۔

(۶) جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

(۷) اسلام نے اپنے پیروں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور ”واچ ورڈ“ مقرر کیا ہے آئیں سامنے جب یہ دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بگائگی کے باوجود آشنائی کی ایک ہرپاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملت محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ افْعَلُوا السَّلَامَ، وَاطْعَمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا وَالنَّاسَ بِسَامٍ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ﴾^۲

”گو اباہم سلام کو پھیلانا کھانا کھلاؤ اور جب تم لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔“

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ ”تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاد۔“^۳

سلام کرنے کے لئے شناسا و غیر شناسا جانے اور انجان کی تخصیص نہیں۔^۴ مرد اور عورت کی تفریق نہیں۔^۵ بڑے اور بچے کی تمیز نہیں بلکہ البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں

۱۔ ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأة۔

۲۔ یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی محذور ہو مثلاً مٹنے والا مرد ہو یا کوئی درشتیوت انگیز صورت ہو۔

۳۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ۔

۴۔ ترمذی ابواب الزہد ص ۳۰۹۔

۵۔ ترمذی کتاب استیذان باب ماجاء فی الفشاء السلام، بخاری کتاب الاستیذان باب سلام بالمعروف۔

۶۔ ابن ماجہ کتاب استیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال۔

۷۔ بخاری کتاب استیذان باب التسلیم علی الصبیان۔

راج تھے ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لفظ کرے اور اس اصول کی بناء پر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو اس اصول کی بناء پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہئے۔^۱

ان مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا۔^۲ مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے۔^۳ سلام میں رحمة اللہ و برکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ”السلام علیکم“ آپ نے فرمایا ”اس کو دس نیکیاں ملیں“۔ دوسرا آدمی آیا تو کہا ”السلام علیکم ورحمة اللہ“ آپ نے فرمایا ”اس کو بیس نیکیاں ملیں“۔ تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا ”السلام علیکم ورحمة اللہ و برکاتہ“ آپ نے فرمایا ”اس کو تیس نیکیاں ملیں“۔^۴

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرائے چنانچہ خود فرمایا قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے:

﴿وَإِذَا خِيتُمُ تُحِيَّةً فَحَيُّوا۟ - حَسِّنْ مِنْهَا أَوْ رُدُّوہَا﴾ (۱۰۰)

۱۰۰ (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

اس سے ملاحظہ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ احتساباً یہ نا کافی ہے۔

(۲) ملاقات کے وقت اظہار محبت اور اظہار مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جز قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کا مکمل ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے^۵ مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے^۶ اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ بعض حالات میں ملاقات کے وقت معافقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے ممانعت آئی ہے لیکن اگر شرعی مجبوری نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے چنانچہ ایک بار حضرت زید

۱۔ کتاب الاستیذان باب فی تسیم الراکب علی الماشی۔

۲۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ۔

۳۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم عند القیام والمقعود۔

۴۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ما ذکر فی فضل السلام۔

۵۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی المصافحہ۔

۶۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ۔

بن حارثہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے سے لگالیا اور ان کا بوسہ لیا۔ ۱۔
 کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں
 حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی
 جگہ ان کو بٹھاتے تھے اور جب آپ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں ایک موقع پر جب حضرت سعد
 بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔ ۲۔
 دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے اسلام نے ان کو ایک قلم
 منسوخ کر دیا ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے
 لئے کھڑے ہوتے تھے اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے آپ ﷺ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے
 کے لئے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے غجی کھڑے ہوتے ہیں۔ ۳۔

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔ ۴۔
 (۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی کے گھر میں جانے کے لئے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا
 ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا
 ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ
 وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ﴾ (نور: ۲۷)

مسئلہ نو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھئے اور ان سے سلام عید کے بغیر نہ جایا کر دے
 تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب یہ موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر
 اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر
 میں کوئی ہو اور) تم سے کہ جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تاہل) لوٹ آؤ یہ (لوٹ آنا)
 تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو پنچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لئے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ ۵۔
 کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں لیکن
 اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے

۱۔ ترمذی کتاب الاستیعاذ باب ماجاء فی المعانقہ والقبلة

۲۔ بیرونیوں واقعے ابو داؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التیام میں ہیں

۳۔ ابو داؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل

۴۔ ترمذی کتاب الاستیعاذ باب ماجاء فی مرحبا

۵۔ ترمذی کتاب الاستیعاذ باب ماجاء فی النمی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجہن

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا اس لئے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے ۱ تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے ایک بار ایک شخص آئے اور آپ ﷺ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی سے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے ۲ ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔ ۳ ایک بار کسی نے آپ ﷺ کے حجرہ میں تاک جھانک کی آپ اس وقت ایک لوسبکی شگھی سے سر جھانڈ رہے تھے فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمھاری آنکھوں میں کوچ دیتا پھر فرمایا ﴿إِنَّمَا جَعَلَ الْإِذَاءُ مِّنْ قِبَلِ الْمَصْرُ﴾ یا فرمایا ﴿إِنَّمَا جَعَلَ الْإِسْتِذَاءُ مِّنْ أَهْلِ الْمَصْرِ﴾

یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لئے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں ۵

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ ۱ تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے ۲ البتہ اگر کسی کو خود بدایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ۳ اگر کوئی شخص گھر کے اندر میں بیٹھا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے ۴ دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے چمک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں ۵ خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیے اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آئیں گی تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لئے تھے لیکن چمک لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی خدام اس لئے اگر ان کے لئے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں ان

۱ ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی عورات الثلاث

۲ ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب

۳ ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان

۴ ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبلہ لیس و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففتوا عینیہ فلا یدلہ

۵ اس کتاب کے صفحہ ۹۸ میں اس حدیث کے تحت یہ ہے کہ میں نے اس حدیث کو دیکھا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے گھر میں آئے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت ہے

۶ بیہقی بخاری کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبلہ لیس و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم

۷ ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان

۸ ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان

۹ ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان

۱۰ ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان

۱۱ ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان

کے لئے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے اور خواہ قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین فرمائی ہے یعنی نماز عشاء کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے اور دوپہر کو جب قیلور کے لئے کوئی لینے کہ یہ بھی تحیید کا وقت ہے فرمایا

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنَكُمْ الَّذِينَ مَكَتَ إِلَيْكُمْ وَتَدِينُمْ لَمْ يَنْتَعُوا الْحُكْمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ . مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَصْعُقُونَ أَيْدِيَكُمْ مِنَ الظَّهْرِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدُهَا . طَوَّافُونَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ . كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ . وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ . وَإِذَا بَعَاعُ الْأَطْفَالِ مِنْكُمْ الْحُكْمَ فَيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (نور: ۱۰)

مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سن جو غ کو نہیں پہنچے تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں (ایک تو نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کے لئے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر چھٹا نہ اور نہ (بے اذن چھ آنے میں) ان پر (چھٹا نہ یونہی وہ) اثر تمہارے پاس آتے جاتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے) کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور (مسلمانو!) جب تمہارے بڑے حد جو غ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لئے) اذن مانگا کرتے ہیں اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہئے۔



آداب گفتگو

آداب گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو۔

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيْسًا﴾ (۲-۱۰)

تو تم ان سے نرم بات کہنا۔

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو فائدہ مند ہو اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو اسی لئے فرمایا:

﴿وَقُولُوا لِنَاسٍ خَيْرًا﴾ (۱۰-۱۰)

اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو۔ یہود آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے اضطراب (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ راعا کہتے جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعَا وَقُولُوا انْظُرْنَا﴾ (۱۳-۱۰)

اے ایمان والو! راعا نہ کہو! نظر تا کہو۔

اس کی پوری تفصیل سورہ نساء رکوع ۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں نزائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا، يُصْهِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيُعْزِلْ عَنْكُمْ دُنُوبَكُمْ﴾ (۱۰-۱۰)

اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ کرو اور بات سیدھی کہو اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو فرمایا۔

﴿وَلَا تَحْصُرْ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَيُفْتِنُوا قَوْلًا مُّغْرِبًا﴾ (۱۱-۱۰)

تو (اے نبی کی بیوی) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ اللہ جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کرے گا، وہ بات کرو تو معقول ہے ناگ۔

مردوں کو نرم معقول اور دل جوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا

ہے فرمایا

﴿قَوْلٌ مُعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَنَصَّلُهَا آدَى﴾ (ترمذی ۳۶۰۰)

نیک بات کہنی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ بے موقع چبّ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے فرمایا:

﴿وَاعْضُضْ مِنْ صَوْنِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ (ترمذی ۲۰۰۰)

اور کچھ اپنی آواز پست کر کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔

فضول باتوں سے پرہیز کرنا دقار کی نشانی ہے مسلمانوں کی صفت یہ ہے۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ (مومنون ۱۱)

اور جو لغو سے اعراض کرتے ہیں۔

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر اللہ کا فرشتہ گواہ رہتا ہے اللہ فرماتا ہے۔

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق ۲)

آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے۔

اس لئے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ

وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔“ ۱۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم

اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے ایک اور حدیث میں

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو

ادھر توجہ نہ دے۔“ ۲۔ یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں

دریا بند ہے مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لئے ملی ہے اسی لئے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی ”نَفْلُکَ“ کا مقصد و معنی

درست اور صحیح ہوں پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں اگر کوئی

مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا

جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جاتے نہ دیا جائے۔

﴿وَإِذَا حَاصِلُهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ (آل عمران ۱۰۱)

اور جب نامکمل ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔

گفتگو بضرورت کرنی چاہئے احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہیں اور

بکواس میں مبتلا رہتے ہوں اور فرمایا کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں ۳۔ یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو

۱ کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار الضیف۔

۲ موطا و شرح سلہامی باب جاء فی الصدق والکذب وترجمہ کتاب الزہد۔

۳ ابوالغفر باب فضول الکلام۔

اللہ تعالیٰ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے۔^۱ یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں اسی لئے آیا ہے کہ جو دونوں چیزوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا۔^۲

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے بلکہ اس کو وہاں کر کہا جائے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا احوال فرماتے تھے (ابو داؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث) اور گفتگو اتنی جدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لاسکے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔^۳ حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں جھلت نہیں فرماتے تھے اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں:

﴿كَانَ كَلَامُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَلَامًا مُفَصَّلًا يَفْهَمُهُ كُلُّ مَنْ سَمِعَهُ﴾^۴

رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا، جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا۔

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہئے ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا حضرت عمر بن العاصؓ نے سن تو فرمایا کہ اُردو یا نہروں اختیار کرنا تو اس کے لئے بہتہ ہوتا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں کیونکہ اختصار بہتر ہے۔^۵

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا رویہ بنایا جاتا ہے کبھی اس سے صرف تفرق مقصود ہوتی ہے ان اغراض کے حاصل کرنے کے لئے لوگ نہایت مسجع، مقفی اور مختلف آمیز تقریر کرتے ہیں گفتگو کو طول دیتے ہیں چہاں چہاں کے باتیں کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ”اللہ اس بلیغ آدمی کو مغضوب رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مڑتا ہے جس طرح نیل اپنی زبان کو توڑ مڑ کے کھاس کھاتا ہے۔“ نیز فرمایا کہ ”جو شخص اسلوب کلام میں اس لئے اول بدل کرتا ہے کہ

۱۔ موطا امام مالک باب یومر بہ من التحفظ فی الکلام۔

۲۔ موطا امام مالک باب ما جانی ما ینافی من اللسان۔

۳۔ ابو داؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث۔

۴۔ ابو داؤد کتاب العلم باب فی سرائر الحدیث۔

۵۔ کتاب التبیان باب فی التام۔

۶۔ ابن ماجہ کتاب التبیان باب فی التام۔

اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے اللہ قیامت کے دن اس کا فدیہ تو بہ نہ قبول کرے گا۔^۱
 جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف
 منہ کیا جائے تاکہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔^۲



۱۔ ابو داؤد کتاب الادب باب ما جاء فی المعتقد فی الکلام۔

۲۔ ابوالفرد باب اذا حدث الرجل لا یقبل علی واحد۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہئے اللہ اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے۔

﴿وَعَاذَ الرَّحْمَنُ الْمَدِينِ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً﴾ (نور - ۶)

اور رحمت والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے یعنی چال میں غرور اور تکبر کے انداز نہ ہوں فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَنَ تَتَّخِذَ الْوُدَّ نَاصِيَةً﴾ (نور - ۱۲)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَبِرٍ فَخُورٍ﴾ (نور - ۱۲)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل بے شک اللہ مغرور اور فخر کو پسند نہیں کرتا۔

عورت کو بچنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا چھانچھ پھن کر چنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشار خیال پیدا ہوتا ہے عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گزرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے سنے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں اس سے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا۔

﴿وَلَا يَصْرُفُ سَارِخَلَهُمْ لِيُنْجَمَ مَا يُحْضِينَ مِنْ رِيْسَتِهِمْ﴾ (نور - ۱۳)

اور (چنے میں) اپنے پاؤں، ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپائے جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آجائے تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے لونڈی نہیں۔ پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّسَاءُ فَارْجِعْنَ خُصْبَ بَنَاتِكُنَّ إِلَى الْبُيُوتِ وَلَا يَتَّبِعْنَهُنَّ مِنْكُمْ أَكْثَرُ حُلِيِّهِنَّ﴾ (احزاب - ۸)

اؤئی ان یغرفن فلا یؤذین (احزاب - ۸)

بہنیں اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو گھراؤ کے نیچے نکالیں، اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے لگتا ہے کہ پھپھائی پڑیں! تو کوئی نہ ستائے۔

﴿وَقُلْ تَتَّقُونَ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَإِذَا بَدَأْتُمْ خُصْبَ بَنَاتِكُنَّ وَلَا يَتَّبِعْنَهُنَّ مِنْكُمْ أَلَا مَاطْهَرٌ﴾

مہا و لیصربن بضمہ علی خنوبہن ولا یئدبن رستہن الا ینغوتہن (نور - ۱۴)

شیخ لوگ جانیں۔ یہ شریف خاتون ہیں ان کو بولی راستہ میں پیچھے نہیں۔

اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا سہ چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں مگر جو (فطرۃ) کھل رہا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو۔

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہئے کیونکہ اس سے میلان طبع پیدا ہوتا ہے اور عورت کا یہ خیال بر ملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافت نسوانی کے خلاف ہے۔ راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہئے اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستے کے کنارے سے چلنا چاہیے۔ ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا اور اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں۔^۱

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہئے یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔^۲

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لئے جوتے پہنے جائیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کر یعنی جوتے پہن کر چلا کر دو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔^۳ جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہئے یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہئے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو۔^۴ کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔^۵



۱۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطريق۔

۲۔ صحیح مسلم باب استحباب ایتان الصلوۃ بوقار۔

۳۔ ابوداؤد باب الاعتعال۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ترمذی کتاب بلباس باب المشی فی نعل واحدۃ۔

آداب سفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا اس وقت زمانہ کے حالات اور سوار یوں کے طریقے اور تھے اس لئے اس کے آداب عرب کی سرزمین عرب کی آب و ہوا اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے۔ عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھر پٹی پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں جن کو زیادہ تر پیدیں سفر کرنا پڑتا ہے اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضروریات زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

(۱) سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہئے اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہئے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہئے جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے۔ ۱۔
﴿ اَسْتَوْذِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيمَ اَعْمَالِكُمْ ﴾
جی تمہارے دین، امانت اور خاتمہ عمل اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئے ۲۔ اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ پورا دن کام میں آجاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

(۳) سفر تنہا نہیں کرنا چاہئے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔ ۳۔ اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اسباب سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔
(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہئے۔ ۴۔ اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں

(۵) سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہئے بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہئے۔ ۵۔
(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہئے۔ ۶۔

۱۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء للوداع۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الایثار فی السیر۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسار وحدہ۔

۴۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یومرون احدہم۔

۵۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔

۶۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی۔

(۷) سفر رات کو کرنا چاہئے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے۔
اور درحقیقت لو گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہر حال عرب کی سر
زمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

(۸) مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہئے۔

(۹) رات کو مقدم راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہئے، کیونکہ راستہ سے جانور گزرتے رہتے ہیں اور موذی
جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ ۱

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہئے، کیونکہ سفر بہر حال تکلیف اور بے اطمینانی
کی چیز ہے۔ ۲



۱ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعة السیر۔

۲ مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاة مصلحتہ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطريق۔

۳ مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعہ من العذاب۔

آداب خواب

غیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ﴾ (روم-۳)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔

سورہ فرقان میں فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ مَبَاسًا وَجَعَلَ السَّهَارَ أَشْوَارًا﴾ (فوقن-۵)

اور اسی نے تمہارے لئے رات کو پردہ غیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔

سورہ نبا میں ہے

﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُباتًا، وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا، وَجَعَلْنَا السَّهَارَ مَعَاشًا﴾ (نبأ-۱)

اور ہم نے غیند کو تمہارے لئے آرام اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ غیند کے لئے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لئے ہے۔ یعنی

دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گزرے البتہ دو پہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلول کہتے تھے جس کا ذکر سورہ نور ع ۸ میں ہے۔

﴿حِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ﴾

اور رات آرام میں گذاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں اللہ کی یاد کی جائے۔

جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن

بناتے ہیں وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے۔ یہ تو عام افراد کے لئے ہے لیکن خاصان خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ﴾ (ذاریات-۱)

یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔

(۱) سنت نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں نماز عشاء پڑھنے سے پہلے سونا نہیں

چاہئے کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے اور نماز عشاء پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہئے۔ یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں اللہ کی عبادت میں غیند کی کمی کے سبب سے سستی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نماز عشاء کے بعد اس کے لئے بات چیت کرنا منع نہیں چنانچہ حضرت

ابو بکرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نماز عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے۔ ۱۔

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے۔ ۲۔

(۳) ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو۔ ۳۔ کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا

اندیشہ ہے۔

(۴) پاکی کی حالت میں سونا چاہیے بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔ ۴۔

(۵) پیٹ کے بل نہیں سونا چاہئے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو

فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ اللہ کو پسند نہیں۔ ۵۔

(۶) ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے۔ ۶۔ کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہ بند

باندھتے ہیں اس لئے اس میں کشف عورت کا احتمال ہے البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ

ایک بار خود رسول اللہ اس طریقہ سے لیٹے تھے۔ ۷۔

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے چراغ کو بجھا

دینا چاہیے کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی تکی کو لے جاتے ہیں جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ

ہے۔ یہی حال آگ کا بھی ہے۔ ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

آگ تمہاری دشمن ہے جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو۔ ۸۔

(۸) سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہئے سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے:

﴿اللَّهُمَّ بِاسْمِكَ أَخْنِي وَأَمُوتْ﴾

اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔

اور جاگے تو کہے۔

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَحْيَانَا تَعَذَّ مَا آمَاتَنَا وَإِلَيْهِ الشُّورُ﴾

اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلا یا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔

حدیثوں میں اس موقع کے لئے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

صحیح مسلم باب اکرام المضيف۔

ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم۔

ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر حجر۔

ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم وباب فی النوم علی طہارۃ۔

ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل یطبخ علی رطلہ۔

ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کرہۃ فی ذلک۔

ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی وضع احدى الرجل علی الاخری مستلقاً۔

بخاری کتاب الاستیذان باب لا یترک النرفی البیت عند النوم وباب اغلاق الابواب باللیل مکر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب

گھر کی چھتیں پست ہوں اور تکی کا پرانا دیا جا یا جائے۔

آداب لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی۔ جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں۔ اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزء ٹھہرایا یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے ستر کے بالوں سے لے کر گھٹنوں سے گنوں تک اور لونڈیوں کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے۔ جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں یہاں تک کہ تنہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں۔ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو فرمایا: اللہ تو دیکھتا ہے اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو ضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو۔ ۱

حضرت آدمؑ اور حواؑ کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے اللہ کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے۔

﴿فَمِمَّا دَافَا الشَّجَرَةَ نَدَتْ لَهُمَا سَوَاتُهُمَا وَطَفَقَا يَحْصِفْنَ غَيْبَهُمَا مِنْ وُرْقِ الشَّجَرَةِ﴾

(۲- انف)

تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے مگر دنیا میں آ کر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں عرب میں بھی یہی حال تھا بلکہ حج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے۔ ۲ ورنہ یوں ہی ننگے پھرا کرتے تھے وحی الہی نے انسانوں کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا۔

﴿يَسَىٰ أَدَمُ قَدْ أَسْرَلْنَا عَنِكُمُ لِمَا يُوَارِي سَوَاتِكُمْ وَرِيشًا وَلِنَاسِ التَّقْوَىٰ ذَلِكُمْ خَيْرٌ﴾

(۳- اعراف)

- ۱۔ ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم۔
- ۲۔ عورت کا چہرہ قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔
- ۳۔ سنن ترمذی ابواب الاستغناء ان والا داب باب ما جاء فی حفظ العورة۔
- ۴۔ ایضاً باب ما جاء فی الاستتار۔

اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

﴿يَسَىٰ آدَمُ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (اعراف-۳)

اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ﴾ (اعراف-۳۱)

کہو اے! کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے منع کیا ہے۔

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (اعراف-۳۱)

کہو اے! کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں منع کیا ہے۔

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا وہ

ستر پوشی ہے۔ ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے پہلی آیت

کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے۔

﴿وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ﴾ (اعراف-۳۱)

اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

پرہیزگاری کے لباس سے کیا مقصود ہے؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان دوسروں نے اعمال صالحہ یا شرم

و حیا مراد لی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے اسی لئے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی

پر محمول کیا ہے۔ مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان

کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں^۱ لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہوتا ہے

صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیزگاری کا لباس مراد ہے یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا

منشاء ہے اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی تولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرمادیا ہے۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں ”اب وہی لباس پہنو جس میں

پرہیزگاری ہو مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت ہار یک نہ پہنے کہ لوگوں

کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے۔“^۲

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے اس حد بندی کی تشریح احادیث کے

مطابق حسب ذیل ہے:

۱۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بننا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہئے کیونکہ اس سے زنانہ پن

کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔

۱۔ صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل۔

۲۔ روح المعانی تفسیر آیت مذکور۔

ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ وہ کسی کی کڑیاں بدن میں نہ چسبیں یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھر دراپن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگا لے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

۲۔ مردوں کے لئے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لئے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور و طریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور و طریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

۳۔ عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنا لباس فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لئے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا اسی لئے مرد کو پانچامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ پانچامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

۴۔ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں پہننا ٹھیک نہیں۔ خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشائیں ہوں یا مولویوں کا نمائشی عبا جبہ یا صوفیوں کا گیر دارنگ۔ کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشاء اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے عورتوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ”کتی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں نکلی رہتی ہیں۔“

۶۔ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہن کر حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ نے فرمایا: اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کچھ کھولنا حلال نہیں۔

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے زرد رنگ کے کپڑے پہنے جاسکتے ہیں آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے۔ البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں اور خوشبو کے لئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا مردوں کے لئے منع ہے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ نے باندھا ہے سیاہ رنگ کا عمامہ بھی زیب سر فرمایا ہے۔

۸۔ مردوں کے لئے عام طور سے سفید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

۹۔ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہئے۔

۱۰۔ نیا لباس پہنتے وقت آپ ﷺ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے یہ دعا پڑھتے تھے۔ ۱

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَسَانِي هَذَا وَزَقَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَقُوَّةٍ﴾
 اس اللہ کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)



آداب مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں۔ مال و دولت، علم، فضل، عہدہ و منصب، شہائی بیہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہار مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

﴿ اذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴾ (قصص-۸)

جب کہا اس کو اس کی قوم نے اتر امت اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے اس لئے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے۔

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ اِنَّهُ لَيَفْسُقُ كَفُوْرًا ۚ وَلَئِنْ اَذَقْنَاهٗ نَعْمًاۢ بَعْدَ صِرَآءٍ مَّسْتَهٗ لَيَقُوْلُنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَلَيْنَاۤ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴾ (حدود-۲)

اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر پھر وہ جھین لیں اس سے تو وہ ناامید نا شکر ہوا، اور اگر ہم چکھادیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے کس برا بھلا مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتے بڑائیاں کرتا۔ اور اس کی ممانعت کی ہے۔

﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اَنْتُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ (حدید-۳)

اور نہ اتر اتر اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اتر اترنے بڑائی مارنے کو۔

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے بلکہ معتدل طریقہ پر اظہار مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدہ شکر بجالانا چاہئے تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیاز مندی کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے۔

ایک بار مکہ سے مدینہ جا رہے تھے جب غروراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے اس کے بعد دیر تک دعا کی پھر سجدہ میں گر پڑے اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں نے اللہ سے اپنی امت کے لئے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ٹکٹ امت کے لئے قبول کر لی، اس لئے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے سرائٹھا کر اپنی امت کے لئے بھی درخواست کی تو اس نے میری ٹکٹ امت کے لئے اور میری درخواست قبول کی اس لئے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ٹکٹ امت کے لئے اور میری التجا کو قبول کیا تو میں اپنے اللہ کے لئے سجدہ میں گر پڑا۔

صحابہ کرام کا یہی دستور تھا۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارک باد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارک باد دی۔ ۱

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے اس موقع پر اعزہ و احباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا ۲ اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے منیۃ الوداع تک جا کر آپ کا استقبال کیا جس میں بچے بھی شامل تھے۔ ۳

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

﴿فصل ما بین الحلال والحرام الدف والصوت﴾ (ترمذی کتاب نکاح باب ما جاء فی اعلان نکاح)

حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیع بنت معوذ بن عمرو کا نکاح ہوا تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں جو غزوہ بدر میں شہید ہوئے تھے اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا۔

﴿وَفِينَا سَبِيٌّ بَعَثَ مَافِي غَدٍ﴾

ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور جو گاری تمہیں اسی کو گاؤ۔ ۴

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول

۱ ابوداؤد کتاب جہاد باب فی سجد الشکر۔

۲ بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک۔

۳ ابوداؤد کتاب الاطعمۃ باب الاطعام عند القدوم من السفر۔

۴ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القتلی۔

۵ بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ۔

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، حالانکہ انصار یہ گیت پسند ہے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک بوند نہ کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی۔ ۲

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے اتنے میں عمر بن سعدؓ آیا تبھی آگئے انھوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے انھوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بیٹھ کر سنو رسول اللہ ﷺ نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے۔ ۳

عربوں میں رسم تھی کہ دولہا کو باسرفاء و السبیل کہہ کر عیش و آرام اور اولاد دینے کی دعا دیتے تھے آنحضرت ﷺ نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی۔

﴿بارک اللہ لک وبارک علیک وجمع بینکما فی خیر﴾ ۴

تمہارے لئے اللہ مبارک کرے تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے اس کو ولیمہ کہتے ہیں۔ جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو ۵ اور خود کبھی پنیر کھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں ۶ اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں۔ ۷

مسلمانوں کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن پیش آتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کئے تھے جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ پہلے دو دن خوشیاں مناتے تھے اب اللہ نے ان کو تمہارے لئے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن ۸ خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہار مسرت کے لئے پسند کیا گیا عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بناء اور فتح کی اور

۱ بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمہ۔

۲ بخاری کتاب النکاح باب النسوة یہدین المرأة الی زوجہا ودعا من بالبرکۃ مع فتح الباری۔

۳ نسائی باب المہو والغنا عند العرس۔

۴ ابوداؤد کتاب النکاح باب ما ینال للزوج۔

۵ بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولوبیثۃ۔

۶ نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر۔

۷ نسائی باب الہدیۃ لمن عرس۔

۸ نسائی کتاب صلوة العیدین۔

عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔

ان دونوں میں اظہارِ مسرت کے لئے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دولونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں وہ اشعار گارہی تھیں جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے اسی حالت میں حضرت ابو بکرؓ آئے اور کہا کہ ”شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ کے گھر میں“۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اے ابو بکر! ہر قوم کے لئے عید کا دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے۔“۔ یعنی اس دن گانا مباح ہے۔ ۲

جیسی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا اور جشیوں سے کہا کہ "ہاں بنو ارفدہ!" اس سے آپ ﷺ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ "بس" انھوں نے کہا "ہاں" ارشاد ہوا تو جاؤ۔ ۳

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام "تقلیس" تھا جس کے معنی دف بجانے کا ہے اور دلچسپی کے لئے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ بڑے اور لڑکیوں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر روان تھا کہ جب صبح کو کسی جگہ عید کے دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا تو ان کو تعجب ہوتا تھا چنانچہ ایک بار حضرت عباس اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ کے پاس لوگ "تقلیس" کیا کرتے تھے اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں۔ بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے ”قلیس“ ہوتی تھی۔“ ۳

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جن میں ہر گھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساط خاطر کا اظہار کر لے اسی نے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے، ایل و عیال سے لے کر اٹھانے اور یاد الہی کے ہیں۔ ۵

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے۔ غفلت نہ ہو اسی نئے عید کے دنوں موقعوں پر
 • نانا ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عید گزرتا ہے۔ راستہ سے لوٹیں تاکہ ہر طرف
 اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو اور اِنْ شَکُروا لِلّٰہِ عَنی مَا هَدٰکُمْ (بقرہ ۱۶۳) میں قیل ہو۔

۱۔ بخاری باب سے العیدین لامل الاسلام۔

۲۔ بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں۔

٣ بخاری باب الحراب والدرق يوم العيد۔

٣ ابن ماجه كتاب الصلوة باب ما جاء في انقليس يوم العيد.

۵ شرح معانی، ماہنامہ طبعی و ص ۴۲۹، یہاں حوالہ کا ترجمہ ملے وہاں سے حلف اٹھانے پر دیکھو۔

آداب ماتم

خوشی اور غم تو ام ہیں جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گزر جاتا ہے عربوں میں فخر و غرور اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہو گئیں تھیں فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا اس لئے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے سب سے مقدم یہ کہ میت جس درجہ کا ہوا اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہئے چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

﴿ ادا مت فابکینی لما ان اهلہ و شقی غنی الحیب یا اسة معد ﴾
جب میں مر جاؤں تو میرے لئے میرے درجہ کے موافق رونا اور میرے لئے گریبان کو چاک کر ڈالنا۔
منہ پر تھنپھ مارنا، چھاتی کو ٹٹا سر کے بال کھول دینا عام رسم تھی اور شعراء اس کا فخر یہ اظہار کرتے تھے۔

﴿ من کان مسروراً بمقتل مالک ﴾
جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا۔

﴿ فلیات نسوتنا بوجه نہار ﴾
تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آ کر دیکھے۔

﴿ یجد النساء حواسرا یندبنہ ﴾
وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں۔

﴿ یلطمن و جھمن بالاسحار ﴾
اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر ٹھانچہ مار رہی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا آپ نے فرمایا کہ جو ”فحش گریبان پھاڑتا“ اور گالوں پر ٹھانچہ مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے وہ میری امت میں سے نہیں۔“ یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا آپ نے منع کرا بھیجا وہ باز نہ آئیں دوبارہ منع فرمایا جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ ”ان کے منہ میں خاک بھر دو۔“

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں رفته رفته یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہو گئی تھی یعنی کسی میت کے لئے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت

۱۔ ترمذی کتاب البہائم باب ما جاء فی النہی عن ضرب الحدود

۲۔ صحیح بخاری کتاب البہائم باب من جلس عند المصیبت عرف فیہ الحزن۔

کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ”وہ کون سی بات ہے جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے“۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ ”نوحہ نہ کرو“۔ وہ بولیں کہ میرے بچانے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئیں تھیں ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے آپ نے منع فرمایا لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی لیکن وہ خاتون آنحضرت ﷺ کا اصلی منشاء سمجھ گئیں تھیں اس لئے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہیں ہوئیں۔ ۱۔

دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں اس کو عربی میں ”نہی“ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو (فرمان نبوی کی اس قدر احتیاط نہ نظر تھی کہ وصیت کی کہ ”میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا میں نے آنحضرت ﷺ کو اعلان مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو۔“ ۲۔

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے اور بخوردان جلا کر لے جاتے ۳۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہو سکتا ہے تب یہ مطلب ہوگا کہ ”جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجانہ لے جائے۔“ ۴۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے ایک عورت انکھٹی لے کر آئی آپ ﷺ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی۔ ۵۔

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا ایک دفعہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بددعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا۔ ۶۔

آنحضرت ﷺ نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی اور فرمایا کہ کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش و زیبائش کرے۔ ۷۔

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے آنسو لکھنا جو فطرت کا اقتضا ہے برائیاں نہیں۔ لیکن زور زور سے چیخنا چلانا مین کرنا منع ہے اور اس پر سخت تہدید فرمائی آنحضرت ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے جب وفات پائی تو آنحضرت

۱۔ ترمذی تفسیر سورہ محمد۔

۲۔ ترمذی کتاب الجنائز باب کرہۃ النہی۔

۳۔ باب الاسلام بہم ما قبلہ ص ۱۹۹۔

۴۔ ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یقع بہا لیت مع بذل لعمود فی شرح ابی داؤد۔

۵۔ اسد الغابہ جلد ۲ صفحہ ۳۹۵۔

۶۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن العسلب مع الجنائز۔

۷۔ ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی عدۃ التوفی عنہا زوجہا۔

ﷺ کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے۔ ۱۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے“۔ صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلاف ہیں۔ جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر و غرور کے لئے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے اس وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز دوست یا محلہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہوتا ہے آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا۔ ۲۔

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے صبر اور دعا دفع غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ وَاسْتَعِظُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (بقرہ۔ ۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے یہ نہیں کہ شروع میں خوب روپیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رورہی تھی سمجھایا مگر وہ نہیں مانی بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیے۔ ۳۔

اللہ فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے ﴿قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ (بقرہ۔ ۱۶۱) اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو ان اللہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے جو کچھ ہوا اللہ کے حکم اور مصلحت سے ہوا یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتایا ہے۔

﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ﴾ (حدید۔ ۳)
تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔

۱۔ مسلم کتاب الفضائل باب رحمۃ ﷺ العیال۔

۲۔ فتح الباری جلد ۳ ص ۱۲۲۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الجہان باب صحت الطعام لائل المیت۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے مثلاً جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے آہ آہ یاہ یاہ کی ناگواری آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر مسخ شدہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے ”جمائی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے۔“ ۱۔ بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے ۲۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے ۳۔ اس لئے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے اور یاہ یاہ نہیں کہنا چاہئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے۔ ۴

(۲) جمائی کے برخلاف آپ ﷺ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے بلکہ اس کو اللہ کی جانب سے بتلایا ہے ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے جھٹکے پھٹکے ہونے مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے لیکن جمائی بدن کے ٹھنڈے اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے اس لئے چھینک عمل کے لئے نشاط اور جمائی اس کے لئے کسل پیدا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفاء کا ذریعہ بن جاتی ہے اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر اللہ کا شکر کرے اور ”الحمد للہ“ کہے دوسرے لوگ اس کے جواب میں ”یرحمک اللہ“ کہیں۔ ۵

(۳) تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے۔ بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے۔ اس لئے چھینکنے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہئے اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔ ۶

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے خصوصاً بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمائی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور ان کی تضعیف و تردید نہیں کی ہے ۷۔

۱۔ ایضاً۔

۲۔ ترمذی کتاب الاستیعاذ باب ما جاء ان اللہ يحب العطاس ويكره التشاؤب۔

۳۔ ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء في التشاؤب۔

۴۔ حجة اللہ بالاعادب۔

۵۔ ترمذی کتاب الاستیعاذ باب ما جاء ان اللہ يحب العطاس ويكره التشاؤب۔

۶۔ ایضاً کتاب الاستیعاذ باب ما جاء كيف يمسح العاطس۔

بعض کی تائید کی ہے^۱۔ بہر حال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے اس لئے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

ذکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کے سامنے ذکاری تو آپ نے فرمایا کہ اپنی ذکار کو روکو کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے اس حدیث سے پر خوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ذکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے۔

آداب کا فلسفہ

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ الباہظہ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد و نوش، نشست و برخاست اور وضع و لباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات میں فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے اور اس میں مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔

(۱) بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمت طبعی کے قواعد پر رکھی ہے اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کی رو سے مفید ہیں۔

(۲) بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں، حکیموں، ویرانہوں کی تقلید کی ہے ان کے علاوہ اور اصول و قواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض مضر ہیں اور بعض میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں ہے اس لئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے اور جن میں نفع و نقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباہت کی حالت میں قائم رکھے جائیں ان مصلحتوں کی بناء پر شریعت نے ان سے بحث کی اور ان امور ذیل کا لحاظ رکھا:

۱۔ ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات اللہ بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی اس لئے شریعت نے ان سے پہلے ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کر دیں جو اللہ کی یاد دلاتی ہیں۔

۲۔ بعض افعال و اشکال شیطانوں کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں مثلاً ایک جو تا پہن کے چلنا اور باتیں ہاتھ سے کھانا۔ اس لئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اس کے بخلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کر دیتی ہیں مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا اس لئے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے۔

۳۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربہ تکلیف پہنچتی ہے مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑیا جالی نہ ہو یا سوت، وقت چراغ کو بجائے رکھنا اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ چوبے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگائیتے

۱۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس۔

۲۔ فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۵۰۶۔

ہیں۔

۴۔ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے سرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

۵۔ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی، تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔^۱ اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسول اکرامؐ کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے اللہ کی رضا، رسول کی اتباع، روح و جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصول کار اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں بعض ایسے امور ہیں جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لئے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو۔^۲ اور اسی لئے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیئے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ برا نہیں۔ جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر مٹی کی جگہ صابن استعمال کیا جائے، تو لئے استعمال میں لائیں جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے،^۳ پلینیں بدنی جائیں، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کئے جائیں یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لئے زمانہ پتہ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر میں وہی ادا نہیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

۱۔ حجۃ البالغہ ص ۳۶۳۔

۲۔ ہمارے فقہاء نے سی کو سنن اہلحدی اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔

۳۔ آنحضرت ﷺ نے چھری سے گوشت سے کاٹ کر کھایا ہے۔

حکمت ربانی کا چشمہ نور

﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آ گیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام فلسفہ کا اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اس کے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں، اور یہ سب کچھ ایک نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ اگر حضورؐ کی صداقت کی کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفہ، روزگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے، معلم امی ﷺ کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگرچہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب و تمدن سے نا آشنا، اخلاق عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ و شعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق و تمدن کے آپسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہئے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کے لئے کی گئی تھی، ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾۔ ”یعنی ایسا نبی جو ان امیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھار دے۔“ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پر بہار بنا گیا۔ ﷺ

امیدوار رحمت
سید سلیمان ندوی
۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

حصه مفت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ

وَحَاشَاكَ النَّبِيِّنَ مُحَمَّدٍ وَإِلَيْهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ﴾

سیرت النبی ﷺ اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گراں مایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

ع مادی خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علی صاحبہا علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرت طیبہ حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے دلائل و معجزات اور منصب نبوت (عقائد عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثت محمدی اور سیرت نبوی کی وسعت و جامعیت اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیات انسانی و نسل آدم کے لئے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحب کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوی پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے لیکن انہوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرت النبی ﷺ کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات و وسعت نظر جامعیت اعتدال و توازن احتیاط و تورع شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی قدیم و جدید کی واقفیت دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور

ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک تجدد و آزاد خیالی کے ہر شاہد سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صد ہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنہ جواب رہتے ہیں اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گزشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیات مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطبات مدراں اور سیرت النبی ﷺ کی جلد سوم، چہارم، پنجم و ششم کا زور اور آ بشار علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور نامہوار حالات اور صحت کی غیر مستقل و غیر معتدل کیفیت میں لکھ گیا، لیکن ایک مبصر و ماہر فن اور ایک استاد و کہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصل مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرت النبی ﷺ کے میخانے کے میخوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لئے جو متفرق مضامین و مباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیور طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی ﷺ کی چھ جلدوں کے قارئین و عشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب و نظر کو روشن کرتے، اللہ کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری معادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا اور انہوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبی ﷺ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر و نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے اس لئے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لئے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

”اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پاسکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنے کا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ

ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں نصاباً کثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سمجھنے سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ ۱۔

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

”اس جلد کے لکھنے میں اس بیچ مدان کو سا لہا سال ہنگامی محسوس ہوتی رہی اور بارہا قلم کو آگے بڑھا کر پچھے ہٹانا پڑا چنانچہ کام کا آغاز ۷ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن پچھے صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۳ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ ۲۔

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آگئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آ سکتی ہیں مثلاً اس کتاب میں ”معاملات“ کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے ”میزان“ کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے، سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدت مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکز ارشاد سے تعلق تھا وہ نہ صرف سیاست و حکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح و تربیت کے لئے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ لکھنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری کمیزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے وہ لکھتے ہیں۔

”اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔“ ۳۔

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات و بیانات جمع کر دیئے ہیں اور یہ سیرت نبوی کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔

”اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد ۷ مقدمہ ص ۵۔

۲۔ ایضاً ص ۶

۳۔ مقدمہ ص ۲۳۔

خط کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الہی کی تعمیل پائی کر سکیں اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے۔^۱

اور اس کی تائید کے لئے وہ سورہ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشریک کی شرط پوری کرتے ہوں خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن و امان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، حیسانیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریق، مین و سیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبالؒ نے صحیح کہا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سمائی کہاں اس فقیری میں میری

خصوصیت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری

اس لئے خطبات مدراس اور رسول وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ

عبارت نکل گئی ہے کہ

”اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دونوں ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسری اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرمان روا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ﴾

اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔^۲

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافت اسلامی عام دنیوی حکومت میں تبدیل ہو گئی ہے نیز وہ موجودہ دور کے قیام حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں اس لئے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی نہ تجارت کا فروغ نہ جاہ و منصب کا فریب نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے بلکہ سر تا سر حقیقۃً العباد کی بے آوری اور اس کے لئے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔^۳

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے اگر اس میں سیاسیات

۱۔ مقدمہ ص ۴۷۔

۲۔ مقدمہ ص ۴۹۔

۳۔ مقدمہ ص ۴۷۔

اور نظم حکومت کا پورا حصہ آجاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں ”نقش سلیمانی“ ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثار قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگار نبوی متکلم اسلام اور نابغہ عصر استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی کسی جلد پر یہ ہچمدان پیش غلط لکھنے لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے اس لئے اس پر ایک ”ناقص“ کا کچھ لکھنا محل تعجب نہیں کہ

ع دیتے ہیں بادۂ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء ابوالحسن علی ندویؒ ۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی !
کہ محرم نیست خسرو را زبان در گفت گوئے تو
دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ
۷ جولائی ۱۹۸۰ء ہچمدان مور سلیمان
سید صباح الدین عبدالرحمان



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
 سَيِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاصْحَابِهٖ الطَّاهِرِیْنَ﴾

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات:

سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود:

معاملات کا اطلاق فقہاء نے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً بعض فقہاء شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امور دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں اشخاص کی بقاء مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقاء مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقاء ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے^۱ (جیسے قصاص و سزا و تعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی جن پر دین و دنیا کی مصحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد راہ پائے گا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ اور عادات جیسے ماکولات مشروبات مہوسات اور مسکونات کے احکام اور تیسری چیز معاملات ہے جس سے مقصود نسل و نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجراء اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے (جیسے قصاص و حدود و تعزیرات)

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن نجیمؒ نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاہر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے معاوضات مالیہ (بیع و فروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح و طلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاہر یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں قتل نفس پر زجر کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر کسی کی آبروریزی پر زجر کسی کی پردہ دری پر زجر قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

معاملات سے ہماری مراد:

لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکام شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجردوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔

آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہرے قدیم فقہاء نے اس کے لئے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے جیسے کتاب السیر امام محمدؒ اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آ جاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۳۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلیٰ حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ و خراج و زکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں اور اسی لئے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال یا کتاب الخراج رکھا ہے جیسے کتاب الاموال ابو عبید بن سلام المتوفی ۲۲۳ھ اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ اہل سنت کے نزدیک گوامامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیئے جاتے ہیں جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہو گا اور ان کے لئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی اس لئے معاملات کی اس جدید قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں رد و بدل اور نئی ضرورتوں کے لئے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زیادہ افراد پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان ضابطوں اور قانون کی تفصیل ہو ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدیم مساحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں معاشریات اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے معاشرت میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آ جائے گا اور سیاسیات میں حکومت و سلطنت اور اس کے تعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال:

یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف

ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے اس لئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پاسکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نفا کثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیا جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا مآخذ خود ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور ﷺ کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس بیچ مد اس کو سالہا سال ہیکچا ہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹ لینا پڑا چنانچہ کام کا آغاز گوئے جمادی الثانیہ ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیئے دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رک جانا پڑا ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ کو دوبارہ ۶۷م درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجی مالم الغیب کو معصوم ﷺ تشریح لئی صدی ۱۱ و یسریٰ امری، واخلل عقدہ من نسائی، یفقہوا قولی

دیگر مذاہب اور معاملات:

دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعظیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کئے ہیں تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری و رہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں عام ہندوؤں میں منوشا ستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا مآخذ علم الہی اور علم فوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے مآخذ:

دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الہی کے بجائے عقل انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلان طبع قانون کا معیار ہے ہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیش کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور جس و باطل کا معیار بنایا گیا ہے یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا وہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا وہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانین جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی:

اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں داخل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار طبقہ اور غیہ طبقہ پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں داخل ہیں جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹنا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرض بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطہ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لئے آیہ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی نہ

اس جوش و خروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیہ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قوی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گزر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح و عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری:

ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا اس لئے قدم قدم پر اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بار بار وہ حرص و طمع، غرور تکبر، ہوا و ہوس، رشوت اور انتفاع ناجائز و خوف و ہراس اور مکروہید کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف کی میزان باتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانون الہی کی ضرورت:

اسی سبب سے مصلحت الہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل و انصاف کی یہ میزان خود دست الہی میں ہو وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں وہ سب کا ہے اور سب کے لئے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے جس کو اپنے لئے اور اپنی غرض کے لئے کچھ نہیں چاہئے جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے نہیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا کونی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں جاری کر رکھا ہے اسی طرح زمین پر اپنا تشہی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جاری فرمائے جو تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

﴿آلَهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ﴾ (شوری: ۳)

وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔

﴿وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ﴾ (حدید: ۳)

اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔

کتاب اور میزان:

میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں؛ بلکہ فطرت اور عدل و انصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات چل رہا ہے اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تو لے جاتے ہیں چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اِک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

﴿الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۚ حَتَّى الْإِنْسَانُ ۖ عِلْمَهُ الْيَتَامَى ۚ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُحْسَبَانِ ۖ

وَالشَّجَرُ يَسْجُدُن ۖ وَالسَّمَاءُ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۖ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۖ

وَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾ (رحمن: ۱)

رحمت والہ اللہ جس نے قرآن سکھایا انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں اور

بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچ کیا اور اسی نے ترازو

(میزان) رکھ دی تاکہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تو لے جاتے ہیں اسی کے اعتدال اور

اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے اس لئے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر

رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، مہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد و ارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ

کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد و ارادہ کے بغیر کس طرح عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام و

اصول کے مطابق چل رہی ہیں اسی طرح قصد و ارادہ کی دولت و نعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہئے کہ وہ ہوائے

نفسانی سے بچ کر اپنے قصد و ارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے قرآن پاک میں بار بار ہے۔

﴿وَفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ﴾ (نجم: ۱۶)

و رتاپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔

﴿فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ﴾ (اعراف: ۹)

تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔

﴿اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ﴾ (ہود: ۹)

ناپ اور تول کو پورا کرو۔

﴿وَلَا تَقْصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ﴾ (ہود: ۹)

ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں، لے ہر انسانی ظلم کا ختم یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے وہ اپنے لئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسری ترازو سے۔ اس ستم پیشہ پر اللہ کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ (تطفیف)

پھٹکار ہے ان کم کر دینے والوں پر جو اپنے لئے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے چنانچہ سورہ حدید میں زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (حدید: ۳)

اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں۔

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں ایک کتاب یعنی احکام الہی کا مجموعہ دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے اور تیسری چیز تلواری طاقت ہے جو ان دنوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے یعنی جو احکام الہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانون الہی کی کتاب بھی ہونی چاہئے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الہی کی دائمی یکسانی:

قانون الہی کے نظریہ پر ایک شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اس لئے انسانی معاشرت کے خا کے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے اس لئے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہئے مگر یہ خیال سراسر فریب ہے کیونکہ شے نہیں بدلتی اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مادیات کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (الا، شاء اللہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی آگ برف نہیں بنتی برف آگ نہیں روشنی تاریکی نہیں تاریکی روشنی نہیں زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے رات اور دن پے در پے آتے اور جاتے رہتے ہیں کھٹنے گھڑی پلک اور لمحے

دم بدم بدل رہے ہیں سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب و گل کی دنیا پر حکمران تھا آج بھی وہی ہے اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی نہ چودھویں صدی پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔

یعنی اللہ کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ (فتح: ۳)

اللہ کے قانون میں تو کوئی اول بدل نہ پائے گا۔

فطری حقوق و معاملات کی یکسانی:

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی و معاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا، نیکی بدی نہیں بنتی بدی نیکی نہیں، سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا دوسروں کی چیز ناحق لینا چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا دوسروں کی عزت و آبرو کو داغ لگانا دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا، حق قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضا مندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات کی بندش، فتنہ و فساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت، ہر عہد میں ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے جب کبھی کوئی قانون بنا ہے یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزاء رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزاء برقرار رہیں گے البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروغ سامنے آتے رہیں گے اور ان کے نئے قانون الہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل:

ہر مجموعہ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے اس لئے اس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطہ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے وہاں کالے گورے، یورپین اور نیو کے اصول پر کار فرمائی ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافیائی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیئے ہیں یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ دار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے، بہاری یوپی میں جگہ نہیں پاسکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے، فیشنزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانون الہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت:

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لئے زمین سے فتنہ و فساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے۔ چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود و تعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں ان کا مقصد بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام ہے اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں ان سب کا مقصد بھی نزاع اور خدع و فریب کا استیصال ہے۔ اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن کا کوئی فرق اور ملک و اقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے یہ قانون اللہ کا ہے اللہ کے سارے بندوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ چاہے کالے ہوں یا گورے آریائی ہوں یا سامی یورپی ہوں یا ایشیائی ہندی ہوں یا حجازی عجمی ہوں یا تاتاری سب کے لئے یکساں اور سب کے لئے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق:

بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس کے اس قانون کو قانون الہی تسلیم کرتے ہیں اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں ایک وہ جو اس قانون کو قانون الہی تسلیم کرتے ہیں یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ واحد و برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں مسلمان ہیں دوسرے وہ جو اس خاص قانون الہی کو نہیں مانتے لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو مانتے ہیں ان کا نام ذمی ہے لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانون الہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفہ الہی کے ضمن میں موجود ہے یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانون الہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھی وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفہ الہی سے نا آشنا اور ہر قانون الہی سے محروم ہیں ان کو مشرک کہتے ہیں۔ اسلامی قانون الہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لئے ایک عاملانہ طاقت و قوت کا وجود ضروری ہے جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظام عدل کے مطابق قائم رکھے اس بحث کے دو ضروری جز ہیں۔

۱۔ اس عاملانہ طاقت و قوت کی ضرورت حقیقت اس کے شرائط و اوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲۔ معاملات انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام اور اس کے اسرار و مصالح۔

۱۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری التونی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام و در شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب میں معاملات ملاحظہ ہوں۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا میں اللہ کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف و خطر کی جاسکے اور اس کے لئے اللہ کی بادشاہی اللہ کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ (نور: ۷)

اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کیلئے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے جہدے گا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا میری بندگی کریں گے میرا کسی کو سا جھی نہ بتائیں گے۔

اور اس کے لئے اللہ کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تاکہ سارا حکم اسی ایک اللہ کا ہو جائے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (انفال: ۵)

اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے اللہ کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے۔

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (بقرہ: ۲۱۰)

اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے 'علم و عبادت' 'تندرستی روزی' مال و دولت 'فتح و نصرت' اولاد و صالح' مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے دنیا کی بھلائی وہ ہے جو اللہ کی شریعت میں جائز ہے ایک اور جگہ فرمایا۔

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلِلَّذِينَ الْآخِرَةُ خَيْرٌ - وَلَيَعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ﴾ (نحل: ۴)

اور جنہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ نیکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:

﴿فَانْتَبِهُوا إِنَّ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران: ۱۵)

تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت ناموری و عزت مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے۔

جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی اللہ نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنَنُؤْتَهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَا خَيْرَ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ﴾ (نحل: ۶)

اور جنہوں نے گھر چھوڑا اللہ کے لئے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانہ دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

﴿وَاصْنُ لِنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (اعراف: ۱۹)

اور (اے خدا) ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی اچھی اور پائیدار ہے اس لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں بلکہ ضمنی ہو یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّا لَهَا تُفَاهًا فَأُولَٰئِكَ إِلَهُهُمْ أَغْمَالُهُمْ ۖ وَهُمْ فِيهَا لَا يُحْسِنُونَ ۖ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَبَّغُوا فِيهَا وَبَطُلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (ہود: ۲)

جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں اور ان کی نیکی کی جاتی یہ وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ خَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي خَرْثِهِ ۖ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ خَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ﴾ (شوری: ۳)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

﴿مَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَخَرِ الشَّائِكِرِينَ﴾ (آل عمران: ۱۵)

جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور شکر گزاروں کو ہم پورا اجر دیں گے۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاقِبَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَذْهُورًا ۖ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ

مَشْكُورًا ﴿ (نہی اسرائیل: ۲)

جو کوئی چاہتا ہو دنیا کے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر دھکیلا جائے گا اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴾ (نساء: ۱۹)

تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے حالانکہ اللہ کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے اس کے لئے

۱۰۰ گھروں کے دروازے کھلے ہیں لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس

کو مل جائے گی مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی

دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

﴿ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ﴾ (نساء: ۸)

تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم سے کہتے ہیں۔

﴿ يَقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا ﴾ (۱۷: ۳)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت

سلیمان کے زمانہ میں پوری ہوئی طالوت کی نسبت خبر دی گئی۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ نَعَتْ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ﴾ (بقرہ: ۲۴۷)

بے شبہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا۔

﴿ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكًا مِّنْ شَيْءٍ ﴾ (بقرہ: ۲۴۷)

اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔

حضرت داؤد کو خطاب ہوا:-

﴿ يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾ (ص: ۲)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمان نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْسَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي﴾ (ص: ۳)

اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایان نہ ہو۔
یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

﴿اَللّٰهُمَّ مَلِكَ الْمُلُكِ تُؤْتِي الْمُلُكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلُكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ (آل عمران: ۳)

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بتا دیا ہے۔

﴿اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُونَ﴾ اِنْ فِيْ هٰذَا لَبَلَعًا لِّقَوْمٍ عَلِيْدِيْنَ ﴿ (نبیاء: ۷۷)

بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں اللہ کے فرمانبردار لوگوں کے لئے پیام ہے۔

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے فرمایا۔

﴿وَلْيَنْصُرُوا اللّٰهَ مِمَّنْ يَنْصُرُهُ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنْهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا

الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْر ﴿ (حج: ۴)

اور البتہ اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے وہ کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں زکوٰۃ دیں اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا وہ پہلے خود اچھا ہوگا اور برے کاموں

سے باز رہتا ہوگا۔

اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین حق کی مدد کی جائے جو لوگ حق کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں اللہ ان

کی مدد فرماتا ہے ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اللہ کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہئے چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی مشاء کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا۔

﴿وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمْ رَافَةً فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (نور: ۱۱)

اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

﴿فَاذْنُبُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ﴾ (بقرہ: ۲۸)

تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے خبردار ہو جاؤ۔

اس لئے نجران کے عیسائیوں سے آپ ﷺ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی

لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ لے جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں 'ڈاکہ ڈالیں لوٹ مار کریں' قرآن اس کو اللہ اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل پھانسی، قطعید اور قید یا جلاوطنی ہے اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے۔

﴿ذَلِكْ لَهُمْ جِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۵: ۵۵)

یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں برا عذاب ہے۔

حضرت موسیٰ کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے تو حضرت موسیٰؑ نے انہیں تسلی دی۔

﴿اسْتَعِينُوا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يُّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (اعراف: ۵)

اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو اللہ کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا توڑنے والوں کا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:-

﴿عَسَىٰ رِزْكُكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَذُوْكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْطَرِ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ (اعراف: ۱۵)

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھتے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آخر جب وعدہ الہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام اور بے کس قوم خلافت الہی کے تاج سے سرفراز ہوئی

﴿وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضَعُّوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بَرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى نَبِیِّ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (اعراف: ۱۶)

اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور بھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی ہے اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے تو دفعۃً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی۔

﴿وَقَضٰیۤنَا اِلٰیۤیْ نَبِیِّ اِسْرَآئِیْلَ فِی الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۝۱۰۱؎ فَاِذَا حَآءَ وَعَدُۤاۤ اُولٰٓئِہِمَاۤ بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًاۤ لَّنَاۤ اُولٰٓئِیْۤ بِاَسِیِّ شَدِیْدٍۭ فَجَاسُوْاۤ حِلٰلَ الدِّیَارِ وَكَانَ

وَعَدًا مَّفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكُرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝
إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءَ أَوْ يُجْوَّهُكُمْ
وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ﴿۱﴾ (بنی اسرائیل: ۱)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی اور تمہاری تعداد بڑھانی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لئے اور برا کرو گے تو اپنا پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا تا کہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کریں۔

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی اللہ کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی اللہ کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الہی کی پیروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے اور دو دفعہ ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ نبوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا۔

﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُذْتُمْ عَدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝
هَذَا الْقُرْآنُ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۱)

امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کر دے گے تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی پر ایمان لائیں لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الہی بھی دور ہو گئی کیونکہ انہیں سنا دیا گیا۔

﴿ اَوْفُوا بِعَهْدِيْ اَوْفٍ بِعَهْدِكُمْ ﴾ (بقرہ: ۵)

تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے۔

﴿ وَاِذْ اٰخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرٰٓئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسٰنًا وَّوَدٰى الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاَتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تُسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُحْرِجُوْنَ
اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَتَّخَذْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
وَتُحْرِجُوْنَ قَرِيْبًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ يَظْهَرُوْنَ عَلَيْهِم بِالْاِثْمِ وَالْعُلُوْانِ وَاِنْ يَّاتُوْكُمْ اُسْرٰى
تُقْتَلُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِحْرَاجُهُمْ اَفْتُوْهُمْ بِنِعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضِ ۝ ﴾ (بقرہ: ۱۰۵)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے نہ نکالنا تو تم نے اقرار کر لیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گنہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) ہے کہ تم کتاب (اللہ) کے بعض احکام کو نہ مانتے ہو اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لئے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیا اور فرمایا:

﴿ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا جِزٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرْذَلُوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾ (بقرہ: ۱۰۶)

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنائی گئی۔

﴿ وَمَنْ اٰطَمَ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسْجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُذَكَّرَ فِيْهَا سَمْعًا وَّسَمْعٰى فِىْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَدْخُلُوْهَا اِلَّا خٰٓئِفِيْنَ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (بقرہ: ۱۱۳)

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کئے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساگی ہون لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

جو لوگ اللہ اور رسول سے لڑتے ہوں اور اللہ کی زمین میں فساد اور عارت گری پھیلاتے ہوں ان کے لئے دنیا

کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے ان کو سویوں پر لٹکایا جائے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے۔

﴿ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۵۰:۵۰)

یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتاب الہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنا لیا تھا یہ سزا سن دی گئی

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۶۰:۶۰)

دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین میں کج بجھی کرتے ہیں اور

دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں ان کے لئے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُبِينٍ ۚ ثَانِي عِطْفِهِ لِيُضِلَّ

عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾ (۱۰:۱۰)

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے

جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے تاکہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے گمراہ کر دے اس کے لئے دنیا میں

ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔

یہود نے جب گائے کے ٹھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ کو وحی الہی نے خبردار کر دیا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِثَالَهُمْ عَصَبٌ مِّن رَّتْهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ

نَجَّزِي الْمُفْتَرِينَ﴾ (اعراف: ۱۹)

(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے ٹھڑے کو (معبود) بنا لیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا کی زندگی میں

ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ذلت قومی مسکنت اور غضب الہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے کیونکہ انہوں نے

احکام الہی سے انحراف کیا اللہ کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدود الہی کو توڑتے رہے۔

﴿وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَاءُ وَبَغَضْتُ مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ

بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ (بقرہ: ۷۷)

اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے

یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لئے کہ

نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

آخر خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لئے مہلت کا آخری موقع تھا لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم

رہی اس پر اللہ نے قیامت تک کے لئے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی۔

﴿صُرِّتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ أَيْمًا تُقْفُوا إِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللَّهِ وَحُبْلِ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُ وَابْغَضَ مِنَ اللَّهِ وَصُرِّتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ (آل عمران: ۱۲)

یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آجائیں اور یہ لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لئے کہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے یہ اس لئے کہ یہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

دوسری سورہ میں ہے۔

﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (اعراف: ۳۱)

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے تاریخ کا کون سا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کئے کی سزا نہیں پائی ہے اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب ذلت، عکت اور مسکنت کی تفسیر جزیہ سے یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے قرآن پاک کی دعائیں ہیں۔

﴿السُّهُمُ مَالِ الْمَلِكِ تُؤْتَى الْمُلُكُ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلُكُ مِنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُدْلُّ مَنْ تَشَاءُ بِبَيْدِكَ الْحَيْرُ﴾ (آل عمران: ۴۳)

اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔ تیرے ہاتھ میں سارا خیر ہے۔

ان آیتوں میں لف و نشر مرتب ہے یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھین جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہو گا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے احکام الہی سے انحراف، انبیاء و مصلحین امت کا قتل و تکذیب، حرص و طمع، سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور اللہ کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیئے گئے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَحْزِي الْمُفْتَرِينَ﴾ (اعراف: ۱۹)

(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے پھڑے کو (معبود) بنا لیا تھا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچے کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس مفتری کے لئے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جہہ سائی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں در بدر پھرے گا مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا۔

﴿وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ﴾ (حج: ۳)

اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) اللہ رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔

عزیزے کہ از در گمش سر بتافت بہ ہر در کہ شریع عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ بہتا ہے۔ اللہ نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا۔

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِّن رَّبِّهِمْ لَا كَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ﴾ (مائدہ: ۹)

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی

گئی تھی۔

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (اعراف: ۱۲)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے مگر انہوں نے تو تکذیب کی سوان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (نور - ۷)

جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔
ایک اور جگہ فرمایا۔

﴿وَعَدَكُمْ اللَّهُ مَعَاسِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُوهَا فَفَعَّلَ لَكُمْ هَذِهِ﴾ (فتح - ۳)

اللہ نے تم سے بہت سے غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے سو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی۔

مجاہد بن امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبی دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لئے ہے۔

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ الْيَمِّ ۚ تَوْمِسُونَ مَالَهُ وَرَسُولُهُ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٌ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۚ وَآخِرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۚ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (التف - ۲)

مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلص دے (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغ ہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں داخل کرے گا یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے (یعنی تمہیں) اللہ کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنا دو۔

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سر بلندی اور دین الہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ۔

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (توبہ - ۱)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورہ فتح و سورہ صف میں دہرائی گئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورہ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آئندہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی مجموعی اور اطمینان کا باعث ہے لیکن اس کے پورے ہونے کے لئے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے بدر و غیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی کو خبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی تاہم

مسلمانوں کو اس کے لئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورہ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (انفال: ۵۰)

اور لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔

سارا حکم اللہ کے لئے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی و جسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے جس کی بھی اطاعت ہو وہ اللہ کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَعَدَكُمْ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ ۝ وَأَحْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا﴾ (فتح: ۳)

(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جو صدق و خصوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے تو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی۔۔۔۔ اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے اور وہ اللہ ہی کی قدرت میں تھیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے وہ خیبر کی فتح ہے جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے وہ مکہ کی فتح ہے چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی۔

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا﴾ (فتح: ۱)

(اے محمد ﷺ!) ہم نے تم کو فتح دی فتح بھی صریح اور صاف۔

آنحضرت ﷺ جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت برستی کی نجاست سے پاک ہو چکا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فتح و نصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا۔

﴿إِذَا حَضَرَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ (نصر: ۱)

جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ درگروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار

کی حمد کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت چاہو۔

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض و حقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت مدرتج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بننا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی اس موقع پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کیلئے بمنزلہ تمہید تھے بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الہی کی تعمیل یا سانی کر سکیں اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے۔

﴿وَعِذَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ (نور: ۷۷)

جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشنے کا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطاء، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہوا اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے، اس کی مسجد اس کا دیوان اس کا منبر اس کا تخت تھا اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے نا آشنائی پر مبنی ہے۔ ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ ﷺ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ کیونکہ آپ کی دعوت کا مقصد محمد رسول اللہ ﷺ کی انسانی بادشاہی نہ تھی بلکہ روئے زمین پر اللہ واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا اسی لئے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دونیں ہیں ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسری اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین

تک جاری ہے۔ وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرمان روا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ﴾ (زخرف-۱۰)

اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین دونوں میں ایک ہی اللہ کی حکومت ہوگی اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی نہ دیوتا ہوگا اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا سورہ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے اے مسلمانوں کو ہشیار کیا جاتا ہے۔

﴿وَاخْرُؤْ يَضْرِبُ نُونٌ فِي الْأَرْضِ يَنْتَعُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَآخِرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (مزمل-۲)

(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ و سنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سر بکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی 'سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سورہ فصحت کی آیتیں پڑھیں جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا اور واپس آ کر قریش سے کہا کہ اللہ کی قسم محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ شاعری ہے نہ جادو ہے اور نہ کانہوں کی سی باتیں ہیں قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا اس لئے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کی۔

”اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسا یا ہو۔ جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسا یا ہے تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کماتا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔“

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہئے نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے مجھے تو اللہ نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے اللہ سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا فیصلہ آ جائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی اس نئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی یہ دنیا کی اصلاح عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آ جاتی تھی اور اسی لئے اس کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ سے صلح ہو جائے ابوطالب بھیجے سے کہتے تھے جان عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں ارشاد ہوا: اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم ان کے زیر نگیں ہوگا ابو جہل نے کہا: ہم آپ کی ایک بات نہیں دس باتیں مانیں گے ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں اور اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔^۱

حج کے موسم میں آنحضرت ﷺ عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں ”اے لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں تم فلاح پاؤ گے عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوگا اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے۔“^۲

بیعت عقبہ میں جب مکہ والوں کے ذرے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول انام کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور

فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے! اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لئے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں! ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لئے جھگڑا نہ کرو گے اور جس سے تم اپنی اور اہل عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی کرو گے! انصاری نے ایک آواز سے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ کی یہ سب باتیں منظور لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا جنت اور فتح و نصرت۔

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمہ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی اور آخر تموار کو تموار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام میں قائم کرنے کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا یہاں تک کہ اللہ کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی مختلف موقعوں پر صحابہؓ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوشخبریاں دیں جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوہ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا مثنیٰ بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں دم بہ دم خبریں آرہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آ رہا ہے! آنحضرت ﷺ اور جان نثار صحابہؓ بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آ جاتا ہے جس کو مسلمانوں کے پھوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں اور حضور ﷺ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے فاقہ کش غریب الدین مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے! لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے، مدائن تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی

آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے جنگ ہوگی ہندوستان تہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔

لیکن ان خوشخبریوں بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہئے کہ یہ حکومت یہ بادشاہی، یہ تخت یہ تاج یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے مواقع کو دور کرنے میں معین ہیں اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں خواہ وہ مسلمانوں کی ہو دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف اللہ کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت یہ عیش و عشرت یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال کا موجب ہو جائے گا اسی لئے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لئے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے یہ کھیتی دنیا کے لئے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لئے فوز و فلاح کا موجب ہے۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ رَدُّ لَهُ هِيَ خَرْبُهُ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ﴾ (شوری: ۳)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

﴿وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ﴾ (آل عمران: ۱۵)

اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو کیونکہ یہاں کی لذت عیش و عشرت آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لزاماً ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں بچ ہیں

﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ نَعْدِ مَا طَعَمُوا لِسَبَوْنَهُمْ هِيَ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَا جَزَاءُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ﴾ (نمل: ۶)

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کے لئے وطن چھوڑا ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا۔

﴿أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْأَجْرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْأَجْرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ﴾ (توبہ: ۶)
کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔

﴿وَمَا أُوْتِيتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرِيسَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللَّهِ حَيْرٌ وَأَنفَىٰ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (نقص: ۶)

اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی ریاست ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

﴿بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ حَيْرٌ وَأَنفَىٰ﴾ (اسی: ۱)

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

﴿وَالذَّارُ الْآخِرَةُ حَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (آف: ۲۰)

اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں۔

﴿فَإِذَا قُهِمُ اللَّهُ الْحَزَنُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْرَهُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (زم: ۳۰)

پھر ان کو اللہ نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش یہ سمجھ رکھتے۔

﴿وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ﴾ (طہ: ۷۷)

اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کئے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حیرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی

بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت وحشمت بے سود۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَرِيسَتَهَا يُؤْتِ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۚ أُولَٰئِكَ

الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْأَجْرَةِ إِلَّا السَّارُ وَحِطٌّ مَا صَبَّغُوا فِيهَا وَيُغْلَبُونَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (ہود: ۲)

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی ریاست و ریخت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے

ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں

اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کئے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرکاش سے بھی کمتر ہے:

﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْأَجْرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ﴾ (توبہ: ۶)

دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْأَجْرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ﴾ (رعد: ۳)

اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ (آل عمران: ۱۹-۲۰)

اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لئے نہیں بلکہ دنیا کو آخرت کے لئے برتنا چاہئے۔ جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے۔

﴿إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ بِالْآخِرَةِ﴾

دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گود دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لئے ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کن لئے بنا۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ۳)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے دنیا کے

کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں یہ دنیا کی دولت اسی لئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے۔

﴿وَاتَّخَذَ فِي مَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (قصص: ۷)

اور اللہ نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔

انہی معنوں میں ﴿الدُّنْيَا مِرْعَاةُ الْآخِرَةِ﴾ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے

ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ وَأَقِيمُوا

الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا الرُّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (نور: ۷)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسے

ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور

خوف کے بعد امن بخشنے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے

بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے پیغمبر کے فرمان پر چلتے رہو

تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

اللہ نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، حکمیں اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے تاکہ

وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پرواہ ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میری احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں اور اگر اس امن و اطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔
دوسری جگہ فرمایا۔

﴿الَّذِينَ إِذَا مَكَتَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَخَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ (حج: ۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لئے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔



عہد نبوی میں نظام حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیر پا تھی، چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سر پر غرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامہ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوہ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آ کر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام نہ تھا وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ نجی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم تھی، جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور نظام تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظام زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔ اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اس کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانون الہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانون الہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے اس طرح اسلام کے نظام حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے آئے تھے مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ النَّاسُ عَلَيْكُمْ
شُهَدَاءَ﴾ (بقرہ۔ ۱۴۳)

اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لئے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہو گئے یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے ہنرہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لئے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ کو قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرۃ بنایا وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پر خطہ تھا اور ابتداء میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لئے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظام اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤساء قوم اور سرداران قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی آنحضرت ﷺ نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا چنانچہ سب سے پہلے قرب وجوار کے سلاطین و رؤساء کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دینا تھا چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامہ مبارک آپ نے لکھا تھا اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدم قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نور اسلام سے منور ہو چکا تھا لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاج مرصع اور تخت زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے چھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام رؤساء نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوہ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لئے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا اب آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا۔

﴿أَيُّومَ اسْتَدَارَ الزَّمَانُ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾

زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین سیاسی تکلفات بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظام ہائے سلطنت کو بے بنیاد سے اکھاڑ دیا اس انقلاب نے نہ صرف قصر کسری و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا بلکہ خود کسریت اور قیصریت کو صفحہ ہستی سے فنا کر دیا یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی۔

﴿اداهنت كسرى فلا كسرى بعده واداهنك قيصر فلا قيصر بعده﴾

جب کسری ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسری نہیں اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون اللہ کا قانون جس کی حکومت اللہ کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی بلکہ ملکیت تو صرف ایک اللہ کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا یا اس کو یوں کہئے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگران حاکم ہے شوہر اپنے اہل و عیال کا بیوی شوہر کے گھر کی معلم اپنے شاگردوں کا آقا اپنے غلاموں کا غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد مبارک کا کہ ﴿كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ﴾۔ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیۃ) کے متعلق سوال ہو گا یہی مطلب ہے اس سے اسلام کے اصول سلطنت کا ایک اساسی نقطہ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتنوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی ملح نظر نہ تھی نہ رسول اللہ ﷺ کی شخصی سرداری نہ خاندان قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا صرف ایک شہنشاہ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمان الہی کے آگے سارے بندگان الہی کی سرائفگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیام سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں اللہ کے بندوں کو بندوں کا اللہ ظہر ادا کیا تھا اس کی جگہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں اللہ کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمانروا افراد کی شخصیت قومیت زبان نسل وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشاء سلطنت کے قانون طرز سلطنت طریق حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب

سے ہوا، ظہری تو اس لئے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لئے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لئے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں اور ان اوصاف کی جلاء اخلاص، للہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاق روحانی ہی سے ممکن تھی اس لئے اولاً ان کو اس طرز حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر رکھا تھا مذکورہ بالا اخلاقی محاسن کے وجود بقا بلکہ ان کی ترقی و نشوونما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ مامور من اللہ ایک پاکباز راہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پر تو صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکام الہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظام سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں:

۱۔ یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

۲۔ یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساس اولین محض اخلاص قلب اور اللہ

تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظام سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا اس نظام سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران، نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر آ کھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیئے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہل عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، 'نحی' حمیری، 'غسانی' اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کئے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سردار ان قبائل کے لئے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صنیہ، مرباع، نسیطہ اور نقول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سردار ان قبائل کے سامنے

آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا، کہتا ہے۔

﴿وَسَكَرَانِ شَتَا عَلَى السَّاسِ قَوْلُهُمْ وَلَا يَنْكُرُونَ الْقَوْلَ حِينَ نَقُولُ﴾
اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے۔

سرداران قبائل اپنے لئے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے:

لا حمى الا حمى الله ورسوله الله اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان و تجل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے پیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے ان کے امراء علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے ایک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لئے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کئے گئے سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لئے حرام ٹھہرے، امام وقت اور اس کے احکام کے لئے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے، چادش و نقیب رخصت کر دیئے گئے، طلائی و نقرئی وز مردیں تخت اٹھوا دیئے گئے، امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور عام صحابہؓ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمائیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی جس کے شاہان وقت عادی تھے لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد کون ہیں لوگ اشارہ سے بتاتے صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چہرہ ہی بنا دیا جائے جس پر آپ جلوہ افروز ہوں مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت

سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے ایک بار ایک مخدومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں صحابہؓ کو یہ گزرا اور انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دیدی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رجبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔ ۱

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے ایک آدمی آیا اور جس کے مارے آنحضرت ﷺ کے اوپر نوٹ پڑا آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھری تھی آپ نے اس سے کوچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔ ۲

ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیتے چھالے پڑ گئے تھے انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے لیکن آپ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا جو بیت کے انتقام کے منانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا معاف فرمایا اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات و عشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں بخلاف اس کے حضور ﷺ نے اپنے لئے جو خاص خطاب اللہ سے پایادہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں عبدیت کاملہ ہی آپ کا کمال تھا اعزاز کے وہ وہی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا آپ نے ان سب کو مٹا دیا فرمایا: اللہ کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کہے ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لئے ہے آپ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا چونکہ اسی دن آپ ﷺ کے صاحبزادہ ابراہیمؑ کا انتقال ہو چکا تھا اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے اس لئے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ کی موت کی طرف منسوب کر دیا لیکن جب آپ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال

۱۔ یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کتابہ شفاعۃ فی الحدوٰث ارفع الی السلطان۔

۲۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸ کتاب الحدود۔

۳۔ ۱۰۱/۱۰۱

کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج اللہ کی دو نشانیاں ہیں کسی کی موت و حیات سے گہن نہیں لگتا۔^۱

ایک بار ایک شخص آ نحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا آپ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا اس نے کہا کہ خدا یا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں محمد کی طرف رجوع نہیں کرتا آپ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔ حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جاسکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔^۲ ایک بار آپ نماز پڑھ رہے تھے حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: ”اللہ! مجھ پر اور محمد پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر“ آپ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ ”تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الہی کو محمد و ذکر دیا“^۳ حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا جس پر سلاطین زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لئے تھے زکوٰۃ صدقہ خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آ نحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا لیکن آپ نے اس کو اپنا نہیں بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرمادی اور اس کو بحکم الہی عام غرباء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا ابو داؤد میں ہے۔

﴿ قَالَ مَا أُوْتِيَكُمْ مِنْ شَيْءٍ وَ مَا أَمْعَكُمْ اِنَّ اَنَا الْاَخَارُنْ اَصْعَ حَيْثُ مَا اَمَرْتُ ﴾^۴
میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں میں صرف خزانچی ہوں جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

دوسرے موقع پر فرمایا:

﴿ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يَعْطِي ۚ ﴾
میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو اللہ ہے۔

۱۔ بخاری باب الکسوف۔

۲۔ مسند ج ۳ ص ۳۳۵ مسند اسود بن الشریح۔

۳۔ بخاری ج ۲ ص ۸۸۹ کتاب الادب۔

۴۔ ابو داؤد ج ۲ ص ۱۵ کتاب الخراج والامارۃ۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک نمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور ﷺ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضور ﷺ کے تصرف میں گوارا راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اس کی آمدنی اپنی صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرمادیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ ملاحظہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لئے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمرؓ آپ ﷺ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیے سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں حجرہ میں ادھر ادھر گاہ دوڑائی لیکن تین سو کھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاثہ البیت نظر نہ آیا ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں حضور ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاثہ البیت میرے سامنے ہے ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! دعا فرمائیے کہ اللہ آپ کی امت کو فارغ البال کرے کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ اللہ کی پرستش نہیں کرتے لیکن اللہ نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیئے ہیں آپ ﷺ دفعنا اٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو کہ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیئے گئے ہیں"۔ ۱۔

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور ﷺ کے لئے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع ۱۔ ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زرو جو اہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو

۱۔ بخاری و مسلم کتاب النکاح باب الایام۔

۲۔ یعنی بیوند و کپڑا (معارف)

ہمکست دے رہے تھے۔

قیسؒ بن سعد ایک صحابی تھے وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (ریس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا آپ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا اگر میں بالقرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ: یا رتم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہتے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور ﷺ کو سجدہ کیا آپ نے حیرت سے فرمایا: معاذ یہ کیا؟ عرض کی: یا رسول اللہ میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور ﷺ کو سجدہ کروں ارشاد ہوا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ ۷

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ اسکبار و ترافع اور اسراف و تبذیر کی زندگی اللہ کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سر بلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار باریک نظر فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہؓ نے بھی اس کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے احکام الہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا کیونکہ ضعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک تھیلی مائی گئی جس میں کچھ یمنی مہریں تھیں آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا و ظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا تھا۔ ۳۱

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت سب کشائی بھی بر مٹھی اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصنیعات اور خامی و

.....

— 100 —

پاکستان کے لیے نئے دور کا آغاز

عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا۔ اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور ﷺ کی عظمت و جلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے تا آشنابہ و آتا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا اور حضور ﷺ خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضور ﷺ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی ایک لونڈی تھیں وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں! سفارش ہے عرض کی تو قبول سے معذور ہوں آنحضرت ﷺ نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

غزوہ بدر میں آنحضرت ﷺ نے ایک مقام پر قیام فرمایا فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہئے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ

﴿انتم اعلم بامور دنیا کم﴾

تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نروادہ کھجور کے درختوں میں پوند لگاتے ہیں آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوکے کے لئے کرتے ہوں گے اس لئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں آنحضرت ﷺ کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا انہوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے میری اتباع ضروری ہے لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہوں تم آزاد ہو۔

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربات سے ہے یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن

۱۔ صحیح بخاری باب بکون الحرۃ تحت العبد باب شفاء النبی ﷺ فی زوج بریرہؓ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالفاق یہی حکم

ہے اگر آزاد ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے

۲۔ صحیح مسلم باب الفعائل۔

جن امور میں آنحضرت ﷺ کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت الہی پر مبنی ہوتا جس کی اطلاع حضور ﷺ کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ان کا منشاء حکم الہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوہ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمرؓ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دہ کر کی گئی ہے اس لئے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: بے شبہ ہوں انہوں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہ ہیں انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا وہ میری مدد کرے گا انہوں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انہوں نے کہا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی انہوں نے بھی وہی جواب دیئے جو رسول اللہ ﷺ نے دیئے تھے آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔ اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی مگر حضور ﷺ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا کیونکہ یہ فیصلہ ارادات ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا تو چونکہ ان کے شدت شوق زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لئے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور ﷺ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت ﷺ پر شوق گذرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے ام المومنین نے چہرہ مبارک پر آزر دگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا آپ نے واقعہ بیان فرمایا حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں آپ خود اپنا احرام کھول دیں چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا شمع نبوت کے پروانوں (صحیہ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور ﷺ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے باں منڈوانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الہی سے تھا اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم

النفس اور امور تجربیہ سے تھا اس لئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔ ۱۔

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور ﷺ پر اعتراض کر بیٹھے لیکن حضور ﷺ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری صحابی میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا قانون اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے لیکن آپ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آبپاشی کر لو پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت براہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں یہ سن کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تب آپ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آبپاشی کر کے پانی روک لیں یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے ۲۔ یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں از خود چلا جائے یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمرؓ کو غصہ آ گیا اور آنحضرت ﷺ سے کہا: اگر آپ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں لیکن آپ نے ان کو روک دیا ۳۔ اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ اس کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علیؓ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چیں منافق ہوں تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے

۱۔ اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدا نخواستہ علم النفس کا یہ نقطہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں جن سے کبھی ان استادوں کو اس لئے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لئے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض سے حاصل ہوئی تھی۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الفقہ ج ۲ ص ۷۶۔

۳۔ بخاری جلد اول ص ۵۰۹ باب علامات النبوة فی الاسلام۔

بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت ﷺ اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے آنحضرت ﷺ کے اس طرز عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفاء اور امراء اسلام کے لئے حق شناسی، حق گوئی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور فخر و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمل و حکام درحقیقت خیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لئے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمال نبوی کی شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور پر سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمل سے فرمایا ”ہاں! مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز خارج نہیں ہوتی“ اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاقلوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔ ۱۔

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور ﷺ سے درستی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آ کر آپ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی ردین سرخ ہو گئی آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لادو کیونکہ جو لادو گئے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا۔ حضور ﷺ نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفر اللہ، نہیں! استغفر اللہ، نہیں! استغفر اللہ اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے اس کا بدلہ نہ دو مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا پھر آپ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔ ۲۔

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ پر تھا بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہم کلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہئے کیونکہ اس کا حق ہے اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔ ۳۔

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا آنحضرت ﷺ کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں آپ نے ایک دست چھوہاروں پر گوشت چکایا گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بد معاملگی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بد معاملگی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا اس نے پھر وہی لفظ کہے لوگوں نے پھر روکا آپ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو اس کو

۱۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۶۶ کتاب الزکوٰۃ باب الرضاء السعادة۔

۲۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب العلم۔

۳۔ ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان۔

کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپؐ صبیحہ کے ساتھ تشریف فرما تھے اس کا دل آپ کے حلم و غفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا دیکھنے کے ساتھ بولا: ”محمد! تم کو اللہ جزائے خیر دے تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی۔“ ۱۔

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا ناروا یہودیگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے لین دین کا کاروبار کرتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا، ميعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور اور آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت دست کہہ کر کہا کہ ”اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی جیلے حوالے کیا کرتے ہو“ حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے اس کی طرف منہ کر کے کہا: اواللہ کے دشمن! تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر کہا: عمر! مجھ کو تم سے اور چم امید تھی اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو یہودی حلم و غفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ ۲۔

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا اور وہ بھی مونا اور گندہ تھا پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدی بھیجا اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں آنحضرت ﷺ نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔ ۳۔

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور ﷺ جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا آپ نے اس کو کس حلم اور غفو سے سنا اور معاملہ کا فیصلہ کیا یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے غرور و تکبر سے ملائیے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جواز قرار دیتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے اس سے بھلا برا جو کچھ ہو وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے لیکن

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۶۸۔

۲۔ یہ روایت بیہقی ۱۷۱ بن حبان طبرانی اور ابوالعزم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفاء از شہاب خفاجی)۔

۳۔ جامع ترمذی کتاب الامور۔

اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا اور آپ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کر سکتی تھی بایں ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرات کو جائز رکھا جانا صرف اس لئے تھا کہ آپ کا یہ اسوہ آئندہ امراء اسلام کی تعلیم کے لئے عملی سبق ہو اور اس کے لئے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آئندہ آنے والے امراء اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس رو در و سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع اس خاکساری اس غنوغ و صم اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا اور نہ آ سکتا تھا وہ اخلاص قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے بلکہ اس ذات اقدس سے ہے جس کی خاک عقیدت مسلمانوں کی چشم ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ مشورہ کرتے تھے ایک تو اس لئے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے اور دوسرے اس لئے کہ چونکہ آپ ﷺ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے اس لئے آپ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امراء کے لئے مثال و نظیر کا کام دے آپ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (آل عمران: ۱۷۲)

اے رسول! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضور نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی انہوں نے عمل کیا تو

اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (شوری ع ۴)

ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی تاہم احادیث کے تتبع واستقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا اور ان کی راہوں پر عمل کیا اور اس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تا کہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو نہایت مناسب ہے ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا انہوں نے الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر پکارا اس کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ کو روایا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آ کر آنحضرت ﷺ سے بیان کیا چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو یہیں رہیں گے اللہ کی قسم! اگر آپ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے اس کے بعد جب آپ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا ایک تجربہ کار صحابی نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! آپ حسب فرمان الہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے اس پر انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے آنحضرت ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور وہیں جا کر قیام فرمایا۔

۱۔ مصنف عبدالرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب السنن لابن داؤد فتح الباری ابن حجر وروض الصفی و زرقانی علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان و نووی میں ہے فشرعہ السبی ﷺ بعد دلت اماو حی او حاجتھا دہ ﷺ مدھب الجمهور فی جوار الا جتھا دہ ﷺ و لیس ہو عملاً بمعہ دالھام ہذا مالا یشت فیہ اختلاف۔

۲۔ ابو داؤد و ترمذی باب بدء الاذان۔

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کئے گئے تو آپ نے پھر تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے لوگوں نے مختلف رائیں دیں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔ ۱

احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کو چوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے پھر پر جوش جاں نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر سے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہئے اور حضور کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امور حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے واپس کر دیا جائے آپ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہو گا ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا اور آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی اگرچہ آنحضرت ﷺ کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی آپ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میرے رائے سے اتفاق نہ ہو وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ آپ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار رائے کو کافی نہیں سمجھا فرمایا کہ ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لئے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام و عریف ہمارے پاس بھیجنا چاہئے چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔ ۲

احادیث کی کتابوں کا استقصاء کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیام سلطنت اور آئین سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا اس شعبہ حیات کو جس میں تمام تر زندگی بہیمیت، مکرو فریب، غل و سازش، ظلم و ستم اور جور و تعدی شامل تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا احادیث میں متعدد صحابہ کرامؓ سے روایت ہے کہ ﴿السلطان ظل اللہ فی الارض یاوی الیہ کل مظلوم من﴾

۱۔ ترمذی میں ۵۰۳ کتاب التفسیر سورہ انفال۔

۲۔ ابوداؤد کتاب الجہاد صحیح بخاری کتاب المغازی۔

عباد اللہ ﷻ یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے جس کے دامن میں بندگان الہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے کہ

﴿السُّلْطَانُ الْعَادِلُ لِلتَّوَاضُعِ ظِلُّ الْمَلِكِ وَ رَمَحُهُ فِي الْأَرْضِ﴾ ۱

عادل اور متواضع حاکم زمین میں اللہ کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا: ”عادل امام کو قیامت کے دن اللہ کا سایہ نصیب ہوگا۔“

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہو گئی اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہو گیا، امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لئے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے اس کو بد عہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہئے، یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹا لی۔ ۲

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی اہل انکاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری و نمائشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے، تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے، ہر فرد رموز

۱۔ یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابو ہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمرؓ رضی اللہ عنہما میں اور بروایت ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہؓ میں ہے۔ یہ حضور ﷺ تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے القاصد احسن ستادوی اور کشف الخفاء و مزین الالتباس عطاء جلی لفظ سلطان یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں السلطان کے معنی بادشاہ کے نہیں بلکہ طاقت و قوت کے ہیں جو انگریزی لفظ پاور کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مترادف ہیں اس لئے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عمل حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے السلطان ولی من لا ولی له یعنی جس کو کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اس لئے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

۲۔ صحیح بخاری۔ باب فضل من ترک الفواحش۔

۳۔ صحیح بخاری۔ باب فضل من ترک الفواحش۔

سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے لیکن بایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لئے ہزاروں لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لئے دی جاتی ہے لیکن بایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرات و یہی کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے اس لئے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا وہی ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک ہی میں عمال مقرر کر دیئے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سررشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے۔

﴿کان رسول اللہ ﷺ اذا اناہ قوم بصدقتہم قال اللہم صل علی ال فلان، فاناہ اسی

بصدقة فقال اللہم صل علی ال اسی اوفی﴾ (بخاری کتاب الزکوٰۃ ص ۲۰۳)

آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوند اقدس کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے تو آپ نے فرمایا کہ خداوند ابا اوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عدی بن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مہربان یعنی چوتھا ملا تھا جو عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنے قبیلہ کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ صَدَقَةٍ بِيَصُتِ وَجْهَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَ وَجْهَ اصْحَابِهِ صَدَقَةُ طَلْحَةَ جَنَّتْ بِهَا (ترمذی ۲)

کتاب الفعائل

پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿صدقات قومنا﴾ ۱۔

یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے۔ ۲۔

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گودہ مٹ تو نہیں گئے تھے لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نور ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لئے بیتاب ہو جاتے تھے چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعتراف جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ما عزن مالکؓ ایک صاحب تھے انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر از خود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی۔ یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے (صحیح مسلم باب ارجم) یا رسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمائیے اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے تھے اور آپ اعراض فرماتے رہے چوتھی بار آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انہوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا جب ان پر پتھر برسے لگے تو انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ کو قبول کر

۱۔ صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوۃ باب انفقوا منکم و منکم بشق نحرہ کتاب الا حارۃ باب من اجرعہ۔

۲۔ صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوۃ باب انفقوا منکم و منکم بشق نحرہ کتاب لا حارۃ باب من اجرعہ۔

لیتہ۔ ۱

اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پارہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلن چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گنہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انہوں نے از خود اپنے تہہ داروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو چنانچہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا، حضور ﷺ نے ان کی شدت علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی۔ ۲

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنہوں نے آ کر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا تو یہ گنہگار موجود ہے اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے۔ ۳

غزوہ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محکم تھا قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت ﷺ نے اپنی عادت شریف کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اٹھ کر کہا یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور ﷺ نے دیت ہی پر زور دیا۔ یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لئے دعا فرمائیے۔ ۴

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حد فاصل قائم کر دیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لئے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعزؓ اور دوسرے صحابہؓ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیوی سزا کے اجراء سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے اور آنحضرت ﷺ کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلا داس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہؓ نے ماعزؓ پر اس لئے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکم الہی کی بے محابا تنفیذ کی تو فتنہ پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لئے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے

۱۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۳۵ صحیح بخاری کتاب الحدود۔

۲۔ ابوداؤد باب فی اقامۃ الحد علی المریض۔

۳۔ ایضاً باب صیب الرجل و دن الجماع صحیح بخاری حدود۔

۴۔ ابوداؤد کتاب الدیات۔

جرائم درگزر کر سکتی ہے رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملطفیت کا برتاؤ کر سکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کئے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطبؓ ابن ابی بلتعہ ایک صحابی تھے انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھ جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے اللہ اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا اللہ کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہ تھا اس لئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے اللہ اور رسول کے اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ نے فرمایا، کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر اللہ نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

﴿اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَّهْتُ لَكُمْ الْحَنَّةَ﴾

جو چاہو ہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور کہا کہ اللہ کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔ ۱

آنحضرت ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکت بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے، سیاست کا ایک لازمی جز بدگمانی ہے اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دوراندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دار و مدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص اعتماد کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت ﷺ نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

﴿حَسَنَ الظَّنِّ مِنْ حَسَنِ الْعِبَادَةِ﴾ (ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸)

حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

﴿إِنْ بَعْضَ الظَّنِّ إِنَّكُمْ﴾

بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے۔

﴿إِنَّ الْأَمِيرَ إِذَا ابْتَغَى الرِّيْبَةَ فِي النَّاسِ أَفْسَدَ هُمْ﴾

جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔

اور عمال سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

﴿عَسَٰى مَعَاوِيَةُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّهُ انْتَهَتْ عَوْرَاتُ النَّاسِ

أَفْسَدَتْهُمْ وَكَدَّتْ أَنْ تَفْسِدَ هُمْ﴾

حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو

برباد کر دیا ہے یا عنقریب برباد کر دو گے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہؓ کا دور قائم رہا تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لئے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

دُخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے اب ان کے لئے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ ”درگزر کرو“ دُخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگزر کرو کیونکہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ

﴿مَنْ رَأَى عَوْرَةً فَسْتَرْهَا كَانَ كَمَنْ أَحْبَبَ مَوْدَةَ﴾

جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپایا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچالیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لئے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے اس لئے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

”جاننا چاہئے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ذلیل، ذول، وسعت، علم، حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے اس لئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے اور اس نسبت سے جو صفت مستبط ہوتی ہے اسی کا نام بادشاہی ہے پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لئے مضر ہے اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دار و مدار نرمی پر ہے کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو سخت گیر ہو لوگوں کے معائب کی کرید کرے ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے اور لوگ ان سے بچنے کے لئے جھوٹ اور مکرو فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبہ محبت بالکل مٹ جاتا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے جاننا چاہئے کہ یہ لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتداء ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں اس لئے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو اور حاکم کے لئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب زیاد بن ابوسفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔“

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئین جہاں بانی پیش کیا ہے اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری جرائم سے بے پرواہی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں مگر اسلام نے جس تنخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے وہ سراسر مذہبی ہے اس میں میرے احکام کی اطاعت اللہ کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے اس لئے جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو۔ عدل میں صداقت کی

خلاف درزی نہ ہوا میر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے اثبات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قصاصات اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے چنانچہ فرمایا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْذِبُ الَّذِيْنَ يَعْذِبُوْنَ فِي الدُّنْيَا﴾

بے شبہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت ﷺ کا فیض صحبت اٹھایا تھا انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست دراز یوں کو روکنا چاہا ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند غلطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے تھے انہوں نے اس کی وجہ پوچھی لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے انہوں نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔ ۱۔

دنوی حکمران لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا اور اس لئے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ آفگن تھا معاملات حکومت میں خود آپ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گئے مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت ﷺ کے اس فیاضانہ طرز عمل کا اعتراف تھا چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و دو عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہئے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں مجھ پر حد جاری فرمائیے آپ نے پوچھا کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اس نے کہا ہاں آپ نے دریافت فرمایا کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا: جاؤ اللہ نے معاف کر دیا۔ ۲۔

۱۔ مسلم ج ۲ ص ۳۹۷ کتاب الادب۔

۲۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۹ کتاب الحدود۔

۳۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۲ کتاب الحدود۔ جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لئے بحکم ان الحسنات پلھیں اللہ ان سے قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لئے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی ایک منجوطہ الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے آپ نے فرمایا تم اپنے کام کے لئے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چھنے کو تیار ہوں چنانچہ آپ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا۔ عدی بن حاتم جو مذہب انصافی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضور ﷺ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضور بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اور ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمت اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے اور حضور ﷺ ان کے ساتھ رفیق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا۔ بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لئے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے تو آنحضرت ﷺ بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا۔ لیکن آخر ایک رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا آپ نے دوبار فرمایا کیا تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی ہاں ہاں! یا رسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب اللہ کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں فرمایا ایک غلام آزاد کر دو انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں آپ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو عرض کی یا رسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے آپ نے فرمایا تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو عرض کی یا رسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے آپ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقہ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ وہ تم کو اس قدر کھجوریں دے دے گا اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بچوں کو کھلاؤ وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بد تدبیری اور رسول اللہ ﷺ کے یہاں

۱۔ مسلم ج ۲ ص ۲۹۴

۲۔ بخاری ج ۲ ص ۹۰۰

۳۔ اظہار کے معنی ہیں کہ بیوی کو محرکات شرعی سے تشبیہ دیدی جائے جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں برابر ہے اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔

۴۔ اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی جازت کا حکم نامہ نازل نہیں ہوا تھا۔

وسعت اور مشورہ نیک پایا۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دو گونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قدر شیفگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین و نبوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آ سکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خود سری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کئے گئے تو ان ہی خود سر سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو پھر زکوٰۃ کا ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ اللہ کی قسم میں ان میں کی بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: یہ شخص کامیاب ہو گیا کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا۔ (بخاری، کتاب ایماں)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آ کر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کو اللہ نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا، اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے، اس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، اس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عز و جل نے، اس نے کہا: اس اللہ کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں، اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا، کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بیشک! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! سچ کہا، اس نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں، فرمایا: ہاں! سچ کہا، عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ہاں، اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا، ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہؓ حاضر خدمت تھے اور حضور ﷺ ایک لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اتر اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آ کر پوچھنے لگا، تم میں محمد کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو فیک لگائے بیٹھے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے!

حضور ﷺ نے فرمایا ہاں کہو! اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا فرمایا جو چاہو پوچھو اس نے کہا میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا اللہ ہاں! پھر فرمایا اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدا یا ہاں! پھر کہا اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کاروزہ رکھیں؟ فرمایا اللہ ہاں! پھر کہا اللہ ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دو ہمتیوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو ہانت دیں؟ فرمایا اللہ ہاں! اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ ﷺ آئے ہیں اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں میں منام بن ثعلبہ ہوں (بخاری کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفگی و جان نثاری کا ایک اور واقعہ سنئے۔

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور ﷺ کے ساتھ پیش آئے صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت کے جانثار تھے وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے (ابو داؤد کتاب حدیث ۱۳۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہؓ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے لیکن جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تہہ کا اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے تھے۔ جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے سبقت کرتا ہے جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تہہ کا لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے لوگ ادب اور تعظیم سے آپ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے وہ اس منظر جہاد و جلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں جس قدر محمد کے اصحاب محمد کی تعظیم کرتے ہیں جب وہ تمہو کہتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں جب آپ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے پیش دستی کرتا ہے۔ جب آپ

وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لئے لڑتا ہے۔ جب آپ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے لوگ تعظیماً آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔ ۱۔

غزوہ بدر کے متعلق جب آپ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے انہوں نے کہا:

﴿ایسا بربد بارسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرت ان یحیصھا البحر لا حضناھا ولو
مرتنا ان نصرب اکبادھا الی برک العماد لفعلا﴾ (مسلم کتاب بیہاب باب غزوہ بدر)

یا رسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک العماد پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔

غزوہ احد میں جب آپ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپ کو روکا اس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے انہوں نے کہا:

﴿بابی انت وامی لا تشرف یصیبک سهم من سهام القوم بحری دون نحرك﴾ (بخاری کتاب المغازی غزوہ احد)

میرے باپ ماں آپ پر قربان! آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھئے کہیں آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور ﷺ کے درمیان کے واقعات تھے آنحضرت ﷺ کے محبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمل نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لئے آپ نے حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کو مقرر فرمایا وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی اس پر یہودیوں نے کہا ”یہ تو بہت ہے“۔ انہوں نے کہا اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں تم لوگ اس کا نصف لے لینا اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکاراٹھے:

﴿ھذا الحق بہ تقوم السماء والارض قدر ضیما ان تاحده بالذی قنت﴾ ۳

انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی لیکن انہوں نے کہا: اے دشمنان خدا تم

۱۔ بخاری ج ۱ ص ۳۷ کتاب الشروط۔

۲۔ یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

۳۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۵۷ کتاب البیوع۔

مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو اللہ کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو محبوب ترین خلایق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔



سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دو^۱ اس تعلیم میں قیصر اور اللہ دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی دین داری صداقت اور اخلاص نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دین الہی ایک ہی ہے ایک ہی رہا ہے اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ (اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمد تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے مگر سلطنت الہی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطنت الہی میں قیصر کا وجود نہیں اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے جل شانہ و تعالیٰ اسمہ بادشاہی اسی کی ہے حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الہی ہو یا اس کا منی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر حاکم اور فرمانروا تھے آپ کے احکام کی بجا آوری عین احکام الہی کی بجا آوری ہے۔

﴿وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَّاعَ اللَّهَ﴾ (نہ ۱۱)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جوجانشین اور خلفاء ہوئے ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے اسی طرح وہ دین کے پیشوا امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں آنحضرت ﷺ کا ارشاد فرماتے ہیں

﴿مَنْ اطَّاعَ أَمِيرِي فَقَدْ اطَّاعَنِي وَ مَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي﴾ ۲

۱۔ نہیں۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۲ ص ۵۷۷ صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲ ص ۲۲۳ مصر۔

جس نے میرے امیر کا کہا، نا اس نے میرا کہا، نا جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے احکام الہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعت الہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانا ہو غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے اللہ کے لئے اور اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسب حکم الہی کیا جائے وہ دین ہے امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسب احکام الہی اللہ کے لئے کیا جائے وہ سب دین اور اطاعت اور موجب قربت ہے۔ سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یاد الہی میں مصروف رہیں جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و واجبات و موکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں، حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورہ ص میں ہے جس میں چند داد خواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤدؑ کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤدؑ کو متنبہ کیا گیا۔

﴿وَلَمَّا دَاوُدُ انْصَافْتُهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۖ وَفَعَلْنَا لَهُ ذَلِكَ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ ۖ يٰدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (ص: ۲)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی اللہ نے) ان کو آزمایا ہے تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے اللہ کی عبادت میں مصروف رہنے لگے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسب احکام الہی فرائض خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔ جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿مَنْ مِّنْ أَمَامٍ يَعْنُقُ سَابِقَهُ دَوَى الْحَاجَةِ وَالْحَمَةِ وَالْمُسْكِنَةِ إِلَّا أَعْلَقَ اللَّهُ أَسْمَاءَهُ دُونَ خَلْتِهِ وَحَاجَتِهِ وَمُسْكِنَتِهِ﴾ (ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۷)
جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔

﴿مَنْ مِّنْ وَلِيٍّ مِّنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ شَيْئًا فَاحْتَجَبَ دُونَ خَلْتِهِمْ وَحَاجَتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ وَفَاقَتِهِمْ احْتَجَبَ اللَّهُ عَرْوَهُ جَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ دُونَ حَمَتِهِ وَفَقْتِهِ وَفَقْرِهِ﴾ (ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۸ ص ۹۳ حیدر آباد)

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چوٹے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لئے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو کوفہ کے والی تھے اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگوایا جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہؓ کو اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینہ واپس چلے آئے۔ (ابن ضبر ج ۱ ص ۵۴ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حمد آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہل حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے۔ (ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۸)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔
﴿إِنْ تَوَدُّوا الْأَمَانَ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ بِعَمَلِكُمْ لَبَظٌ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۚ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَارَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (نساء: ۵۸)

۱۔ چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لئے ذن کا حکم ہے اس لئے خود آنحضرت ﷺ نے اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ سخت (اور) دیکھتا ہے مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مال بھی اچھا ہے۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہہ کر ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

﴿وَأَقِمْوِا الزُّنْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْبَيْزَانَ﴾ (زمن: ۱)

اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لئے تولتے ہو اسی پیمانہ سے اپنے لئے بھی تولو۔

﴿وَبَلِّغْ لِلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۖ وَإِذَا كَالُوا لَهُمْ أَوْ وَزَنُوا لَهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ (مطففين: ۱)

پہنکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کرویں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (مائتہ حجرات: ۶)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (آل عمران: ۶-۱۳)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (شوری: ۴)

بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو یا عام بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا ہو ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الہی کے تحت ادا ہوں۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يُحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (مائدہ: ۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں ارشاد ہے

﴿إِلَّا أَيُّهَا النَّاسُ لَا يَقْبَلُ إِلَهُ صَلَوةَ إِمَامٍ حَكَمَ بِغَيْرِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ﴾ (مسند ابن ماجہ ص ۸۹ کتاب ۱۰۰)

ہاں اے لوگو! جو امام اللہ نے جو قانون اتارا ہے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے اب جو شخص ایک طرف

اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے وہ منافق ہے اور اس

سے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت بارگاہ الہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرمانروائی بھی ایک

مذہبی فریضہ ہے جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الہی بخوبی عہدہ برآ ہوں ان کے لئے آخرت میں رحمت الہی کا سایہ

ہے اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مقرر کی گئی ہیں

فرمایا۔

﴿الامام اندی عسی الناس راع هو مسئول عن رعیتہ﴾ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۷ کتاب احکام)

وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کار ہے اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں اسلامی امارت و خلافت

تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں ذمہ داریوں کا خارزار ہے جو اس سے سلامت گذر گیا اس کے لئے دنیا کی

سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آرائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا

اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

﴿مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَةً فَلَمْ يَحْطَ بِهَا بِنَسِجَتِهِ إِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْحَنَةِ﴾ (بخاری و مسلم)

نوالہ: (بق)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقل بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی

عیادت کو آیا۔ انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا

ہوں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے۔

﴿مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ عَاشٍ لِرَعِيَّتِهِ إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ

عَلَيْهِ الْحَنَةَ﴾ (مسلم کتاب الامارہ)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو

اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے ایک اور صحابی جن کا نام عائد بن عمروؓ ہے وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے۔

﴿ اِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحَطَمَةُ ﴾ (مسلم کتاب الامارہ)

سب سے برارائی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن اس نے کہا: آپ محمد ﷺ کے اصحاب میں بھوسی ہیں فوراً بولے کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا بھوسی تو اوروں میں تھے اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا نبوت مجھ پر ختم ہوگئی البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! تو ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا پہلے کی بیعت کرو پھر اس کے بعد والے کی پھر عہد بہ عہد اوروں کی ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پریشانی پر چھوڑ دو)

﴿ فَإِنَّ اللَّهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا امْتَرَعَاهُمْ ﴾ (صحیح بخاری)

کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔

حضور ﷺ نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے

﴿ الْمُهْمُ مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرَتِي شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْفِقْ عَلَيْهِ وَ مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرَتِي شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِمْ فَارْفُقْ بِهِ ﴾ (مسلم)

اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرماتا۔

حضور ﷺ کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرہ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

﴿ اَلَا كَلَّكُمْ رَاعٍ وَ كَلَّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَ الرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَ هُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ وَ الْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ نَعْلَهَا وَ وَلَدَهُ وَ هِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ وَ الْعَبْدُ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ وَ هُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ اَلَا فَكَلَّكُمْ رَاعٍ وَ كَلَّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ﴾ (مسلم صحیح بخاری)

ہاں! تم سب نگران کار ہو اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگران کار سے اس کے زیر نگران کے متعلق بعض پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائیگی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا تو ہاں ہشیار رہو تم سب نگران کار ہو اور

تم سے اس کے زیر نگران کے بابت باز پرس کی جائے گی۔

لفظ رعیت:

اس موقع پر مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہو گئی ہے حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں یہ الفاظ لفظ ”رعی“ سے نکلے ہیں جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں راعی چرواہا اور رعیہ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے جو اپنے گلے کو سرسبز چراگا ہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور ﷺ کی زبان مبارک پر لفظ ”رعیت“ کس قدر شفقت آمیز اور پر محبت معنوں میں آیا ہے اور ظلم و سفاک امراء اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے رسول اللہ ﷺ نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے۔

﴿ان المقسطین عند اللہ علیٰ مسار من نور عن یمین الرحمن و کنتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمہم و اہلیہم و ما ولوا﴾ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)

بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امراء) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے جامع ترمذی میں ہے

﴿ان احب الناس الی اللہ یوم القیامہ و اذناہم مجلسا امام عادل و ابغض الناس الی اللہ و ابعدہم منہ مجلسا امام جائر﴾ (ترمذی ابواب الاحکام)

بے شبہ سب لوگوں سے اللہ کو محبوب اور اللہ سے قریب امام عادل ہوگا اور اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض اور اللہ سے دور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے فرمایا

﴿ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجہد لہم الا لہم یدخل معہم الجحیم﴾ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)

جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو پھر وہ ان کے لئے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔

﴿مَا مِنْ وَالٍ يَبِى رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَيَمُوتُ وَهُوَ غَاشٍ لَهُمُ الْإِحْرَامُ عَلَيْهِ الْجَنَّةُ﴾
(کنج بخاری کتاب الاحکام)

کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا والی ہو وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو اس پر جنت حرام ہے۔

﴿إِنَّمَا الْإِمَامُ حَنَّةٌ يُقَاتِلُ مِنْ وَرَائِهِ وَيَتَّقِي بِهِ فَإِنْ أَمَرَ بِتَقْوَى اللَّهِ وَعَدَلَ فَإِنْ لَهُ بِذَلِكَ أَجْرًا وَإِنْ أَمَرَ بِغَيْرِهِ فَإِنْ عَلَيْهِ وَزَرًا﴾ (نسائی کتاب الامیر)

امام ذوالحال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزاء و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الہی ہیں یا قوانین الہی ہیں۔ یہ احکام الہی اور قوانین الہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جز ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلادیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے جس سے اہل علم اور اہل اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہئے حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے۔

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں تم کو ان سے کیا سروکار؟)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الہی کی تبلیغ اور اجراء کے لئے ہے اور یہ عین دین ہے اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت بر ملا دی گئی ہے اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضرات خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کی زندگیوں سر تا پا معمور ہیں اس سے مقصود اصلی احکام الہی کی تبلیغ و تنفیذ اور اجراء ہی تھا جہاد سے فرار پر غضب الہی اور جہنم کی وعید ہے اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے قرآن میں ہے۔

۱۔ حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے سر اور مصراع کے تلاش نہیں کرنی چاہیے جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصراع سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کو جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُولُوهُمْ الْأَدْبَارَ ۚ وَمَنْ يُولُوهُمْ يَوْمَئِذٍ
دُورُهُ إِلَّا مَتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِتْنَةٍ فَقَدْ نَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ
الْمَصِيرُ﴾ (انفال: ۲)

اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس
صورت کے سوا لڑائی کے لئے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جاملنا چاہے
ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری
جگہ ہے۔

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَجَيْنَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُونَ﴾ (بقرہ: ۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کا رزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی
ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ جہاد و قتال فی سبیل اللہ انصاف، اقامت دین، سمفیذ حکم، امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صنفوں سے متعلق ہے عام
عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامت دین کی راہ میں خون شہادت کا
ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے
مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَا يَكْفُرُ عَنْهُمْ
سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخِلَتْهُمْ حَتَّىٰ تُخْرِجَ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ
الثَّوَابِ﴾ (آل عمران: ۲۰)

تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے میں
ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بے شمار ثوابوں میں داخل کروں گا اور جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) اللہ کے ہاں
سے بدلہ ہے اور اللہ کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے ان میں سے ایک معنی احکام الہی کی اطاعت، سمفیذ اور
اقامت کے بھی ہیں سورہ نور میں ہے۔

﴿وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ﴾ (نور: ۱)

اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آوے۔

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکام الہی کی سمفیذ و اجراء سے ہے اسی طرح سورہ بقرہ کی اس

آیت میں

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ﴾ (بقرہ: ۲۳)

اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد ٹاپود ہو جائے۔

صرف حکم الہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے سورہ انفال کی اس آیت میں

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُنْهَ لِلَّهِ﴾ (انفال: ۳۹)

اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم و قانون الہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق

ہے اور نہ عبادت کے اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (انعام: ۱۰۲)

﴿إِلَّا اللَّهُ الْحَكِيمُ﴾ (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصْطٰبًا﴾ (نحل: ۱۰۷)

اور اسی اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی ماضی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکام الہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور لطم قرآنی کے مطابق ہیں۔

سلطنت و ملکیت کی حقیقت:

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے عام لوگ حکومت و

سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوان زر نگار تاج اور زمرہ دین تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش

کرتے ہیں یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواریں کے سائے میں لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد

رسول اللہ ﷺ نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام منظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے:

سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے بلکہ اسلام

نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے قطعاً چھوڑ دیا سب سے عام لفظ ملک

کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے مگر تعلیم محمدی نے ان سب

لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے مظہر تھے پرہیز کیا 'الملک' کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ

کے سراسر منافی ہے اس لئے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے اس لئے

الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ الْمَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلٰهِ النَّاسِ﴾ (۱۰۰: ۱)

کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی لوگوں کے معبود برحق کی۔

﴿الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ السَّلَامِ﴾ (۱۰۷: ۳)

بادشاہ حقیقی پاک ذات (ہر عیب سے) امن و امان والا تو اللہ جو سچا بادشاہ ہے۔

﴿فَتَعٰلٰی اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ﴾ (مومنون: ۶)

تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔

﴿الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (بعد ۱)

بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا ہے۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ دفعہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو ”الملک الحق“ یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس ”لوگوں کا بادشاہ“ کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس ”لوگوں کا پالن ہار“ بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و صفا کی قہر و جبر اور بے رحمی و سخت ولی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضروری لگا دی ہے۔

لفظ ملک المملوک کی ممانعت:

عربی میں ملک الاملاک یا ملک المملوک اور فارسی میں شاہنشہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اسلام میں شاہ شاہاں، شہنشاہ، ملک المملوک صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے آنحضرت ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا:

﴿اَلِاحْصِ الْاَسْمَاءَ عِدَانَهُ رَحَلَ تَسْمٰی مِنْتِ الْاَمْلَاکِ﴾ (صحیح بخاری، کتاب الایمان، ۱۰۰)

سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے اسلام کی زبان میں اپنی طرز حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں توراۃ میں یہ بیان صرف آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات و سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا اس کا اصلی مقام بہشت ہونا جزاء و سزا کا راز رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین دنیا میں اس کے فرائض احکام الہی کی بجا آوری کی صورت اور اللہ کی دوسری مخلوقات کے

ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (بقہ: ۳۰)

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے جو بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے اس لئے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۷۱)

ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ کے قائم مقام تھے ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

﴿اٰھْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاَمَّا یٰۤاٰدَمُ فَهٰذَا فَتَبِعْ هٰذَا فَلَاحُوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (بقہ: ۳۱)

تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورہ اعراف میں ارشاد الہی ہے:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَٰیْشَ قَبِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّا اِبْلِیْسَ لَمْ یَكُنْ مِنَ السَّٰجِدِیْنَ﴾ (اعراف: ۲)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی اس لئے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی سورہ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

۱۔ خلافت کی تحریک کی زمانہ میں ناسارہ کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے، اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت اختلاف سے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں سکی تصحیح کی گئی ہے یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (انعام: ۲۰)

اور وہی (اللہ) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔
یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے جیسے عادی قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین بنایا:

﴿وَإِذْ كُنَّا إِذْ جَعَلْنَاكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾ (اعراف: ۹)

اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کے بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر شمود کو عاد کا جانشین بنایا:

﴿وَإِذْ كُنَّا إِذْ جَعَلْنَاكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ﴾ (اعراف: ۱۰)

اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

﴿وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (ہود: ۵)

تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور ﷺ کی زبان مبارک سے ارشاد ہے۔

﴿إِنْ يَشَاءُ يُخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَةِ قَوْمٍ

الْآخِرِينَ﴾ (انعام: ۱۶)

اور اللہ چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے

لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (نور: ۷)

اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح تم

سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ﴾ (انعام: ۱۹)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا۔

سورہ یونس میں تصریح ہے۔

﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْلَمُونَ﴾ (یونس: ۲)

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو جب انہوں نے ظلم اختیار کیا ہلاک کر چکے ہیں اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

﴿فَكَذَّبُوهُ فَسُجِّنَا وَ مِنْ مَعَهُ فِي الْفُلِّ وَ جَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ﴾ (یونس: ۱)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچالیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورہ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِ كَفَرٍ عَلَيْهِ كُفْرُهُ﴾ (فاطر: ۳)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا تو جس نے کفر کیا اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے

حضرت داؤد کو خلافت بخشی گئی:

﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (ص: ۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف سے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں اس لئے ایک کی غیر موجودگی میں خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیوبت کے سبب سے ہو یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَجَعَلَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفَ﴾ (مریم: ۱۰)

تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

﴿وَاخْلُفْنِي فِي قَوْمِي﴾ (اعراف: ۱۶)

میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ﴾ (زخرف: ۶)

اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے پہلی آیت میں ایک کے

مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں۔

﴿ الْحَلَاةُ السَّيَابَةُ عَنِ الْغَيْرِ اِمَالِغِيَّةُ الْمُنُوبِ عَنْهُ وَ اِمَالَمُوتُهُ وَ اِمَالْعَجْرُهُ وَ اِمَالنَّشْرِيفِ الْمُسْتَخْلَفِ ﴾ (ص ۱۰۰ مصر)

خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں۔ اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو یا نائب کو نیابت کی عزت بخشے کے لئے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں مفتی آلوسی صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے تینوں معنی کے لئے مختلف قول نقل کئے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے اس کی جانشینی مراد ہوگی اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے۔

﴿ وَ اَنْفَعُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيْهِ ﴾ (حدید: ۱)

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے اس لئے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرنے میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں۔ کشف بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشف میں ہے

﴿ اِنَّ اِلَاصْوَالَ التِّى فِى اَيْدِيْكُمْ اِمَا هِىْ اَمْوَالُ اللّٰهِ مُحَقَّقَةٌ وَ اَشْءَاءُ لَهَا وَ اِمَا مَوْلَكُمْ اِيَاها

وَ حَوْلَكُمْ لِلاِسْتِمَاعِ بِهَا وَ جَعَلَكُمْ حُلَمَاءَ فِى انْتِصَافِ فِيْهَا ﴾

وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے اسی نے تمہارے تمتع کے لئے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔ بیضاوی میں ہے۔

﴿مِنَ الْأَمْوَالِ الَّتِي جَعَلَكَ اللَّهُ خَلْفَاءَ فِي التَّصَرُّفِ فِيهَا﴾
وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔
روح المعانی میں ہے۔

﴿جَعَلَكَ مَسْجِدًا خَلْفَاءَ عَمَّ عَزَّ وَ جَلَّ فِي التَّصَرُّفِ فِيهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ تَمْلِكُوهُ حَقِيقَةً﴾
اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔
اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب کا سرعنوان ہے یعنی
﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (بقرہ۔ ۳۰)
اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے طبری میں یہ دونوں قول ہیں ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے۔

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً مِّنِّي يَحْلُصُ فِي الْحُكْمِ بَيْنَ حَقِيْقِي﴾
میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ تَعَالٰی اٰخَبَرَ الْمَلٰٓئِكَةَ اَنَّهُ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيفَةً لِّهٖ يَحْكُمُ فِيْهَا بَيْنَ خَلْقِهِ بِحُكْمِهِ﴾ (مر ۱۰۴)

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے۔

﴿وَالْمُرَادُ بِهِ اَدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَآنَ كَانَ خَلِيفَةَ اللَّهِ تَعَالٰی فِي اَرْضِهِ وَكَذٰلِكَ كُلُّ نَبِيٍّ اسْتَخْلَفَهُمْ فِي عِمَارَةِ الْاَرْضِ وَ سِيَاسَةِ النَّاسِ وَ تَكْمِيلِ نَفْسِهِمْ وَ تَنْفِيْذِ اَمْرِهِ فِيْهِمْ لَاحَاجَةٌ بِهٖ تَعَالٰی اِلٰی مَنْ يَنْوِيْهِ بَلْ لَقَصُوْهُ قَبْضَهُ وَ تَنْفِيْ اَمْرِهِ بِغَيْرِ وَسْطٍ﴾

اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلیفہ فرمایا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافت الہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی لیکن جس اہتمام سے جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش اللہ کی نیابت فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ پھر ان کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کئے گئے ہیں ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول مہمہ کیا گیا ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی اور اگر اس توضیح سے کلام کلیتہً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے جس کا آدمؑ کو نائب بنانا سمجھا جائے ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جس سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے

فرمایا۔

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَخَمَسْنَاهُمْ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ

كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۷۱)

ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (تین: ۱)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لئے بنا ہے اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

﴿وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (جاثیہ: ۲)

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا ہے شک اس میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابت الہی کی حقیقت ہے قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الہی کو انسان کا تابع اور مسخر اور اسی کے لئے ان کا پیدا کیا جانا یہ تفصیل مذکور ہے مزید تشریح کے لئے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں۔

﴿وَخَلَقَ لَكُم مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (بقرہ: ۳)

اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ﴾ (نمل: ۲)

اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ﴾ (جاثیہ: ۱)

اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ (ابراہیم: ۵)

اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کر دیا۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهَارَ﴾ (ابراہیم: ۵)

اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافت الہی کا منشاء ہے ایک اور آیت میں ارشاد ہے۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاٰمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبٰیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (احزاب: ۹)

ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابت الہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے یہ امانت الہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و

اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لئے عاریت ملے ہیں یہ حدیث کہ ﴿وَمَا لَئِيَّا خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ﴾ (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول ﴿تَخْلُقُوا مَا خَلَقَ اللَّهُ﴾ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جو انسانیت کو بند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے اور جس کے اندر مادی و روحانی سیاسی اور اخلاقی دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْحَرِّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (میں نے انسان اور جن کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تعمید ہے اس کے ہاتھ میں شریعت الہی کا فرمان ہے اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔



امت مسلمہ کی بعثت

عقیدہ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الہی کے شرف کے مستحق ہیں مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے لئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے تو امت محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابت الہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گی اسی لئے قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی پچھلوں کے ہیں۔ ۱۔

﴿ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ۖ وَقَلِيلٌ مِنَ الْآخِرِينَ﴾ (واقعة ۱)

ایک چھوٹا گروہ انگوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں ہے۔

﴿وَالْآخِرِينَ مِنْهُمْ لَعَنَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ﴾ (جمعا)

اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا پھر چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے مگر وہ نہ مانے پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی (مخلص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے (کنز ۶-۲۳)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے اس سے واضح ہے کہ امت مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے صحیح بخاری و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے۔

﴿نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ﴾

ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم بیہقی اور نسائی میں بھی ہے (کنز ۶-۲۳۰)

۱۔ صحیح بخاری کتاب التعمیر۔

ابن ماجہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا

﴿ نَحْنُ اخِرُ الْأَمَمِ ﴾ (کنز ۶-۲۳)

ہم سب سے آخری امت ہیں۔

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امت محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لئے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگا رہے گا اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وساطت اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کر دے گا گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا اس کے بعد پورا فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے تو وہ بھی اسباب و تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا اسی لئے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لئے حاملین قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غالب اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے ارشاد الہی ہے۔

﴿ وَ مِنْ خَلْقًا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَ بِهِ يَعْدِلُونَ ﴾ (انعام)

ہماری مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)

اہل تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال مستقبل دونوں کے لئے ہے یعنی

قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰؑ کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَ جَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ (آل عمران)

اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

حضرت عیسیٰؑ کے اصلی منکر تو یہود ہیں گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو

مسلمان ہیں۔ ۱۔ مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جاسکتے ہیں گو گمراہ ہوں۔ ۲۔ بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے مسلمانوں کو غلبہ عام حاصل ہو جائے جیسا کہ نزول مسیحؑ کی حدیثوں کا خشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان ارشادات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفادہ کے درجہ تک ہے:

﴿لَا تَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بَأَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ مِنْ خَذَلْتَهُمْ وَلَا مِنْ خَالَفْتَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَهُمُ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ عَلَى ذَلِكَ﴾ (بخاری، علامات النبوة)

میری امت کا ایک گروہ اللہ کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔

﴿لَا يَزَالُ نَاسٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ حَتَّى يَأْتِيَهُمُ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ ظَاهِرُونَ﴾ (بخاری، علامات النبوة)

میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے یہاں تک کہ اللہ کی بات جنی قیامت آجائے گی۔

﴿لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي قَوْمٌ ظَاهِرِينَ عَلَى النَّاسِ حَتَّى يَأْتِيَهُمُ أَمْرُ اللَّهِ﴾ (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

﴿لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بَأَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ مِنْ خَذَلْتَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَهُمْ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ عَلَى ذَلِكَ﴾ (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الہی کو لے کر قائم رہے گا اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

﴿لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مِنْ خَذَلْتَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَهُمْ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَذَلِكَ﴾ (مسلم، کتاب الامارۃ)

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

﴿لَنْ يَرِيحَ هَذَا الدِّينَ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عَصَاةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ﴾ (مسلم، کتاب الامارۃ)

یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

﴿لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ (مسلم، کتاب الامارۃ)

۱۔ تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ۔

۲۔ تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ۔

میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔

﴿لَا تَرَالِ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَن حَادِلَهُمْ أَوْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ ظَاهِرُونَ عَلَى النَّاسِ﴾ (مسلم کتاب الامارۃ)

میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکام الہی کو لے کر قائم رہیں گے ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

﴿وَلَا تَرَالِ عَصَابَةٌ مِّنْ أَعْمَامٍ يَفَتَنُونَ عَنِّي أَحَقُّ ظَاهِرِينَ عَنِّي مَن مَّاوَاهُمُ الْيَوْمَ الْقِيَامَةَ﴾ (مسلم کتاب الامارۃ)

مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

﴿لَا تَرَالِ عَصَابَةٌ مِّنْ أُمَّتِي يَقَاتِلُونَ عَلَى أَمْرِ اللَّهِ قَاهِرِينَ لِعَدُوِّهِمْ لَا يَضُرُّهُمْ مَن خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ وَهُمْ عَلَى ذَلِكَ﴾ (مسلم کتاب الامارۃ)

میری امت کی ایک جماعت اللہ کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباؤں میں رکھے گی اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچائیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم جامع ترمذی سنن نسائی ابو داؤد ابن ماجہ ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے ہماری تسکین کی خاطر کے لئے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی عباد و رقوق کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گی تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عطا ہوتا تھا وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی ایک حدیث ہے العلماء ورثة الانبیاء یعنی امت محمدی کے علماء انبیاء کے وارث ہیں ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں شامل نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات و فرائض سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا اور وہ تبلیغ دین ہدایت خلق دعوت حق اقامت دین امر بالمعروف نہی عن المنکر دفع شبہات ابطال مطلقین اور رو بدعات وغیرہ ہیں اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور ﷺ کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہو گی تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

۱ دیکھئے کنز العمال ج ۶ ص ۲۳۱-۲۳۵۔

۲ یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعدد مروی ہے اور محدثین نے اس لئے اس کو معتبر مانا ہے دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفاء مجلو فی ص ۲۴۔

﴿كَادَتْ هَذِهِ الْأَمَّةُ أَنْ تَكُونَ أَسْيَاءَ كُلِّهَا﴾ (مسند طبری، ص ۳۵۴، ابن عباس، مسند احمد وابو یوسف)
 قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا۔ یہ شاید اس لئے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے حضرت عبادہ بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے۔

”اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿أَدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (مومن: ۶)

مجھے پکارو میں تمہیں جواب دوں گا یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاء کو حاصل تھا اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾

اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تکلیف نہیں کی۔

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾

ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں

امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

”شہید اور شاہد“ کے لغوی معنی ”حاضر“ کے ہیں کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضری ہونا مختلف

اغراض سے ہو سکتا ہے مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لئے اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لئے اس کی دیکھ

بھال اور نگرانی کے لئے اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لئے اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے

بچانے کے لئے اسی لئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہدان ثانوی معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے

جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا۔

۱۔ حمایتی اور مددگار کے معنی میں۔

﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (بقرہ: ۳)

اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کا بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)

۲۔ حافظ ابن کثیر نے قرآن کی دوسرے پارہ میں لکھوا شہداء علی الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے۔

﴿وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰)

ترجمہ: (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (حج: ۲)

اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

﴿وَكَنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ (مائدہ: ۱۲)

(حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا، نگرانی رہا۔

۴۔ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَاكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ (نساء: ۶۰)

تو کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہوں کو بلا لیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے

۵۔ امور خیر کی تعلیم یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں۔

﴿وَكَدَلْتُ جَعَلْتُكُمْ أُمَّةً وَنَسَطًا لَّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ

شَهِيدًا﴾ (بقہ: ۱۷)

اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿كُنْتُمْ حَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِنَاسٍ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱)

تو میں نے تم کو جتنی امتیں ہوئی ان سب میں تم بہتر ہو اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری

شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد حمایتی مددگار اور گواہ ہے وہ دنیا کی

ماری قوموں کی نگرانی کا رہنما کر بھیجی گئی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا

فرض انجام دے اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دین الہی کامل ہو چکا پیغام الہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے

سے لی ہے اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے اب یہ تھا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام

دنیا میں کلمہ الہی کی بندی حق کی اشاعت دین کی تبلیغ نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض

انجام دے۔ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے اور اس کا

فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرنے چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر شہادت کی

صورت میں ظاہر ہوگی جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح بلائے جائیں گے وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی؟ وہ انکار کریں گے کہ ہمیں تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد ﷺ اور ان کی امت تو یہ نوحؑ کی شہادت دیں گے یہ ارشاد فرما کر حضور انور ﷺ نے یہ آیت پڑھی ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ الخ (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔) صحیح بخاری تفسیر سورہ بقرہ

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا نام یہاں مثلاً ہے ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں ہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جز ہے یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورہ حج میں سورہ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے۔

﴿هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لَبِكُوكَ الرَّسُولُ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (حج۔ آخر)

اسی اللہ نے (اے امت محمدیہ ﷺ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تکلیف نہیں رکھی تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین اسی نے تمہارا نام مسلم پہنچا رکھا اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں اُمۃً ووسطاً (عادل و معتدل امت) خیرۃ اُمۃ (سب سے بہتر امت) ﴿هُوَ اجْتَبَاكُمْ﴾ (تم کو اللہ نے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی برتری اور فضیلت پر شاہد ہیں بلکہ وصف اجتہا کم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو قیامت تک کے لئے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں اس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں وہ نبی ﷺ کی امت دعوت ہیں حضور انور ﷺ نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا آپ ﷺ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغام الہی کی دعوت و تبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا جب تک دنیا آباد ہے ہر ملک میں ہر قوم میں دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الہی کی دعوت و تبلیغ تا قیامت امت محمدیہ کا فریضہ ہے یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے

حسب ذیل فرمائی ہے۔

”تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کو لوگوں کی تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے (باب حقیقۃ النبوة)

شاہ صاحب کا منشاء یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثت اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ﴾ (یوسف: ۱۱)

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا:

﴿فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُبَشِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعْصِرِينَ﴾

تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور

ہے وہ اس سے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے اور اپنے نبی کے پیغام

کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلانے حضور انور ﷺ کا حجتہ الوداع میں اخیر حکم۔

﴿فَبَسَّحَ الشَّاهِدَ الْعَائِبَ﴾

(میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں)

صرف حضور انور ﷺ کے عہد مبارک تک کے لئے محدود نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے یہ جاری و ساری ہے

فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچا چلا جائے ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے۔

﴿فَمَنْ مِّنْكُمْ كُلٍّ مَّرِضًا فَهُمْ لَا يَتْمَعُونَ فِي الدِّينِ وَلَئِنْ رَأَوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ

عَلَيْهِمْ يَحْذَرُونَ﴾ (توبہ: ۱۵)

تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ (دین کا علم سیکھتے) اور اس میں سمجھ پیدا

رتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ن کو ذرت سے تاکہ وہ حذر رتے۔

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی۔

اور یہی فشا، اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

﴿كُنْتُمْ حِزْبَ أُمَّةٍ أُحْرِجَتْ مُسَاسُ تُمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ

سَبَّحَهُ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہو میں ان سب میں تم بہتر ہو اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لئے سرفروشی کرے اور اسی لئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

﴿وَنُكِّنْ مِنْكُمْ أُمَّةً يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ

هُمْ الْمُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران: ۱۱۱)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا اپنا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشی رہیں لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داغ خدا اس میں بند ہو گیا مگر اللہ تعالیٰ یہ وعدہ الہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی۔

﴿وَلَا تَتَوَكَّلُوا بِعَدَتِكُمْ عَدَانَا إِيْمًا وَيُسْتَدَلُّ قَوْمًا عِزُّكُمْ وَلَا نَصْرُوهُ شَيْفًا﴾ (توبہ: ۱۶)

اگر تم نہ ٹکلو گے تو اللہ تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو اللہ کے پورے فرمانبردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔

پھر فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَنسِفُ اللَّهُ بُيُوتَهُمْ وَيُحْشِنُ أَدْنَاهُ

عَلَىٰ أَسْفَلِ أَعْرَافٍ عَنِ الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَحْفَظُونَ نُؤْمَهُ لَا تَمِ ذَلِكُ

فَصَلِّ اللَّهُ بُيُوتَهُ مِنْ بَيْتَاءَ﴾ (آل عمران: ۷۷)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے گی اظہار حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورہ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے۔

﴿ نَآئِهَا أَتَدِيسُ أَمْوَارَ كَعُوٍّ وَاسْجُدُوا وَغُدُّوْا رِثَكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ
وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ
أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا يَكُونُ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ
وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ
مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴾ (ن. ٥)

مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تاکہ فلاح پاؤ اور اللہ کی (راہ) میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمھارے لئے) تمھارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی سے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمھارا نام مسلمان رہا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تاکہ چغیر تمھارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو وہی تمھارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔

اس آیتوں سے اس شاہد اہم اور مجتہبہ عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں:

۱۔ اداۓ نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی (۲) اداۓ زکوٰۃ پر عامل (۳) ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط (۴) رکوع و سجود و عبادات الہی کی خوگر (۵) امور خیر پر حریص (۶) راہ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی۔

امت محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا اس کی بقاء اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔



قوت عاملہ یا قوت آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لئے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لئے ایک قوت عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت انسانی کا تقاضا ہے اسی لئے جب سے انسانیت کی تاریخ معصوم ہے کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو انسانی رُوح جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم، آمر بنا پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی تو بادشاہوں اور راجہوں نے جنم لیا ان بادشاہوں اور راجہوں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گزاری کا صلہ سمجھنے کے لئے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھ لیا مافوق بشر قوی سے اپنے کو متصف قرار دیا اس خیال کا ازمنہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی ان میں سے کوئی سورج منی بنا اور کوئی چندر منی یعنی کوئی سورج دیوتا کا نور نظر تھا اور کوئی چاند کا نکڑا اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوت ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے اور مصر کے فرعون اپنے کو رع یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں *اَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى* (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا چین کے بادشاہ اپنے کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اسی لئے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بنپور (اللہ کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو اللہ کا اوتار کہتے تھے ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔^۱ اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا اللہ ہے جس کی دوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رولس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مرغ کی اولاد تھے۔^۲ وادت مسیح کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔^۳ یہودیوں میں حضرت داؤد سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو اللہ کے کاہن اور اللہ سے الہام پا کر اللہ کے نام پر حکومت کرتے تھے اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں ان ہی سب کے پیش نظر ارباب تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں مثلاً اوتاری، شخصی، زمینی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

”اوتاری سے مفہوم تھیا کر یہی ہے یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود اللہ یا اللہ کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

۱۔ ایکلیمینڈیا ہیری کا طبعی و تاریخی مضمون یونان

۲۔ تاریخ روما ص ۳۰۳ و ۳۰۴ و ۳۰۵

۳۔ ایضاً ص ۳۲۹

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے جس میں تہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت و اثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے بادشاہ اور دوست مند افراد مل کر ملک پر حصرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کرے تو یہ حکومت دستوری ہے جس طرح انگلستان میں ہے۔ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵۔ زمینی (آمرانہ) وہ طرز حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور رہنما بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حصران ہوتا ہے مثلاً جرمنی میں ہٹلر اٹلی میں موسینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لئے کسی مدت معینہ کے لئے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے۔ اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح امریکا کا رئیس ہے جس طرح انگلستان کا بادشاہ اختیار رکھتا ہے انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیراعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے خواہ رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکرٹری ہوتے ہیں اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریت اشتراکیہ شورائیکہ بھی ہے جو مزدوروں اور سائنسوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

۷۔ پر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی مراعات کے لئے اب تک طبع کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کئے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے سیاستین یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دینا پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے غور میں اس کو شخصی بتاتے ہیں انہیں لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلانے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی اور اس کے بعد جب موجودہ زمینی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) قوت پزیر رہی ہے اس کو زمینی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) ثابت کرنے کے لئے میان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں ملکہ جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس میں بیک وقت مذہبی شخصی دستوری جمہوری اور زمینی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں اس لئے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس

کو پیش کیا ہے وہ نہ اتاری ہے نہ شخصی ہے نہ دستوری ہے نہ جمہوری ہے اور نہ زعمی ہے بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہے اس لئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائے کبھی شخصی، کبھی زعمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی نظر آتی ہے لیکن اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ اللہ ہے نہ اللہ کا اوتار ہے نہ اللہ کا مظہر ہے نہ اللہ سے ہمکلام ہوتا ہے نہ اللہ سے براہ راست احکام پاتا ہے نہ اس میں کوئی الہی تقدیس ہے نہ وہ اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور اللہ کی شریعت کی تنفیذ کے لئے اس کو منتخب کیا ہے تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں اس کو الہی ہی کہا جاسکتا ہے اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باجمعی مشورہ کی تاکید ہے اس کو سائن، دستوری ہونا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں اس کو شخصی نہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہے اس کو زعمی یعنی ڈکٹیو سمجھا جاسکتا ہے لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعین ان کے فرائض و حقوق ان کے انتخاب اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز، کسی شخص یا خاندانی ملکیت نہیں بلکہ وہ اللہ کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشاء حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور اللہ کے بنائے ہوئے اور تعیم کئے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عہدے کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جبر و جبری ہے کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی اچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں پھر تیسرا اور چوتھا قانون پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس

کو اپنی چاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اُصولِ اسلام کے مطابق ہو تو صرف اللہ کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ذرا ان کے دل کی جی اور عمل کی ہم برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوتؐ زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کے لئے بھی سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔



اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

﴿قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (یوسف: ۸)

حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے اس لئے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن احکام الہی کی دو قسمیں ہیں ایک تشریحی یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے نکوئی یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقات عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنہوں نے نمرود و فرعون بن کر دعویٰ بادشاہی کیا مگر ان کو بھی نکوئی احکام الہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان و دینی پڑی اور یہ شبہ ان سلاطین عالم کو اس لئے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریحی احکام و فرامین کے آگے جب اللہ کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے نکوئی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں اسلام نے شک و شبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریحی اختیار رکھتے ہیں اور نہ نکوئی زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور آمر نکوئی ہو یا تشریحی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں۔

﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (یوسف: ۸)

حکم نہیں، مگر اللہ کا۔

﴿إِلَّا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ﴾ (النوم: ۷)

ہاں! اسی کے لئے حکم کرتا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔

﴿لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (قصص: ۷)

اسی کا حکم کرتا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

امر نکوئی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے وہ زمین آسمان اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کر سکتا نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے نہ ان کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے اور نہ ان کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے خدائی احکام کے آگے سب ہی سرائق بندہ اور ناچار ہیں حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا۔ فرمایا۔

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأَنْتَ مُعْرِضٌ عَنْهَا﴾ (یوسف: ۸۴)

تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو چپھم سے نکالتا تو وہ کافر۔ جواب ہو گیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا

اور بخشش سے ہوتے ہیں۔

﴿لَهُمْ مِمَّا كَسَبُوا ثَوَابٌ كَثِيرٌ ۖ وَمَنْ يَشَأْ﴾ (آمن ۳)

اے اللہ سلطنت کے مالک تو ہے جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس نئے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی کی طرح اس کے احکام تشبیہی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لئے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجراء و قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرمائے ہیں ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکام الہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصدقیتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں ہے ثبوت اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصدہ کر سکتے ہیں لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے یا یوں کہے کہ اس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب ترتیب ہوتا ہے اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسوں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو چھ کہتے ہیں اگر وہ ضمیر الہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں چھٹھا ہی مصدقیتیں ہوں مگر حقیقی مصدقوں کے جاننے کے لئے امر غائب اور مستقبل کا صحیح حکم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر بات ہے اس لئے حقیقی مصدقیتیں اسی حکم میں ہیں جس کو اللہ عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضح صرف اللہ تعالیٰ ہے قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادسیا گیا ہے عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے۔

﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (انعام و یوسف: ۸)

حکم صرف اللہ کے لئے ہے۔

﴿إِلَّا لَهُ الْحَقُّ وَالْأَمْرُ﴾ (آل عمران: ۱۰)

ہاں اسی اللہ کے لئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے پہلی آیت دو جگہ ہے سورہ انعام اور سورہ یوسف میں سورہ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے اس کے جواب میں ہے:

﴿مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ يَقُصُّ الْحَقُّ وَهُوَ خَيْرُ الْمُصِصِينَ﴾ (آل عمران: ۱۰)

جس چیز کا تم قاض کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلاتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ سورہ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے۔

﴿وَمَا أَعْصِي عَنكُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِنْ أُمِرْتُ بِهِ فَعِلْ﴾ (یوسف: ۸)

اور اللہ کے حکم کو میں تم سے نال نہیں سکتا نعم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ أَتَدْرِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُعْشَى اللَّيْلُ النَّهَارُ بِطَنَّةٌ حَنِثًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسْحَرَاتٌ بَأَمْرِهِ إِلَّا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (اعراف: ۷)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم کی غوی وسعت کی بنا پر امور شرعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل اللہ کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔

﴿لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ﴾ (مریم: ۵)

شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشاد الہی ہے:

﴿إِنَّ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ﴾ (یٰٰعٰیص: ۳)

یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاء اور آئمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے لیکن دوسروں کی اطاعت احکام الہی کی تبلیغ اجراء اور تحفیذ کے لئے حکم الہی کے تحت ہے ارشاد الہی ہے:

﴿اطِيعُوا اللَّهَ وَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولو الامر کی اطاعت خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام اللہ کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء

میں ہے۔ رسول کی اطاعت بھی احکام الہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (نساء-۸)

اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (نساء-۶۰)

اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان

کا حکم اللہ سے ماخوذ و مستبد بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا مزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد ہے۔

﴿فَتَسْمُوُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ

وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ﴾ (توبہ: ۳)

اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو

حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم

الہی کے پابند نہیں ہیں بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

﴿لَا تَحِدُوا بِهِمْ وَبَيْنَهُمْ رَبَّنَا مِنْ ذُنُوبِ اللَّهِ وَالْمَسِيحِ ابْنِ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا

بِعَبْدِهِ نَهَاؤُهُ أَحَدٌ (توبہ: ۵)

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا

ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً طور پر اللہ کا حکم تسلیم کرتے تھے کیونکہ

ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو نبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے

اسلام کے اہل کتاب کو یہی سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَٰؤُلَاءِ سِوَايَ نَبِيِّكُمْ إِلَّا يُغْفِرُوا لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ

وَلَا يَتَّخِذْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (آل عمران: ۷۷)

اے کتاب والو! ایک بات کی طرف جو تمہارے درمیان میں مانی ہوئی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی

اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک اللہ کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی تو عدی نے کہا ”وہ ان کو معبود نہیں بناتے“ فرمایا کیوں نہیں انہوں نے ان سے لے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے الفاظ یہ ہیں ﴿وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ سَعَىٰ الْغَافِلِينَ﴾ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے یہی تو شرک ہے۔ ۱

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں بلکہ اللہ کا ہے اور اسی کا نام وضع حکم ہے اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے اسی طرح اللہ کے علاوہ یا اللہ کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکم انہی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الہی کی سختی سے بچنے کے لئے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے یا ان کے فیصلہ کے لئے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زبردستی تو بیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا چنانچہ بعض اصولی احکام عدل و انصاف اور طریق اطاعت احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے۔

﴿لَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلِيْنَ اِنَّهُمْ اَمَوْا سَمًا اَنْزَلَ اٰیٰتِہٖ وَمَا اَنْزَلَ مِنْ قُلُوْبِہٖمْ اَنْ یُّنٰحٰی اِلَی الْطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ﴾ (نہ، ۹)

کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا ایمان رکھ چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم آیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے ”کل معبود من دون اللہ“ اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں، جادو گروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے اس لئے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے وہ طاغوت ہے قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانین الہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق کہلانے کا

﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاولٰئِکَ هُمُ الْمَافِیْقُوْنَ﴾ (نہ، ۱۰)

وہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان

کو اجازت ہے اور جس سے قتل بھرا آگے بڑھنے کی جرات گناہ اور عصیان ہے اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے۔

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ﴾ (طلاق: ۱)

یہ اللہ کی بتائی ہوئی حدیں ہیں۔

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾ (طلاق: ۱)

یہ اللہ کی بتائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورہ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُصِغِرْ سِرَّهُ وَرُسُومَهُ يَدْخُلْهُ حَتَبٌ تَحْرِى مِنْ تَحْتِهَا لَا يَهْرُ حُدُودُ

فِيهَا وَذَلِكَ الْقُورُ الْأَعْظَمُ، وَمَنْ يُغْصِرْ سِرَّهُ وَرُسُومَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يَدْخُلْهُ دَارًا حَالِدًا فِيهَا

وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾ (نساء: ۲)

یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا جن کے

بچے نہریں بہتی ہوں گی اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا

اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے بڑی

ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزاء جنت کی نعمت ہے اور

ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول ﷺ کی اطاعت درحقیقت

اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون و شرع کی حقیقت تعمیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے انسان اگر اپنی طرف

سے کسی قانون کو وضع کر لے اور بلا سند الہی کسی شے کو حلال یا حرام کر لے تو اس کا نام "افتراء علی اللہ" اللہ پر جھوٹا بہت

باندھنا ہے ارشاد ہوا۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا نَصَبُ الْيَسْتَكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لَتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ

كَذِبًا ۚ إِنْ تَدِينُ بَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْخِحُونَ ۚ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

(صل: ۱۵)

اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و حرام) بتاتے ہو ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ تم اللہ پر

جھوٹا بہت لگاؤ (یہ دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لئے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشنگوئی فرما

دی کہ جو لوگ شریعت الہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے گواں کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ ان کے

لئے عذاب ہی ثابت ہوگا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعت الہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکام الہی سے آگاہ فرماتے تھے اور اس حیثیت سے آپ ﷺ کا ہر حکم الہی ہے لیکن حکم الہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک چیز کو اپنے لئے حرام قرار دیا تو عتاب الہی آیا۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ (تحریم: ۱)

اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے مگر جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرمادیا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لئے مخصوص نہ ہو امت کے لئے حکم الہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے اس قاعدہ کی بنا پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لئے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذن الہی کے بھی حق تشریع ہے جو صحیح نہ ہوتا اسی لئے نبی کی تشریحی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الہی کا مبلغ اور قانون ربانی کا شارح اور مظہر ہے قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔

﴿وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (توبہ: ۳)

اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے اصول کا مسئلہ بن گیا ہے چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں۔

﴿اعلم انه لا حاکم سوى الله تعالى ولا حکم الا ما حکم به و يتفرع عليه ان العقل لا

يحسن ولا يقبح ولا يوجب شكر المنعم وانه لا حکم قبل ورد الشرع﴾ (۱۱۳- مصر)

جاننا چاہئے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم دہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون

قانون ہے اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کی رو سے کوئی حکم فرض واجب سنت مستحب یا حرام ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عذاب کا حکم عائد کیا جاسکے نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں۔

﴿الحاکم لا خلاف فی انه رب العلمین﴾ (ص ۸۹-۲)

اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضح پروردگار عالم ہے۔

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسلوی واضح کرتے ہیں۔

”حسن و قبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے جیسے ذہنوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتیب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لئے حکم الہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔“ (ص ۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں ایسی بات کہی ہے یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماترید یہ (حنفی) کا مسلک حق ہے مولانا محبت اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں۔

”حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماترید یہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن ماترید یہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔“ (المقالة الثانیة فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے فرماتے ہیں۔

”اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کہ نزدیک واضح قانون و حاکم عقل ہے یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرات کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکام الہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔“

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے۔

”اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے نہ کفر حرام ہے نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الہی کا تعلق سمجھا جائے گا (ص ۱۶ ارشاد الفحول مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا بخوڑ (خلاصہ) ہے۔

”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں اسی کے لئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے عام اس سے کہ وہ لذائذ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ انصاف امر و نہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورہ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرع الہی پر مبنی ہیں (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ”قانون کا واضح درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے“ یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لئے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پا لیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشاء نہیں کہ عقل اس قانون کی واضح اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شرع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے وہی ایک حاکم آمر اور واضح شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں

۱۔ تہذیب منطق میں ایک مختصر متن کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں و جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں لکھ کر دیا گیا ہے۔

نازل ہوا وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نئے نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لئے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول و کلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، تغیر و تبدل اور تجدید یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں جیسے فن طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے مثال کے لئے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، پیچھے سے، ریوالتور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوتروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے ان سے حادثے پیش آجائیں یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آ سکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں کیا وہ نیا حکم نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا وضع اور مخترع نہیں بلکہ مظہر ہے یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے اہل اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جز یہ فلاں اصولی کلی کے ماتحت ہے انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہائے فتاویٰ کا پورا فتر مرتب کیا ہے جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

مست

الحمد لله سيرة النبي ختم شد